تاریخ عربی ادب

جلد اول۔ زمانہ جاہلیت

جلد دوم۔ رسول پاکؐ سے خلفائے راشدینؓ تک

ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

پرنٹ لائن پبلشرز

[illegible] 723[illegible]89 7234002

حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی حصہ یا پیراگراف ناشر یا مصنف کی پیشگی اجازت کے بغیر نقل فوٹو سٹیٹ، مائیکرو فلم یا ترجمہ کرنے کی اجازت نہیں، ماسوائے تبصرہ یا حوالہ جس کے ساتھ مصنف، پبلشر، کتاب کا نام اور صفحہ نمبر تحریر کرنا ضروری ہے۔

کتاب	تاریخ عربی ادب
مصنف	ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی
سن اشاعت	1999ء
اہتمام	محمد علی۔ آصف خالد
پروڈکشن	ذوالفقار حیدر۔ ارشاد الحق
مطبع	المطبعۃ العربیہ
قیمت	300روپے

فہرست

جلد اول

مقدمہ 13

جلد دوم 19

پہلا باب

جزیرہ نمائے عرب 25

حجاز کے مشہور شہر 26

یمن اور اس کے مشہور شہر 27

جزیرۂ عرب کی آب و ہوا 28

عرب قوم اور اس کے مختلف قبائل 29

عرب اقوام کی تقسیم

عرب بائدہ

عرب عاربہ یا قحطانی عرب 30

عرب مستعربہ یا عدنانی عرب

قبیلہ کا نظام 32

شجرۂ نسب قحطانی یا یمنی عرب اقوام 34

شجرۂ نسب عدنانی یا حجازی عرب 35

شجرۂ نسب قریش 36

دوسرا باب

اسلام سے پہلے عربوں کی سیاسی حالت 37

عربوں کی قدیم تاریخ کا ابہام	
قحطاط عرب	
سلطنت سبا	38
مارب کا بندہ	40
سلطنت حمیر	42
عدنانی عرب	43
جنگ بسوس	44
حرب داحس و غبراء	
عربوں کا غیر قوموں سے تعلق اور اس کے ذرائع	
تجارت	46
سرحدی ریاستیں	47
(الف) حیرہ کی ریاست	48
(ب) غسانی ریاست	49
عربوں کی اجتماعی حالت	
1- بادیہ میں رہنے والے عرب (بدو)	50
عورت اور بدویانہ زندگی	53
2- شہروں میں رہنے والے عرب	54
عربوں کی دینی حالت	55
عربوں کی ذہنی و فکری حالت	56
عربی زبان کی ابتداء اور اس کی نشوونما	58
عربی زبان کا سامی زبانوں سے رشتہ	63
عربی زبان	64
عربی زبان کی تقسیم	65

میلے اور بازار 68
مجالس اور چوپالیں 70
مکہ کی مرکزیت
قریش کی حیثیت اور سرداری کا اثر
عربی زبان کی امتیازی خصوصیات 72
عربی زبان کی گرامر 73
عربی زبان کا اعراب
نزاکت بیان 74
اعجاز و ایجاز 75
مترادفات اور اضداد
ایک لفظ سے کئی معانی 76
حکم و امثال
عرب ادب کی مختلف ادوار میں تقسیم 77
1- زمانہ جاہلیت
2- اسلامی زمانہ
3- عباسی زمانہ 78
4- عثمانی زمانہ
5- عبوری زمانہ
6- موجودہ زمانہ
عربی ادب کی تعریف 79

تیسرا باب

جاہلی زمانہ میں نثر	84
1- محاورہ یا بول چال	86
2- خطابت یا تقریر	87
فن خطابت کی تعریف	87
خطابت کی تقسیم	
1- سیاسی تقریریں	88
2- دینی تقریریں	
3- قانونی تقریریں	
زمانہ جاہلیت میں تقریر کے محرکات	
تقریر کرنے کا انداز	89
زمانہ جاہلیت کے نثری نمونے اور ان کے فنکار	91
1- خطابت یا تقریر	
(1) قس بن ساعدۃ الایادی	
امتیازی خصوصیات	92
(2) اکثم بن صیفی	95
امتیازی خصوصیات	97
(3) عمر بن معدی کرب	98
امتیازی خصوصیات	
2- وصیتیں	100
(1) زہیر بن جناب الکلبی	
(2) ذوالاصبع العدوانی	101
3- کہاوتیں اور ضرب الامثال	102
4- فلسفیانہ اور حکیمانہ مقولے	105

5- نثر مرسل و مسجع	106
کاہنوں کے سجع کی مثال	107
قصے کہانیاں	109
دور جاہلی کی نثر کی امتیازی خصوصیات	114
تحریر یا کتابت دور جاہلی میں	115
رسم الخط کیا ہے؟	115
عربی رسم الخط کا شجرہ	117
بعض عرب قبائل جن میں لکھنے کا رواج تھا	118
عہد جاہلیت کے نثر نگار	119

چوتھا باب

جاہلی زمانہ میں شعر و شاعری	122
شعر کی تعریف	123
شعر فنی کے عناصر ترکیبی	125
عربی زبان میں شعر کی ابتدا کیسے ہوئی	
1- رزمیہ یا الشعر القصصی	128
2- تمثیلیہ یا الشعر التمثیلی	131
3- طربیہ یا الشعر الغنائی	132
جاہلی زمانہ میں شعر اور شعرا کی اہمیت	134
عرب شعر کیسے کہتے تھے	137
جاہلی دور میں شاعری کے اصناف و اغراض	139
غزل	140

فخر و حماسہ	144
مدح	
مرثیہ	145
ہجو	
معذرت	146
سراپا یا وصف	
حکمت و فلسفہ اور ضرب الامثال	148
جاہلی دور میں اشعار کے معانی و موضوع	148
جاہلی شاعری کے الفاظ اور اسالیب بیان	149
جاہلی شاعری میں وزن اور قافیہ	150
دور جاہلی میں مختلف اصناف شعر کے نمونے	152
غزل یا نسیب	
الصمہ بن عبداللہ القشیری	152
الحسین بن مطیر الاسدی	153
فخر و حماسہ	
المرقش الاکبر	154
عمرو بن کلثوم	155
عنترہ بن اشداد العبسی	157
مدح	
زہیر بن ابی سلمٰی	158
الاعشٰی	
ہجو	
قریط بن انیف	159

معذرت خواہی	160
النابغہ الذبیانی	
مرثیہ	161
قس بن ساعدہ الایادی	
وصف	162
سراپا یا منظر کشی	
حکمت و فلسفہ	164
زہیر ابن ابی سلمیٰ	
ضرب الامثال	165
طرفہ بن العبد	166
زمانہ جاہلی کے مشہور شعراء	167
معلقات کی حقیقت	

اصحاب المعلقات

اصحاب المعلقات	171
1- امرؤ القیس	171
کلام کی امتیازی خصوصیات	174
امرؤ القیس کا معلقہ	179
2- النابغتہ الذبیانی	185
امتیازی خصوصیات	193
3- زہیر بن ابی سلمیٰ	204
امتیازی خصوصیات	212

4- عنترہ بن شداد العبسی	217
امتیازی خصوصیات	219
عنترہ کا قصہ	226
5- اعشیٰ قیس	228
امتیازی خصوصیات	230
6- طرفہ بن العبد	242
امتیازی خصوصیات	245
طرفہ کا معلقہ	246
7- عمرو بن کلثوم التغلبی	256
معلقہ عمرو بن کلثوم	260
خصوصیات کلام	263
8- الحارث بن حلزہ الیشکری	267
معلقہ کہنے کا سبب	
کلام کی خصوصیات	269

اصحاب المجمہرات

عبید بن الابرص	275
خصوصیت کلام	281
عبید کی موت کا قصہ	
امیہ بن ابی الصلت	283
امتیازی خصوصیات	287

اصحاب المنتقیات

1- المرقش الاکبر 294
2- علقمہ الفحل 305
مذکورہ بالا قصہ کی حیثیت 309

صعالیک

316
صعلوک بننے کی وجہ 317
الشنفریٰ 322
شنفریٰ کا قصیدہ 329
شنفریٰ کا قصیدہ لامیۃ العرب 331
شنفریٰ کے چیدہ اشعار 333
تابط شرا 334
اشاریہ 350

جلد دوم

355

پیدائش آنحضرتؐ' اسلام کیا ہے؟ حدیث کیا ہے؟ خلفائے راشدین 357
پہلا باب: صدر اسلام میں نثر 366
1- قرآن شریف
قرآن کریم' مکہ کی سب سے پہلی سورت' مدینہ کی سب سے پہلی سورت'

آخری آیت' قرآن کی سورتوں اور آیات کی تعداد مکی سورتیں مدنی سورتیں
قرآن کریم کی جمع و تدوین' قرآن کا اعجاز انداز بیان اور اس کا عربی زبان' و ادب پر اثر
2- حدیث شریف 388
حدیث کی تعریف حدیث کی اہمیت روایت حدیث' تدوین حدیث'
حدیث کا اثر عربی زبان و ادب پر' آنحضرتؐ کے کلام کی امتیازی خصوصیات'
حدیث سے پیدا شدہ علوم نمونہ کلام
3- عربی زبان پر اسلام کا اثر 404

دوسرا باب

407

گفتگو یا بول چال صدر اسلام میں
صدر اسلام میں خطابت یا تقریر پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ
دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ
چوتھے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ
تیسرا باب: رسم خط / طرز تحریر 474
چوتھا باب: صدر اسلام میں شعر و شاعری 488
مخضرم کی اصطلاح کا مطلب 501
ممتاز مخضرم شعراء: 505
1- کعب بن زہیر' 2- لبید بن ربیعہ' 3- الخنساء' 4- الحطیہ' 5- حسان بن ثابت الانصاری'
6- کعب بن مالک' 7- عبداللہ بن رواحہ' 8- النابغتہ الجعدی' 9- عمرو سعدی بن کرب
الزبیدی' 10- ابوذویب الہذلی

از : حضرت مولینا ابوالحسن علی حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مقدّمہ

جلد اوّل

ہندوستان میں اسلام کی آمد اور مسلمانوں کی سکونت و استقرار کے بعد سے عربی زبان و ادب کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اسلام اور عربی زبان کا ایسا لازوال رشتہ ہے کہ وہ کسی عہد اور کسی ملک میں بھی منقطع نہیں ہو سکتا۔ عربی زبان میں قرآن مجید کے نزول نے اس کی ابدیت اور جہاں گیری پر آخری مہر لگادی ہے۔ اور اب اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ عربی زبان کی اہمیت محسوس کی اور اس کو ہر دور میں سینے سے لگائے رکھا بلکہ اس کی خدمت و اشاعت اور توسیع و ترقی میں اپنا مخصوص کردار ادا کیا۔ اور انھوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی ہمسری و رفاقت کی بلکہ کبھی کبھی ان کی رہنمائی اور رہبری کا فرض بھی انجام دیا اور نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی ہم زبانی اور ہم نوائی کی جرأت کی جو ایک عجمی قوم کے لیے سرمایۂ فخر و مباہات ہے بلکہ کبھی کبھی جدت و اجتہاد سے بھی کام لیا۔ شاہراہ عام سے ہٹ کر نئی روشیں پیدا کیں اور قصر ادب میں بعض نئے نئے دریچے اور نئے روزن بھی کھولے۔ مثال کے طور پر اس جدت و جرأت کا سہرا ایک ہندوستانی عالم ہی کے سر ہے کہ اس نے ایک مستند ترین معجم (لغت) کی شرح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں زبان کی ایسی اداشناسی اور نکتہ سنجی کے نمونے پیش کئے کہ اہل زبان نے بھی اس کی زبان دانی اور دقیقہ رسی کا اعتراف کیا۔ میرا اشارہ علامہ مجدالدین فیروزآبادی کی شہرہ آفاق لغت "القاموس المحیط" کی عربی شرح "تاج العروس" کی طرف ہے۔ جو تیرھویں صدی کے مشہور ہندوستانی فاضل علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی معروف بزبیدی (م ۱۲۰۵ھ) کے قلم سے دس ضخیم جلدوں میں نکلی ہے اور پانچ ہزار

صفحات پر مشتمل ہے۔ میرے علم میں نہ صرف عربی زبان بلکہ کسی دوسری زبان میں بھی کسی عظیم وضخیم لغت کی شرح کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات پر سب سے زیادہ مستند اور مفصل کتاب ایک ہندی ہی عالم کے قلم سے، کشاف اصطلاحات الفنون کے نام سے نکلی اور پوری علمی دنیا میں مقبول ہوئی۔ اس کے مصنف قاضی محمد علی تھانوی بارھویں صدی کے علماء میں ہوئے ہیں۔

عربی لغت ومعاجم کے میدان میں اس خدمت کے ماسوا ہندوستانی علماء نے اور میدانوں میں بھی اپنی ذہانت قوت ایجاد واختراع سے کام لیا۔ مولانا سید عبدالجلیل بلگرامی اور ان کے نامور نواسے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے فن بلاغت وبدیع اور فن عروض میں نئے اضافے کئے اور عربی شاعری میں ہندوستانی موزونیت طبع اور ہندی وفارسی شاعری کے پیوند لگا کر ذہن وذوق میں نئی تحریک اور جمود وتقلید کی ساکن سطح میں نیا تموّج پیدا کیا۔ جسٹس کرامت حسین لکھنوی اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری نے فقہ اللسان اور المبین کے ذریعے عربی زبان کے فلسفہ لغت اور نحو واشتقاق کے بہت سے اسرار کی نقاب کشائی کی اور اپنی سلامتِ ذوق اور جودتِ طبع کے نادر نمونے پیش کیے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں تاریخ ادب عربی پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ یہاں صدیوں سے سبعہ معلقہ اور متنبی نظم میں اور مقامات حریری نثر میں زیر درس چلی آرہی ہیں۔ لیکن کوئی کتاب ایسی نصاب میں داخل نہیں تھی جس سے طلبا کو دورِ جاہلیت، دورِ اسلامی (عہدِ اموی وعہدِ عباسی) کا فرق معلوم ہو اور وہ ہر دور کے نامور شعراء کے ناموں، ان کے اسالیب، ان کے طبقات اور ان کی خصوصیات سے واقف ہوں، یا عربی زبان وادب کے ارتقا اور عہد بعہد کی تبدیلیوں اور خارجی اثرات کی کارفرمائی کا ان کو کچھ بھی اندازہ ہو۔ خود اصحاب معلقات، شعرائے حماسہ اور متنبی کے حالات زندگی، ان کے عہد اور ماحول کا ان کے کلام کے پس منظر اور ان کی شاعری کی اندرونی وبیرونی محرکات کا کچھ علم ہو۔ وہ جب معلقات یا حماسہ پڑھتے ہیں تو ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک تاریک سرنگ سے گزر رہے ہیں جس میں ان کو اپنے چپ وراست اور گرد وپیش کا کوئی علم نہیں۔ اگر ان کتابوں کی شرح میں چند سطریں کسی شارح نے ان شعراء کے متعلق لکھ دی ہیں تو وہ ان کو بے دلی سے پڑھ لیتے ہیں اور نہ یہ بھی نہیں۔ تنقید ادب (النقد الادبی) اور فلسفہ تاریخ تو بہت دور کی چیز ہے ان کو بقدر ضرورت بھی ان شعراء وادباء اور ان کے عہد کے متعلق ابتدائی معلومات بھی حاصل نہیں ہوتیں، اس کی وجہ سے ان سے شعرا کے زمانے کا تعین، ان کے معاصرین یا ممدوحین کے عہد کے بارے میں نثر تلمیحات، واشارات کے سمجھنے میں بڑی

بڑی افسوسناک غلطیاں ہو جاتی ہیں جن سے ان کو اہل فن کے سامنے خفت اٹھانی پڑتی ہے اور وہ اس نقص کی وجہ سے ان شعرا کے کلام یا زبان و ادب سے حقیقی لطف اٹھانے اور ان کا مرتبہ متعین کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں تقریباً نصف صدی سے زیادہ سے عربی زبان و ادب کے نصاب کی اصلاح و تکمیل اور اس کی توسیع و ترقی کا کام شروع ہوا۔ اس بارے میں بہت سے اچھے اقدامات کئے گئے بہت سی مفید کتابیں شامل کی گئیں جو عربی زبان و ادب کی صحیح نمائندگی کرتی ہیں اور ان سے زبان کا صحیح ذوق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ ادب عربی کی طرف توجہ بڑی تاخیر سے شروع ہوئی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہندوستان میں سب سے پہلے استاذ محترم مولانا خلیل عرب نے جو ایک صحیح الذوق اور کامل الفن معلم تھے اس علم کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ اس وقت تک خود عربی زبان میں صرف جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" جو چار جلدوں میں ہے مشہور رتھی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ مصنف نے ادب عربی کو اس کے وسیع مفہوم میں لیا ہے اور وہ کتاب عربی و اسلامی ثقافت پر ایک اوسط درجے کی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضخیم کتاب کا یہاں کے مدارس اور جامعات میں پڑھانا ممکن نہ تھا۔ عرب صاحب نے اس کے خلاصے کو داخل نصاب کروایا۔ اس کا نام مختصر تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" اور اس کے مصنف کا نام توفیق دیان مصری ہے۔ عرصہ تک یہ کتاب لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل رہی اور میں نے بھی مولانا خلیل عرب صاحب سے خانگی مدرسے میں یہ کتاب پڑھی اور بہت فائدہ اٹھایا۔ میں اسی کتاب کے ذریعہ اول اول تاریخ ادب عربی سے روشناس ہوا اور وہ اجنبیت و ناواقفیت دور ہوئی جو عربی کے طلبا کو اس ملک ماحول عہد اور طبقات شعراء سے ہوئی ہے۔ غالباً اسی زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے اردو میں تاریخ الادب العربی پر کتاب لکھی جو اس وجہ سے کہ اردو میں اس وقت تک اس موضوع پر کوئی کتاب نہ تھی خاصی مقبول ہوئی اس موقع پر اس حقیقت کا اعتراف کرنا ایک اخلاقی فرض ہے کہ اس میدان میں یونیورسٹیاں ہمارے عربی مدارس سے سبقت لے گئیں۔ انھوں نے اس مضمون کی اہمیت کو بہت پہلے محسوس کیا اور اس کو اپنا جزو نصاب بنایا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر نکلسن کی کتاب "اے لٹریری ہسٹری آف دی عربس A LITERARY HISTORY OF THE ARABS"، تقریباً ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں داخل نصاب اور شعبۂ عربی کے اساتذہ کا سب سے بڑا مرجع اور ماخذ ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یہ مضمون داخل نصاب ہوا۔ اس وقت

تک مصر کے مشہور ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز احمد حسین الزیات کی کتاب تاریخ الادب العربی اس موضوع پر سب سے اچھی کتاب سمجھی جاتی تھی اور درسی ضروریات کے لیے ہی لکھی گئی تھی اور مصر کے عام مدارس اور کالجوں میں داخل نصاب تھی۔ غالباً ۱۹۲۶ء، ۲۵ء میں وہ دارالعلوم کے بعض نوجوان اساتذہ کی تحریک سے داخل نصاب کی گئی اور ابھی تک وہ نصاب میں داخل ہے۔ میں سلسلہ میں جب قاہرہ میں اس کے مصنف زیات سے ملا اور میں نے ان کو بتایا کہ ان کی کتاب ہمارے یہاں داخل نصاب ہے اور مجھے کئی سال اس کے پڑھانے کا شرف حاصل ہوا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اس کو مصر کی مقبولیت کی دلیل اور اپنی خوش قسمتی سمجھی۔ یہ کتاب اپنے مصنف کے مسلم ادبی ذوق اور حسن انتخاب کا نمونہ ہونے کے باوجود بہت سی حیثیتوں سے محل نظر ہے۔ اس میں ہم ہندی طلبا اور رفضلاء کے لحاظ سے بعض جگہ تطویل ہے اور بعض جگہ اختصار اور پھر اس میں ان کی انشاپردازی بہت جگہ تاریخ نویسی پر غالب آگئی ہے۔ ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ہندوستان اور اس کے مخصوص کردار کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس سے ہندوستانی علماء کی ان ادبی خدمات اور مساعی کا بالکل علم نہیں ہوتا جو انھوں نے مختلف عہدوں میں انجام دیں اور جن کو تاریخ ادب کا کوئی مصنف اور زبان عربی کا دلدادہ اور بہی خواہ فراموش نہیں کر سکتا۔ نیز اب اس سلسلہ میں ہندوستان میں جو کام ہو رہا ہے اور ندوۃ العلماء کے دبستان سے تعلق رکھنے والے اس سلسلہ میں جس کوشش و کاوش میں معروف ہیں اسی طرح بعض اور مدارس اور یونیورسٹیوں نے جس طرح عربی زبان کو ہندوستان میں قائم رکھا ہے اور اس کے ساتھ غیر معمولی اعتناء سے کام لے رہے ہیں ان کا ذکر نہ کرنا ایک حق ناشناسی اور علمی کوتاہی ہے۔

بہت عرصے سے مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ خود ہندوستان میں تاریخ ادب عربی پر مستقل کتاب لکھی جائے کہ ایک ہندوستانی فاضل ہی ان کوششوں اور کامیابیوں کا صحیح طور پر جائزہ لے سکتا ہے جو یہاں عربی کے سلسلہ میں حاصل ہوئیں نیز وہی اس تناسب کو ملحوظ رکھ سکتا ہے جس تناسب سے ایک ہندوستانی طالب علم کے سامنے یہ معلومات پیش کرنا چاہیئے۔ وہی اپنے ہم وطنوں اور ہم جنسوں کے لیے "خذ ما صفا ودع ما کدر" اور "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے اصول پر عمل کر سکتا ہے۔ میرا خیال عربی میں اس کتاب کو تیار کرانے کا تھا اور میں نے دارالعلوم کے ان نوجوان اساتذہ سے جو ادب عربی اور تاریخ ادب کی تدریس کا فرض انجام دیتے ہیں۔ اس کا تذکرہ بھی کیا۔ اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو دوسرے مضامین کی طرح اس موضوع پر شاید ندوۃ العلماء کوئی کتاب عربی میں مہیا کر سکے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے نوجوان فاضل مولوی عبدالحلیم ندوی صدر شعبہ عربی، جامعہ

ملیہ اسلامیہ نے اس موضوع پر ایک کتاب اردو میں عربی ادب کی تاریخ کے نام سے تیار کرلی جو اس وقت پیش نظر ہے۔ یہ کتاب ابھی زیر ترتیب ہے۔ میرے سامنے اس کا جو مسودہ ہے جو غالباً کتاب کا پہلا حصہ ہوگا وہ عہد جاہلی کے ساتھ مخصوص ہے۔ مولوی عبدالحلیم صاحب ندوی اس موضوع پر قلم اٹھانے کے ہر طرح سے اہل ہیں۔ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ انھوں نے ذوق و دلچسپی کے ساتھ تاریخ ادب عربی پڑھی۔ جامعہ ملیہ میں تعلیم پانے کے بعد وہ مصر گئے اور وہاں قاہرہ یونیورسٹی اور مصر کے ادبی، علمی حلقوں اور ماحول سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی نظر عربی انگریزی دونوں ماخذ پر ہے وہ اس موضوع کے مقتضیات و آداب اور اس کے مزاج سے واقف ہیں۔ وہ اس موضوع کے وسیع رقبے اور اس کے آفاق و اطراف سے بھی ناآشنا نہیں۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس سلسلہ میں اب کیا کیا نئی بحثیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کے لیے کیا مقدمات اور بنیادی معلومات ضروری ہیں۔ جدید دانش گاہوں اور عصری جامعات میں اس کو کس طرح ایک زندہ اور ترقی پذیر مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاسکتا ہے۔ اس کا زندگی سے کیسا گہرا ربط ہے اور اس قوم و ملک اور اس عہد میں اس کی جڑیں کتنی گہری اور وسیع ہیں۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے خود مصنف میں کیا صلاحیتیں و مناسبتیں ضروری ہیں اس کے اندر کس درجہ کا ادبی ذوق اور خود اپنی زبان و ادب سے کس حد تک واقفیت ضروری ہے، اس سے بھی وہ ناآشنا نہیں ہیں۔ میں نے مسودہ پر نظر ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس منزل کو طے کیا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت سے مستشرقین کی طرح دقتی اور محدود نہیں ہے کہ جب کسی موضوع پر لکھنا پڑا تو اسی وقت سے مطالعہ شروع کیا اور اس سے ضروری واقفیت بہم پہنچا دی گئی۔ ان کے ذہن و ذوق نے اس موضوع کو صحیح طور پر ہضم کرلیا ہے اور وہ اس میں محض نقال اور خوشہ چیں نہیں ہیں بلکہ اس سے لطف لینے میں اہل زبان کے شریک اور اہل ذوق کے ہمنفس اور ہمنوا ہیں۔ ان کی تحریر میں سنجیدگی بھی ہے، شگفتگی بھی، سلاست بھی حلاوت بھی، مورخ کا احساس ذمہ داری بھی اور ادب کے ایک طالب علم اور صاحب ذوق کا انبساط و احتفاظ بھی۔ اگر یہ سلسلہ مکمل ہو گیا تو ہمارے نصاب تعلیم کا ایک بڑا خلا پر ہوگا اور ایک اہم ضرورت کی تکمیل۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کو اس کی تکمیل کی توفیق عطا ہو اور ان کی یہ کتاب عام قبولیت پائے۔

ابوالحسن علی الندوی

مُقدّمہ

جلد دوم

بہت دن ہو گئے ۔ اس کتاب کے پہلے حصہ کو چھپے ہوئے تقریباً دس سال بیت گئے۔ ان دس برسوں میں پہلی جلد نے اپنا چولا تو نہیں بدلا مگر اس کے تین ایڈیشن نکل چکے جس سے اندازہ ہوا کہ کتاب قدر و منزلت کے ہاتھوں لی گئی، اور ذوق و شوق کی نظر سے پڑھی گئی اور میری محنت ٹھکانے لگی۔ پتہ نہیں پڑھنے والوں کو کچھ دے پائی یا نہیں پر مجھے شکر و سپاس گزاری کے احساس کے ساتھ سکون و اطمینان کی وہ دولت دی گئی جو شاید ہزاروں کھنکتے سکے نہ دے سکتے۔ اور یہ بہت بڑا حاصل ہے مجھ جیسے طالب علموں کے لیے، جنھوں نے اپنی عمر تازہ و نوش کو تحقیق و تدوین، تلاش و جستجو اور عربی ادب و تاریخ کے ناپیدا کنار بحر بیکراں سے علم و فن کے جواہر ریزے نکالنے میں بتادی، کہ پہلا حصہ ثمرہ تھا، کم و بیش دس سال کی محنت شاقہ کا، اور اب یہ حصہ بھی تقریباً دس سال کی ہی محنت و جانکاہی کا نتیجہ ہے۔ ان دس برسوں میں مجھے کتنی بار خجالت اور احساس ندامت کے ساتھ اپنی کوتاہی کا احساس ہوا ہے، اس کو نہ پوچھئے کہ ہر یونیورسٹی میں دو ایک طالب علم ضرور ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر مجھے گھیر لیتے تھے اور میں سوائے اس کے کچھ اور نہ کہہ پاتا تھا کہ دوسرا حصہ تیار ہو رہا ہے، اور جلد ہی چھپ جائے گا۔ بعض وقت مجھے ان کا تلخ مگر با ادب انداز سوال بڑا پیارا لگتا، کیونکہ ان کے ان سوالوں سے اس شدید کمی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا جو وہ دوسرے حصے کے نہ ہونے پر محسوس کرتے تھے۔ پر کون جانے کہ ان حصوں کی تیاری

کے دوران اور پھر ان کی تیاری کے بعد زندگی کن کن راہوں سے گزر کر ہر حصہ کے خاتمہ پر ایک نئے موڑ پر کھڑی ہو جاتی تھی، اور میں بے چارہ حیرت و حسرت کا مارا، پیچھے مڑ کر عمر رمیدہ کو آواز دینے کی کوشش کرتا تو مستقبل تصور و تخیل کے پردے پر ایک ایسی بوقلموں مگر عزم و حوصلے سے بھرپور زندگی کے خدو خال ابھار دیتا کہ میں اس میں رنگ بھرنے میں یہ بھی بسا اوقات بھول جاتا کہ زد میں ہے رخش عمر اور یوں وقت کا قافلہ گذر جاتا، اور کتاب بچھڑ جاتی۔

اب یہی دیکھئے کہ جب پہلی جلد تیار ہوئی اور چھپنے کے لیے پریس گئی تو کارکنان قضا و قدر نے اسی کے ساتھ دلی سے ہمارے کوچ کا بگل بجا دیا۔ اور جب یہ جلد چھپ کر باہر نکلی تو یادش بخیر جامعہ ملیہ اسلامیہ، اپنی مادر علمی سے باہر لوگوں کے کہنے کے مطابق پتھروں کے شہر مگر طرحدار حیدرآباد کے ایک علمی و تعلیمی مرغزار سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز میں پہنچا دیا۔ جہاں چند دنوں پہلے مستقبل نے تصور کے پردے پر جو ہلکے خطوط کھینچے تھے ان کو اُجاگر کرنے اور ان میں رنگ بھرنے میں لگ گیا، اور اسی کے ساتھ اس دوسرے حصہ کے خدو خال اُبھارنے میں بھی، اور جب انسٹی ٹیوٹ کا شعبہ عربی نوزائیدگی کی کلفتوں سے نجات پاکر، ترقی و تکمیل کی منزلوں کو طے کرکے جوان رعنا ہو گیا، اور کتاب کا یہ حصہ مکمل چھپنے کے لیے تیار ہوا تو کارکنان قضا و قدر کے تیور بدلے، اور وقت نے رخش عمر کی لگام کھینچ دی کہ ٹھہر زندگی کے سفر کا پھر ایک مشکل مقام آیا۔ اور وہ مقام تھا۔ ریٹائرمنٹ کا، جس کی تاریخ فرشتوں کے لکھے پر تو نہیں البتہ کارکنان دفتر کے لکھے پر ۱۳ مارچ ۱۹۸۶ء تھی، جسے بڑھا کر انسٹی ٹیوٹ کے قاعدوں اور قانون نے ۱۶ اپریل ۱۹۸۶ء یعنی اختتام تعلیمی سال تک کر دیا تھا۔ رخت سفر باندھا اور اسی کے ساتھ اس حصہ کا مسودہ بھی۔ اور بچشم پُرنم، یا با احساس حسرت دیاس نہیں، بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو پوری ایمانداری، دیانتداری اور قدرت کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا کر، کام کو عبادت سمجھ کر مکمل کر لینے کی خوشی اور سکون و اطمینان کے احساس کے ساتھ حیدرآباد کو خیر باد کہہ کر ایک بار پھر ذوق کی دلی طرف جو اب اپنی بھی دنیائے دل ہے، چل پڑے، جہاں نہرو یونیورسٹی کے

دبستان صد رشک بہاراں نے اپنی آغوش قدر و منزلت میں اس طرح سمو لیا کہ نہ زیاں رہا اور نہ خوف دوری منزل، کہ سفینہ کنارے سے آلگا۔ اور اب ۔ ۔ ۔ ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ۔

اس دوسری جلد کی تیاری کے سلسلہ میں جب تاریخ و ادب کے اصلی عربی مصادر و مراجع جیسے اغانی للاصفہانی، طبقات فحول الشعراء للجمحی، کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ، معجم الشعراء للمرزبانی، یتیمۃ الدھر للثعالبی، وفیات الأعیان لابن خلکان، اور الأمالی للقالی، الکامل للمبرد اور عیون الاخبار لابن قتیبہ وغیرہ کا مطالعہ کیا اور ان کے بعد موجودہ زمانے کے تذکرہ نگاروں میں جرجی زیدان اور مصطفیٰ صادق الرافعی اور طٰہٰ حسین سے لے کر احمد حسن الزیات، شوقی ضیف، عمر فروخ، اور حنا الفاخوری وغیرہ کا تقابلی مُطالعہ کیا تو دیکھا کہ ان مصنفین میں سے اکثر نے اصل عربی مراجع سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ اکثر نے اپنے مضامین کی ابتدار انھیں کتابوں کے حرف بحرف تمہیدی کلمات سے ہی کی ہے، اور انھیں کے انداز و اقوال پر اپنی کتابوں کو ڈھال دیا ہے۔ بعض نے اور خاص طور سے مصطفیٰ صادق الرافعی، طٰہٰ حسین، شوقی ضیف اور حنا الفاخوری نے ان مراجع سے استفادہ کرنے کے بعد اپنے انداز سے سوچ و بچار کر کے فکر و نظر کے لیے نئی راہیں نکالی ہیں اور بحث و تمحیص اور تحقیق و تدقیق کے نئے علمی اصولوں پر نوشتوں کو پرکھ کر اپنے نتیجے پیش کیے ہیں جن سے میں نے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ البتہ جن موقعوں یا موضوعات پر مجھے اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے نتیجے میں ان سے اختلاف نظر آیا، اس کی نشاندہی کر کے دلائل و براہین کی روشنی میں بلری صفائی سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے۔ اب قاری کو اختیار ہے کہ میری بات کو مانے یا ان بزرگوں کے نقطۂ نظر کی پیروی کرے یا اپنی الگ رائے قائم کرے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ ان بزرگوں کی کوششوں اور محنت شاقہ نے مدفون سفینوں سے گہرہائے تابناک نکال کر اور ان پر پڑی زمانے کی گرد و غبار کو صاف کر کے، ہمارے سامنے تحقیق و تدقیق، اور تلاش و جستجو کے ایسے انمول مرقعے پیش کر دیئے ہیں کہ رہتی دنیا تک ان کے یہ علمی کارہائے نمایاں علم و ادب اور تاریخ و تذکرہ کی دنیا میں قابل تقلید نمونہ کی حیثیت سے ہمیشہ رہنمائی کا کام کرتے رہیں گے۔

یہ حصہ جو عربی ادب کی تاریخ : زمانۂ جاہلیت سے موجودہ زمانہ تک ۔۔۔ کی دوسری جلد ہے کتاب کے خاکہ کے مطابق آنحضرت اور خلفائے راشدین کے زمانہ پر (جس کو اصطلاح میں صدر اسلام کہتے ہیں) مشتمل ہے۔

اس حصہ کی تصنیف میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو پہلی جلد کا ہے۔یعنی اس عہد سے پہلے اس کے بیک گراؤنڈ کا مختصر مگر جامع نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ اس عہد کی امتیازی خصوصیات کی جھلک سامنے آجائے اور ان سیاسی واقتصادی و تہذیبی و تمدنی حالات و کیفیات اور افراد و معاشرہ کے ذہنی رجحانات اور فکری میلانات کا پتہ چل جائے جنھوں نے عربی ادب پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے ، اس کے بعد اس عہد میں نشو و نما پائے ہوئے علوم و فنون اور ان کے ممتاز فنکاروں کا کہیں قدرے تفصیل سے اور اکثر مختصر مگر جامع تذکرہ کیا گیا ہے ، کوشش کی گئی ہے کہ اس عہد میں فکر و فن کے مروّجہ مکاتب فکر کے سب سے ممتاز شخصیت کا بطور نمونہ تفصیل سے تقابلی مطالعہ کیا جائے اور اس فن میں اس کے رول اور اس کی خدمات کو اجاگر کرکے اس کا درجہ اور حیثیت متعین کی جائے تاکہ آنے والی نسلوں کے سامنے غور و فکر کرنے اور تحقیق و تدقیق اور بحث و تمحیص کے لیے راہ ہموار کی جاسکے کہ اسی طرح کاروان علم و دانش اور قافلۂ فکر و فن اپنی منزل کی طرف جادۂ پیما رہتا ہے۔

البتہ اس حصہ میں اس عہد کے شعری مضامین کے نمونے طوالت کے خیال سے نہیں دیئے گئے ہیں ،معلوم نہیں میری کوششیں کہاں تک بار آور ہوئی ہیں، اور میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں ،مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ انداز گفتار اور طریقۂ تالیف ہمارے طالب علموں اور عربی زبان و ادب کے دوستوں کے دلوں میں کچھ سوالات کو ضرور ابھارے گا ،جن کے جوابات تلاش کرنے کے لیے شاید انھیں رندان جامعات میں سے کوئی جیالا نکل آئے ۔ اگر ایسا ہوگیا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور میری سعی تمام ہوگئی کہ حرف آخر لکھ دینے یا کہہ دینے کے لیے بڑا جگر اور خارہ شگاف قلم چاہئے جس سے یہ خاکسار محروم ہے، خدا سے دعا ہے کہ میری محنت کو شرف قبولیت بخشے اور عربی زبان و ادب سے

شغف رکھنے والے طلباء و اساتذہ کو یہ کام پسند آئے اور کسی نہج سے ان کو فائدہ پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

اس مسوّدے کی ترتیب و تبییض میں میری بیٹی ہما حلیم ایم۔ اے عربک (اب ہما یحییٰ) نے بڑا ہاتھ بٹایا، خدا ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ زندہ رکھے اور علم و ادب کے وافر حصّے سے نوازے۔

شکر گذار ہوں، ذمّہ داران ترقی اُردو بیورو، حکومت ہند کا جن کے تعاون اور اشتراک کے بغیر کتاب زیور طباعت سے اس طرح آراستہ ہو کر سامنے نہ آسکتی جس طرح آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

پہلا باب

جلد اول

جزیرہ نمائے عرب، عرب قوم اور عربی زبان کا مختصر تعارف

ملک عرب

عرب قوم زمین کی جس حصہ پر رہتی ہے، اس کو "جزیرہ نمائے عرب" کہتے ہیں۔ اس کے تین طرف پانی ہے، اور ایک طرف خشکی۔ یہ جزیرہ نما، براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کی شمالی سرحدیں شام، جزیرہ (سعودی عرب) اور عراق سے ملتی ہیں، اور جنوبی سرحدیں بحر ہند سے۔ اس کی مشرق میں خلیج فارس اور عُمان کے علاوہ بحر ہند واقع ہیں، اور مغرب میں بحر احمر یا بحر قلزم (Red Sea) ملک عرب کے باشندوں کی مجموعی تعداد، یورپ کی مجموعی آبادی کی چوتھائی ہے۔ اس جزیرہ نما کے اندر پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے، جسے کوہ سرات کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ شام کی سرحدوں سے جا ملتا ہے، اور اس کی وجہ سے جزیرہ نما عرب قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔

(۱) مغربی حصہ

(۲) مشرقی حصہ

مغربی حصہ کوہ سرات کے دامن سے لے کر بحر احمر (RED SEA) کے ساحل تک نیچا ہے اسی لیے اس کے نشیبی علاقہ کو (غور) کہتے ہیں اور چونکہ اس علاقے میں گرمی بہت پڑتی ہے اس لیے اسے (تہامہ) یعنی پیاس لگنے کی جگہ بھی کہتے ہیں۔

مشرقی حصہ ابھرا ہوا ہے، اور اس کی سرحدیں عراق سے ملی ہوئی ہیں۔ اس لیے اس کو نجد یعنی "اونچی زمین" کہتے ہیں۔ ان دونوں حصوں کے بیچ میں زمین کا جو ٹکڑا ہے اسے حجاز یعنی "حد فاصل"

کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں کے درمیان حدفاصل کا کام کرتا ہے۔ اس حصہ کا وہ خطہ جس میں نجد کے بعض علاقوں کے علاوہ یمامہ، بحرین اور عمان بھی آجاتے ہیں۔ "عروض" یعنی "چوڑائی میں پڑا ہوا حصہ" کہلاتا ہے اس لیے کہ یہ یمن اور نجد کے بیچ چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔ حجاز کے جنوب میں جو علاقہ ہے اسے "یمن" کہتے ہیں۔ یمن کے معنی "داہنی جانب اور خیر و برکت والی زمین" کے ہیں۔ چونکہ یہ خانہ کعبہ کی داہنی جانب ہے، اور خاصا سرسبز و شاداب علاقہ ہے، اسی لیے سب سے پہلے یونانیوں نے اسے خیر و برکت کی سرزمین کے نام سے یاد کیا۔ اس کے بعد عربوں نے بھی اسی نام کو اپنایا اور آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔

حجاز جزیرہ نما عرب کا، خاصا گرم خطہ ہے۔ یہاں بہت پرانے پہاڑ پائے جاتے ہیں، جن پر سورج کی سخت کرنیں جب پڑتی ہیں تو یہ گرم ہو کر سارے خطہ کو آگ سے بھر دیتے ہیں۔ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے، اسی لیے عام طور سے یہاں سوکھے کا سا سماں رہتا ہے۔ ان پہاڑوں کے بیچ میں بعض وادیاں بھی ہیں، جن میں جہاں تہاں گھاس پھوس اگ آتی ہے۔ طائف اس علاقہ کا سب سے سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ یہاں ہریالی کے علاوہ پھلوں میں انجیر، انگور، سیب اور زیتون بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

حجاز کے مشہور شہر

حجاز میں کئی مشہور اور بڑے شہر پائے جاتے ہیں، مگر ان میں سب سے زیادہ مشہور اور مسلمانوں کے نزدیک مقدس دو شہر ہیں:

۱۔ مکہ۔

۲۔ مدینہ۔

مکہ شہر اونچے پہاڑوں سے گھرے ایک خشک اور بنجر وادی میں آباد ہے۔ اسی چٹیل اور خشک وادی میں جہاں ہریالی کا نام و نشان بھی نہ تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کو خدا کے حکم سے لا کر چھوڑا تھا۔ بعد میں اسی وادی میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے خاندان جرہم میں شادی کی اور یہیں سے اس وادی میں آبادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ شہر شمالاً اور جنوباً دو میل لمبا ہے اور شرقاً و غرباً ایک میل چوڑا۔ اسی شہر مکہ میں خدا کا گھر کعبہ ہے، جس کا مسلمان ہر سال حج کرتے ہیں اور دنیا کے کسی خطہ میں رہتے ہوں اسی کی طرف منھ کر کے پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی یہ گھر بہت مقدس اور خدا کا گھر سمجھا جاتا تھا چنانچہ عرب کے لوگ ہر سال اس کا حج کرتے تھے۔ اور اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں میں اسی سے سہارا لیتے تھے۔ کعبہ سے بالکل ملا ہوا پانی کا وہ مشہور کنواں ہے جسے زمزم کہتے ہیں۔ اسی شہر مکہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

مدینہ

حجاز کا دوسرا مشہور اور مقدس شہر مدینہ ہے، جسے "مدینۃ النبی" "طیبہ" یا صرف "المدینہ" کہتے ہیں اسلام سے پہلے اس شہر کا نام "یثرب" تھا۔ یہ شہر بھی پہاڑوں سے گھری ایک وادی میں آباد ہے۔ اس شہر کے شمال میں تھوڑی دور پر اُحد کا وہ مشہور پہاڑ ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ والوں میں سخت لڑائی ہوئی تھی۔ مدینہ میں کھجور کے باغات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ عرب کے مشہور کھجوروں کی قسمیں یہیں پیدا ہوتی ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ چھوڑ کر یہیں پناہ لی تھی، اور ساری عمر یہیں رہے اور یہیں انتقال فرمایا اور یہیں اپنی مسجد میں، جسے مسجد نبوی کہتے ہیں آرام فرمار ہے ہیں۔ کعبہ کا حج کرنے کے لیے جو بھی حاجی آتے ہیں وہ آپ کے قبر کی زیارت کرنے کے لیے مدینہ ضرور آتے ہیں۔

یمن اور اس کے مشہور شہر

حجاز کے جنوب میں جو علاقہ آباد ہے اسے یمن کہتے ہیں۔ یہ خطہ حجاز کے مقابلہ میں بہت سرسبز و شاداب ہے اور پرانے زمانے سے تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ اس علاقہ میں تاریخ کی چند بہت مشہور اور ممتاز قومیں ابھری ہیں جنھوں نے تہذیب و تمدن کی بعض ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو صدیوں تک ان کی ذہنی ارتقا اور ان کے فضل و کمال کی نشاندہی کرتی رہیں گی۔

یمن کے مشہور شہروں میں "نجران" کا ذکر تاریخ ادب عربی میں خاص طور سے آتا ہے۔ یہاں کے لوگ عیسائی مذہب کے ماننے والے تھے۔ یہاں مکہ کے کعبہ کی طرح ایک کعبہ بھی تھا جس میں یہاں کے لوگ عبادت کرتے تھے۔

یمن کا دوسرا شہر "صنعاء" ہے۔ اس کے شمال مشرق میں "مأرب" کا وہ مشہور شہر آباد تھا جسے "سبا" بھی کہتے تھے۔ مشہور "ملکہ سبا" یہیں کی رہنے والی تھی یہیں پر وہ مشہور بند تھا جس کا ذکر قرآن شریف میں "سد مارب" کے نام سے آیا ہے اور جو بعد میں مشہور سیلاب میں بہ گیا تھا اور جس کی وجہ سے یہاں کے باشندے قبیلہ ازد کے لوگ ہجرت کر کے عمان میں جا بسے تھے۔

حجاز کے اسی جنوبی حصہ میں "حضرموت" کا علاقہ ہے جس کے شمال میں شہر "احقاف" آباد تھا، جہاں "عاد" کی قوم رہتی تھی اور جس کا ذکر قرآن میں سورۃ "الاحقاف" کے نام سے آیا ہے۔

جزیرہ عرب کا مشرقی علاقہ جو عمان سے عراق کی حدود تک پھیلا ہوا ہے "بحرین" کہلاتا ہے۔ اس کا سب سے مشہور شہر "ہجر" تھا۔ یہاں اس کثرت سے اور اتنی اچھی کھجور پیدا ہوتی تھی کہ ضرب المثل بن گئی تھی۔[1]

(حاشیہ صفحہ نمبر ۲۶ پر)

جزیرہ عرب کے بیچ کا حصہ صحرا ہے، جس میں بعض مقامات پر تھوڑی بہت ہریالی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس صحرا کے بھی کئی حصے اور ان کے مختلف نام ہیں۔ چنانچہ اس صحرا کے اس حصہ کو جو شام سے ملتا ہے "بادیۃ الشام" اور جس حصہ کی سرحدیں عراق سے ملتی ہیں، اسے "بادیۃ العراق" اور عراق کے شمال میں جو حصہ ہے اسے "بادیۃ الجزیرہ" کہتے ہیں۔

جزیرۂ عرب کی آب و ہوا

جزیرہ عرب کے اکثر خطوں کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ مگر بعض علاقے ایسے بھی ہیں جیسے طائف، جہاں گرمیوں کی راتیں بڑی پر کیف اور خنک ہوتی ہیں، اور سردیوں میں ٹھنڈک اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جم جاتی ہے، اور دور سے دیکھنے میں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ سردی گذرنے کے بعد یہی برف پگھل کر چھوٹی چھوٹی نہروں کی شکل میں میدانوں میں بہ کر نکلتی ہے جس سے کھیتی پھل پھول اور سبزی ترکاری سینچی جاتی ہے۔ اس گرمی و سردی کی وجہ سے عرب میں دو قسم کی ہوائیں چلتی ہیں جن کا ذکر عربی شاعری میں اکثر آتا ہے۔ ایک ہوا "بادِ صبا" ہے یہ وہ لطیف اور خنک ہوا ہے جو مشرق سے آتی ہے اور بڑی نشاط انگیز کیف آور اور حیات آفریں ہوتی ہے۔ یہ ہوا غزل گو شعرا کی پیامبر، دکھ درد کی شریک اور واردات قلبی کی امین سمجھی جاتی ہے۔ دوسری ہوا "بادِ سموم"[1] ہے۔ یہ لو کے وہ جھکڑ ہیں جن کے لیے صحرائے عرب مشہور ہے۔ یہاں پانی کی قلت کی وجہ سے باقاعدہ نہروں کا انتظام نہیں ہے، اسی لیے ان علاقوں میں، جہاں تھوڑی بہت قابل کاشت زمین نکل آتی ہے بارش کے سہارے کچھ کاشت کر لی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں اگر اچھی بارش ہوگئی تو وادیوں میں گھاس پھوس بھی اگ آتی ہے، جس سے اونٹ اور بکریاں اپنا پیٹ بھرتی ہیں اور عرب اپنی زندگی گزارنے کے لیے جو اور مسور بو لیتے ہیں۔

جزیرہ نمائے عرب میں سب سے زیادہ زرخیز علاقہ یمن کا علاقہ ہے۔ یہاں بارش بھی خوب ہوتی ہے اور زمین بھی بڑی اچھی اور زرخیز ہے۔ یونانی اور رومی اسی لیے یمن کو "عرب کا خوش بخت اور بابرکت علاقہ" کہتے تھے۔

غرض کہ جزیرہ نمائے عرب ایسا جزیرہ ہے، جہاں مختلف موسم، مختلف آب و ہوا اور مختلف طرز زندگی پائی جاتی ہے۔ اس جزیرہ میں جو قوم رہتی ہے اسے "عرب قوم" کہتے ہیں۔

۱۔ چنانچہ کہتے تھے کہ "کنا قل التمر الی هجر" یعنی "الٹے کھجوریں ہجر کو" جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں "الٹے بانس بریلی کو"۔

عرب قوم اور اس کے مختلف قبائل

مورخین اقوام کے نزدیک عرب قوم، سامی اقوام کی ایک شاخ ہے۔ یہ قومیں حضرت نوح کے ایک لڑکے "سام" کی اولاد میں سے ہیں۔ اسی لیے ان سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان قوموں میں بابلیون، سریانیوں، عبرانیوں، فینیقیون، آرمینیون، حبشیون، سبئیون اور عربوں کو شمار کیا جاتا ہے۔
مورخین میں اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ قومیں مختلف جگہوں میں پھیلنے سے پہلے، دنیا کے کس حصہ میں رہتی تھی۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ یہ قومیں ایشیا ہی کے کسی حصہ میں رہتی تھیں۔ مگر پھر اس بات میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خطہ جزیرہ عرب تھا یا ارمینیہ یا وادی فرات کا نچلا حصہ۔ بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ قومیں ابتدا میں افریقہ میں رہتی تھیں اور وہاں سے ایشیا کی طرف منتقل ہو گئیں۔ بہرحال اس بات سے شاید کسی کو اختلاف نہیں کہ یہ قومیں قدیم زمانے میں ہی ادھر ادھر پھیل گئی تھیں چنانچہ بابلیوں اور اشوریوں نے اپنا مسکن عراق کو بنایا، فینیقون نے شام کے ساحلی علاقے پسند کئے، عبرانیوں نے فلسطین کو اپنی جائے سکونت بنائی اور حبشیوں نے حبشہ ہی کو ترجیح دی۔

عرب اقوام کی تقسیم

مورخین عرب اقوام کو مندرجہ ذیل تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں:

عرب بائدہ

یہ وہ عربی اقوام ہیں جن کے حالات کا نہ تو تاریخ سے پتہ چلتا ہے اور نہ ہی ان کے کسی آثار سے۔ تاریخ میں جو کچھ ان کے متعلق مواد ملتا ہے وہ اتنا گنجلک اور الجھا ہوا ہے کہ اس سے ان کی نہ کوئی صحیح صورت سامنے آتی ہے اور نہ ہی جو صورتیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان کی تردید ہی کی جا سکتی ہے۔ بہرحال ان قوموں کے مشہور قبیلے مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) عاد[۱] (۲) ثمود[۲] (۳) طسم و جدیس[۳] (۴) عملیق[۴] (۵) عبد ضخم[۵]

۱۔ یہ قبیلہ احقاف میں رہتا تھا۔ (۲) ثمود کے لوگ مقام حجر میں (جسے آجکل مدائن صالح کہتے ہیں) اور "وادی القری" میں، جو حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے، رہتے تھے۔

۳۔ طسم و جدیس قبیلے یمامہ میں ایرانی طوائف الملوکی کے زمانہ میں رہتے تھے اور آپس ہی میں لڑ کر کٹ مرے

۴۔ عملیق جمع عمالقہ ان کے آباد و اجداد پہلے یمن میں رہتے تھے پھر مکہ اور یثرب (مدینہ) چلے گئے اس کے بعد شام ہجرت کر گئے۔

۵۔ قبائل عبد ضخم طائف میں رہتے تھے۔ مورخین انساب کا کہنا ہے کہ انہیں لوگوں نے سب سے پہلے عربی رسم خط ایجاد کیا۔

ان قبائل کا ذکر عربی شاعری میں اکثر آتا ہے، قران نے عاد و ثمود کی تباہی کا ذکر اس سے سبق حاصل کرنے کے لیے کیا ہے[6]۔ طسم و جدیس کی تباہی کا سبب ایک عورت کی پیشین گوئی تھی جس کی بعد دونوں قبیلے آپس میں اس طرح کٹ مرے کہ کسی کا بنس ہی نہ بچا[7]۔

عرب عاربہ یا قحطانی عرب

یہ یمن کے وہ باشندے ہیں، جو نسلاً یعرب بن قحطان کی اولاد میں سے ہیں اور جنھیں تورات میں "یارح بن قحطان" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ عربی زبان کے اصلی بانی یمنیوں کے یہی بزرگ ہیں۔ حضرت حسان نے انھیں کا نام لے کر عدنانیوں (قریشیوں) کے مقابلہ میں فخر یہ کہا تھا:

تعلمتم من منطق الشیخ یعرب   أبینا، فصرتم معربین ذوی نفر

۳۔ عرب مُستعرِبہ یا عدنانی عرب

یہ حجاز کے وہ عرب ہیں، جو عدنان کے نسل سے تھے، اور عدنان حضرت اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ یہ لوگ انیسویں صدی قبل مسیح میں حجاز میں آکر ٹھیرے اور یہیں رہ بس گئے ان قوموں کو "مستعربہ" اس لیے کہتے ہیں کہ حضرت اسمعیل کی مادری زبان عربی نہ تھی، انھوں نے عربی زبان جُرہُم کے قبیلے سے سیکھی جو یمنی قبیلہ تھا اسی لیے ان کی اولاد مستعربہ کہلائی یعنی "عرب بنی ہوئی قوم"۔

جنوبی (یعنی یمن میں رہنے والی قحطان کی آل اولاد) اور شمالی (یعنی حجاز میں رہنے والی عدنان کی اولاد) عربوں کی نسل اپنے علاقوں میں اتنی بڑھی کہ متعدد قبیلے بن گئے اور انھوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ کی صفحات میں اپنا نام محفوظ کر گئے، چنانچہ قحطانی عربوں میں "حِمیَر" کا قبیلہ عربوں کی تاریخ میں بہت مشہور رہا ہے۔ حمیر کی شاخ میں زید الجمہور، قُضَاعہ اور سَکَاسِکْ بہت مشہور قبیلے گذرے ہیں۔ کہلان کا مشہور قبیلہ بھی نسلاً قحطانی تھا۔ اس قبیلہ میں ہَمدان طئی، مذحج، کِندہ، لخم، جُذام مشہور ذیلی قبائل ہیں۔ حیرہ کا شاہ منذر اسی لخم کی اولاد میں سے تھا۔ مدینہ کے یہودی قبائل اوس و خزرج اور شاہان غسانۃ، اَزْد کی اولاد میں سے ہیں۔

۶۔ قران نے ثمود کی تباہی کا ذکر اس طرح کیا ہے " فاما ثمود فاھلکوا بالطاغیۃ" اور عاد کی تباہی کا نقشہ یوں کھینچا ہے " واما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیہ "

۷۔ قصہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ کی متداول کتابوں کے علاوہ عمران بن محمد بن عمران کا عربی مضمون "طسم جدیس" مطبوعہ مجلۃ "العرب" الریاض ماہ ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ

عدنانیوں کی اولاد بھی حجاز میں بہت پھل پھولی۔ ان کی تعداد اتنی بڑھی اور ان کے قبائل اس قدر پھیلے کہ اوپر جاکر ان کے آباد اجداد کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ ان عدنانی عربوں کا نسب نامہ عدنان پر ہی جاکر رک جاتا ہے اور حضرت اسمٰعیل سے جو ان کے پہلے جد امجد ہیں، صحیح طریقے سے نہیں مل پاتا۔

اس طبقے میں بھی بہت نام آور قبائل ہوئے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں: رَبِیعہ، مُضَر، اَنمار، اَیاد۔ ربیعہ سے عبدالقیس اور عبدالقیس سے وائل کے دونوں بیٹوں بکر اور تغلِب کی نسل چلی۔ مُضَر سے قیس عیلان اور الیاس بن مضر پیدا ہوئے۔ قیس عیلان کے مشہور قبیلے ہوازن اور غطفان ہیں۔ غطفان سے بغیض کی دو بیٹے عبس و ذبیان کی نسل جاری ہوئی۔ الیاس کی اولاد تمیم بن مر، ہذیل بن مدرکہ، اسد بن خزیمہ، اور کنانہ بن خزیمہ کے خاندان ہیں۔ اسی کنانہ سے قریش کے خاندان نے جنم لیا۔ قریش کے بھی مختلف گھرانے ہیں۔ ان میں مشہور جمح، سہم، مخزوم، تیم، عبدالدار اور عبدمناف ہیں۔ عبدمناف کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹے ہاشم تھے، جن سے عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ عبدالمطلب کے ۱۲ بیٹے تھے، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ سب سے چھوٹے تھے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قحطانیوں (یعنی یمنی عرب) اور عدنانیوں (یعنی حجازی عرب) کے درمیان زمانہ قدیم سے، حسب نسب، زبان اور تہذیب و تمدن میں نمایاں اختلاف کی وجہ سے ہمیشہ دشمنی رہتی تھی۔ چنانچہ یہ یمنی اور حجازی عرب ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑے زور شور سے اپنے حسب و نسب اور تہذیب و تمدن پر فخر کیا کرتے، اور اس قدیمی دشمنی کا نتیجہ وہ اختلاف اور ناچاقی تھی جو مدینہ والوں (اوس و خزرج (جو نسلاً قحطانی یمنی تھی) اور مکہ والوں (جو نسلاً عدنانی حجازی تھے) کے درمیان اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد تک جاری رہی۔ اسلام کے بعد مسلمانوں سے جو لڑائیاں ہوئیں شاید ان میں بھی اس احساس برتری اور پرانی دشمنی کا اثر رہا ہو۔

قبیلہ کا نظام

اوپر کے بیان سے اندازہ ہوا کہ قحطانی (یمنی عرب) اور عدنانی (حجازی عرب) قبائل بعد میں بڑھ کر مختلف قبائل میں بٹ گئے، اور عرب قوموں میں قبیلہ، افراد کے لیے، ریڑھ کی ہڈی کی طرح اہم ہوتا تھا۔ قبیلہ ہی وہ بنیاد تھا جس پر عربوں کی تہذیب و تمدن کی عمارت کھڑی ہوتی تھی۔ یہ ایک بڑا خاندان ہوتا تھا، جس کا ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ ہم سب ایک باپ کی اولاد ہیں۔ اس

لیے ہم کو دکھ سکھ، رنج وراحت اور مصیبت و پریشانی میں سب کا ساتھ دینا چاہئیے۔ عام طور سے قبیلہ اپنے جداعلی کے نام سے پکارا جاتا تھا، جیسے ربیعہ، مضر، یا اوس وخزرج۔ کبھی کبھی کسی قبیلہ کا نام کسی مخصوص حادثہ میں شہرت پا جانے یا منسوب ہو جانے کی وجہ سے، اسی کے نام پر رکھ دیا جاتا تھا جیسے "غسان" کہ یہ ایک چشمہ تھا جہاں پر ایک قبیلہ اترا تھا، چنانچہ اس قبیلہ کا نام ہی غسان پڑ گیا۔

ہر قبیلہ کا ایک سردار یا شیخ ہوتا تھا جس پر پورے قبیلے کے افراد کی اطاعت فرض ہوتی تھی۔ یہی شیخ جنگ وصلح کا فیصلہ کرتا۔ آپس کے جھگڑوں کو چکاتا۔ افراد قبیلہ کی خبر گیری اور نگہبانی ونگرانی کرتا۔ بعض قبیلوں میں یہ رواج بھی تھا کہ شیخ قبیلہ کو افراد قبیلہ کی موت وزندگی پر پورا اختیار ہوتا تھا

اسی طرح ہر قبیلہ کا ایک شاعر یا مختلف شعراء ہوتے تھے، جو قبیلہ کی تعریف میں قصائد کہتے اور اپنے کلام کے ذریعہ، قبیلہ کے شاندار کاموں کا ذکر کرکے فخر کرتے، قبیلہ کی بہادری، مہمان نوازی اور سخاوت کے واقعات بیان کرکے، دوسرے قبائل پر اپنی فضیلت اور برتری ثابت کرتے۔ دوسرے قبائل کے شعراء اگر ہجو کرتے یا ان کے مقابلے میں اپنے کارنامے گنا کر فخر کرتے تو یہ شعراء ان کا جواب دیتے، اور اپنے قبیلہ کی برائیاں چھپاتے اور دوسرے قبیلوں کی برائیوں کو اچھالتے اور انھیں غیرت دلاتے۔ قبیلہ کا ہر فرد اپنے افراد قبیلہ کے جائز اور ناجائز طرفداری کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ "انصر اخاك ظالما اومظلوما" اپنے بھائی کی، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، مدد کرو۔ قبیلہ بحیثیت مجموعی اپنے مقتول افراد کے خون کا بدلہ لیتا، افراد کے مصیبتوں اور پریشانیوں میں ان کا ساتھ دیتا۔ یہ بھی رواج تھا کہ اگر کوئی فرد قبیلہ میں من مانی کرکے اتنے جرائم کرتا، اور اتنے خون بہا دیتا کہ قبیلہ اس کی دیت (یعنی جان کے بدلے میں جان یا مال) نہ دے پاتا تو اس کو قبیلے سے بے تعلق کر دیا جاتا، اب قبیلہ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہ ہوتی ایسا شخص "خلیع" یعنی برادری سے باہر یا "ناٹ باہر" آدمی سمجھا جاتا اور اس کا خون مباح ہوتا یعنی اگر کوئی اسے مار دیتا تو اس کا قبیلہ اس کے خون بہا کا مطالبہ نہ کرتا۔

یہ عربی قبائل ہمیشہ ایک دوسرے سے جنگ وجدال میں مصروف رہتے۔ ایک قبیلہ موقع پاکر دوسرے قبیلہ پر حملہ کر دیتا اور اس کے اونٹ بکریاں حتی کہ لڑکیوں اور عورتوں کو بھی لوٹ کر لے جاتا، اور پھر جب موقع ملتا تو یہ قبیلہ حملہ آور قبیلے پر چڑھائی کرکے اس کا بدلہ لیتا، اس طرح ان میں ہمیشہ جنگ وجدال کی کیفیت رہتی اور امن وسکون سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ ان

جنگوں کی تباہ کاریوں سے عاجز آ کر کبھی کبھی یہ قبائل آپس میں صلح و صفائی بھی کر لیتے اور آپس میں معاہدہ کر لیتے کہ اب لڑائی جھگڑا نہیں کریں گے، بلکہ ایک دوسرے کے آڑے وقتوں میں کام آئیں گے۔ ایسے قبیلے ایک دوسرے کے "حلیف" (یعنی ساتھی یا معاہدہ کئے ہوئے) کہلاتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی دوسرا قبیلہ ان حلیف قبیلوں میں سے کسی ایک پر بھی حملہ کرتا تو ساتھی قبیلہ فوراً اس کی مدد کو دوڑتا اور اس پر فخر کرتا۔ یہ عہد و پیمان اتنے مقدس اور پائیدار سمجھے جاتے تھے کہ اگر کوئی قبیلہ عہد شکنی کرتا تو ساری عرب دنیا میں اس کی ناک کٹ جاتی اور بڑی بے عزتی اور حقارت سے اس کا ذکر ہوتا۔ اس قسم کے جنگوں، صلحوں اور معاہدوں کا ذکر جاہلی شاعری میں بہت آیا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عرب قوم دو بڑے طبقوں میں تقسیم کی جاتی ہے:

۱۔ قحطانی یعنی یمنی عرب اور (۲) عدنانی یعنی حجازی عرب۔ یہ دونوں طبقے مختلف دو بڑی شاخوں میں بنٹ گئے۔ چنانچہ عدنانیوں کی دو بڑی شاخیں تھیں: ربیعہ اور مضر۔ پھر ان سے اور چھوٹے چھوٹے قبیلے پیدا ہوئے۔ اسی طرح قحطانیوں کی بھی دو بڑی شاخیں تھیں: کہلان اور حمیر، اور ان سے پھر دوسرے قبیلے پھوٹے اور پروان چڑھے۔ ذیل میں تین شجرہ نسب دیئے جاتے ہیں جن میں قحطانیوں، عدنانیوں، اور قریشیوں کے آبا و اجداد کی تفصیل ہے:

شجرہ نسب قحطانی یا یمنی عرب اقوام

ان کی دو بڑی شاخیں تھیں (۱) شاخ کہلان (۲) شاخ حمیر

نقشہ نمبر ۱ شاخ کہلان

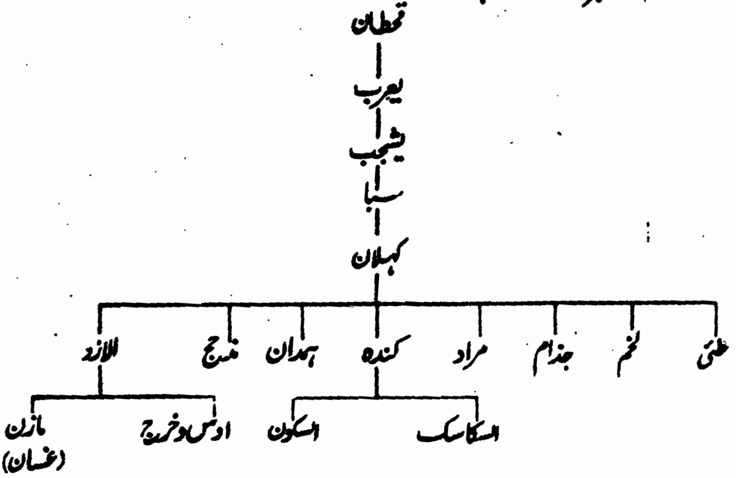

نقشہ نمبر ۲ . شاخ حمیر:

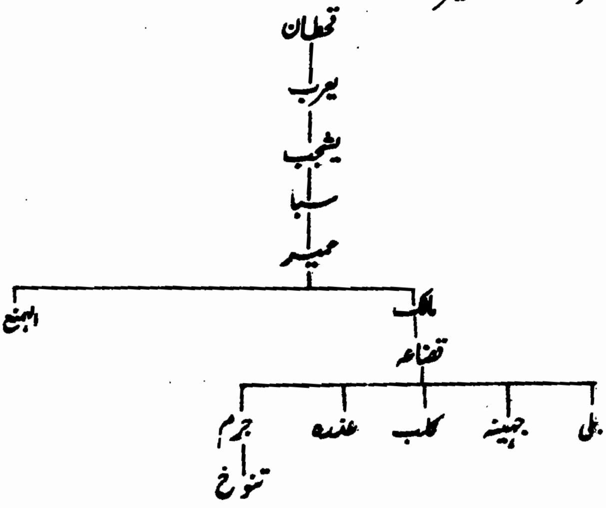

عدنانی یا حجازی عربوں کی بھی دو اہم شاخیں تھیں

(۱) شاخ ربیعہ (۲) شاخ مضر

شجرہ نسب ذیل سے ان کی وضاحت ہوتی ہے:

۱۔ شاخ ربیعہ

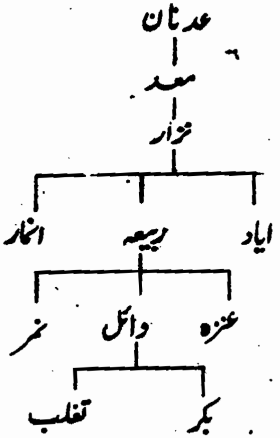

۲۔ شاخ مضر

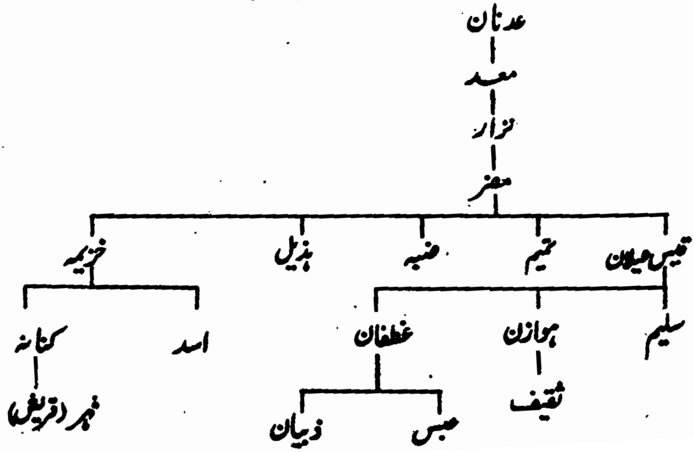

۴۔ شجرۂ نسب قریش :

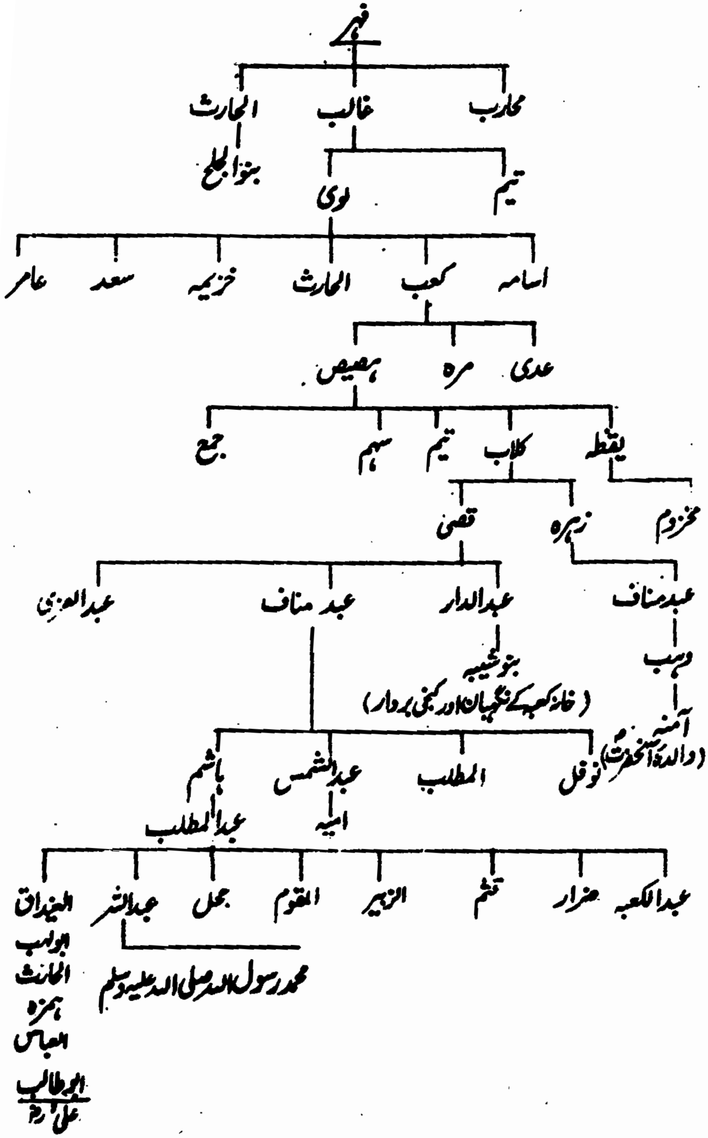

دوسرا باب

اسلام سے پہلے عربوں کی سیاسی حالت

عربوں کی قدیم تاریخ کا ابہام

پرانے زمانے میں اور خاص طور سے زمانہ جاہلیت کے دور اول (۱) میں عربوں کی سیاسی اور ادبی حالت کا پتہ لگانا بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے باوثوق ذرائع سے جمع کی ہوئی کوئی مستند اور صحیح تاریخ نہیں ملتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عرب اقوام عام طور سے اور ان میں شمالی عرب خاص طور سے ان پڑھ تھی، ان کی زندگی خانہ بدوشانہ تھی، جس میں نہ سکون و اطمینان تھا نہ کوئی مضبوط بنیادوں پر قائم معاشی نظام اور نہ اعلیٰ اقدار پر مبنی کوئی سماجی ڈھانچہ زندگی اور اس کا مقصد اونٹوں اور بکریوں کے چرانے، ان کی خاطر چراگاہوں کی تلاش میں صحرانوردی کرنے اور جب قحط یا خشک سالی ہو جائے تو دوسرے قبائل پر حملہ اور غارت گری کر کے جو کچھ ملے اس پر قبضہ کر لینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ظاہر ہے جب زندگی کا یہ نہج ہو تو اس میں لکھ کر محفوظ رکھنے کی اول تو کوئی بات ہوتی نہیں، پھر اگر ہو بھی تو اسے کرتا کون اور کیوں؟ اس لیے جن باتوں کو عرب محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے تھے، جیسے حسب نسب پر فخر کرنا، قبیلہ یا افراد قبیلہ کی بہادری کے قصے یا جنگوں میں اپنی فتحمندی و کامرانی کے واقعات تو انھیں افراد قبیلہ زبانی یاد رکھتے تھے اور اپنے بعد

(۱) زمانہ جاہلیت کا دور اول زمانہ ماقبل تاریخ سے شروع ہو کر پانچویں صدی عیسوی تک چلتا ہے۔
زمانہ جاہلیت کا دوسرا دور پانچویں صدی عیسوی سے ساتویں صدی تک چلتا ہے جب کہ اسلام ظاہر ہوا۔
تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: طبقات ابن سعد ۱/۵۳۔ جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام ۱/۱۴

آنے والی نسل کو بھی زبانی یاد کرا دیتے تھے تاکہ اپنی عظمت و شوکت کا انھیں احساس رہے، اور خاندانی اور قبائلی عصبیت زندہ رہے، اور اگر کسی موقعہ پر شکست ہوئی ہے تو غنیم سے انتقام لیا جا سکے۔

جنوب کے عرب جو یمن میں رہتے، اگرچہ شمالیوں کے مقابلہ میں زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کوئی مدون تاریخ ایسی نہیں چھوڑی جس سے ان کی کوئی صحیح اور مستند تصویر بن سکے۔

البتہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے یمن میں ماہرین نے جو کھدائیاں کرائی ہیں، ان میں بہت سی عبادت گاہیں، ستون، یادگاری مینار، چہار دیواریاں، گنبد اور قلعے برآمد ہوئے ہیں، جن پر کچھ عبارتیں اور کچھ نقوش کھدے ہوئے ہیں، اسی طرح سے مختلف قسم کے نقوش شمالی حجاز میں بھی ثمود اور لحیانیوں کے رہنے کی جگہوں میں اور شام کے حدود میں بھی ملے ہیں۔ ان نقوش اور کندوں کو پڑھ کر علمائے لسانیات نے یہ بات تو تحقیق سے معلوم کر لی ہے کہ جنوبی عربوں (یعنی یمن کے باشندوں) اور شمالی عربوں (یعنی حجاز کے باشندوں) کے زبان میں بڑا فرق تھا۔ لیکن ان اکتشافات اور آثار کے تلنے بانے سے عربوں کی کوئی مسلسل اور مربوط سیاسی یا سماجی تاریخ نہیں بن پاتی۔[1]

زمانہ جاہلیت کے اس دور کے عربوں کے متعلق خود عرب مورخین جیسے ابن ہشام، طبری اور ابن خلدون نے، اور یونانی و یہودی مورخین نے بھی لکھا ہے، ان کے علاوہ ان کا ذکر اختصار کے ساتھ تورات میں بھی ہے۔ لیکن ان سب روایتوں میں بڑا اختلاف ہے۔ نہ تو بادشاہوں کے نام ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور نہ ہی واقعات کے بیان اور ان کی ترتیب میں کوئی مطابقت یا یکسانی پائی جاتی ہے، اسی لیے اس زمانہ کی تاریخ اور حالات و کوائف کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی، سوائے ان واقعات اور تذکروں کے جن کا ذکر قرآن کریم اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ موجودہ زمانے کے علمائے آثار نے قرآن و حدیث میں ان قوموں کے تذکروں سے فائدہ اٹھا کر ان مخصوص جگہوں پر کھدائیاں کرائی ہیں، اور جن کے نتیجہ میں قدیم عربوں کی تاریخ سے متعلق بہت قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔[2]

۱۔ جنوبی اور شمالی عربوں کی تاریخ کے لیے دیکھیے: تاریخ العرب قبل الاسلام۔ جواد علی۔ (۲) جرجی زیدان۔ (۳) تاریخ عرب فلپ حتی۔ (۴) دائرۃ المعارف الاسلامیہ: کلمات: قتبان، معین، سبا، حضرموت، نبط، ثمود، لحیان (۵) الوافی فقہ اللغۃ اور علم اللغۃ مولفہ الدکتور علی عبدالواحد وافی، مطبوعہ لجنۃ البیان العربی، المنیرہ، القاہرہ سنہ ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۲ء

۲۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد عراق و شام میں عربی آثار اور قدیم عرب بستیوں اور قوموں کا پتہ لگانے کے لیے جو کھدائیاں شروع ہوئیں، ان میں مقامات اور قوموں کی جائے سکونت کو متعین کرنے میں قرآن کریم کی آیات سے بڑی مدد ملی۔ اور اصحاب کہف اور رقیم کی بستیوں کا تعین تو محض سورۂ کہف کی آیتوں سے ہو سکا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے رسالہ "العربی" ماہ نومبر ۱۹۶۶ء اور اس کی تلخیص اردو میں رسالہ معارف، جون ۱۹۶۷ء۔ (بقیہ حاشیہ ص ۴۰)

قحطانی عرب

جیساکہ پہلے بیان ہوچکا ہے یمنی عربوں کا سلسلہ نسب قحطان سے ملتا ہے۔ یہ قحطانی لوگ گروہوں کی شکل میں مختلف خطوں میں محلے بنا کر جنھیں "مخلاف" کہتے ہیں رہا کرتے تھے۔ ان بستیوں کے اردگرد ان کے کھیت اور چراگاہیں ہوتی تھیں۔ ان کا ایک سردار ہوتا تھا جسے "قیل" (جمع اقیال) کہتے تھے۔ ہر قیل" اپنے افعال واعمال کا خود ذمہ دار اور اپنی قلمرو میں آزاد وخود مختار ہوتا تھا۔ ان گروہوں میں آپس میں کوئی خاص تعلق نہ تھا، بلکہ ان میں اکثر جنگ وجدال، لوٹ مار ہوتی رہتی تھی جس میں طاقتور کمزور کو ہڑپ کر لیتا۔ یہ لوگ ایک سلسلہ دراز تک اسی طرح رہتے رہے، یہاں تک کہ ان کے یہاں، رفتہ رفتہ تہذیب وتمدن نے جنم لیا۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا جس میں یمن میں مختلف حکومتیں قائم ہوئیں، جن میں دو حکومتیں بہت اہم تھیں، اور جن کے حالات قدرے وضاحت اور صحت کے ساتھ ہم تک پہنچ سکے ہیں؛

سلطنت سبا۔ ۷۵۰-۱۱۵ ق م

سب سے پہلے ملک سبا کا ذکر توراۃ اور اس کے بعد یونانی اور رومانی جغرافیہ کی کتابوں میں قدرے وضاحت سے آیا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے اس کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ ملک سبا اپنے زمانے میں انتہائی ترقی یافتہ اور تہذیب وتمدن کا مثالی نمونہ ملک تھا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس ملک کا نقشہ یوں کھینچا ہے" لقد کان لسبا فی مسکنھم آیۃ، جنتان عن یمین وشمال، کلوا من رزق ربکم واشکروا لہ، بلدۃ طیبۃ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸

* طوفان نوح سے متعلق انکشافات کے لئے دیکھئے مجلۃ "العربی" ماہ جنوری ۱۹۷۷ء اور اس کی اردو میں تلخیص رسالہ معارف، اعظم گڑھ، ماہ مارچ ۱۹۷۷ء۔

جزیرہ نمائے عرب کے شمالی حصہ میں واقع "مدائن صالح" کے بارے میں جہاں قوم عاد وثمود رہا کرتی تھیں، ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر خالد الصوفی کا مضمون "من المدینۃ المنورہ الی مدائن صالح" مطبوعہ "مجلۃ العربی" کویت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء۔ اور عادل عباس کا مضمون "تیماء من الناحیۃ العصریہ" اور محمد سعید کمال کا مضمون "من تاریخ الطائف" مطبوعہ رسالہ "العرب" ذوالحجہ ۸۶ھ (اذار ۱۹۶۷) وادی فرات میں عربوں کی قدیم تاریخ کے اکتشافات کے سلسلہ میں ڈاکٹر ابراہیم ندوی کا مضمون "الحضارۃ العربیہ فی ماری فی عصر سیدنا ابراھیم" مطبوعہ مجلۃ العربی ماہ اکتوبر ۱۹۷۰ اور "فقہ اللغۃ" الدکتور علی عبدالواحد وافی، لجنۃ البیان العربی، القاہرہ سنہ ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۲ء

و رب غفور» (اہل صبا کے لیے ان کے رہنے کی جگہ میں نشانی تھی۔ ان کے داہنیں بائیں دو دو باغ تھے، اپنے رب کے رزق میں سے کھاؤ اور اس کا شکر بجالاؤ کہ ملک بھی بہترین ہے اور رب بھی معاف کرنے والا ہے) ملک سبا اس عروج کو حضرت مسیح سے کئی صدی پہلے ہی پہنچ چکا تھا علمائے آثار کو ان کے جو کتبے ملے ہیں ان سے انھوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ ملک آٹھویں صدی قبل مسیح میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔

اس حکومت کا دارالسلطنت شہر "مارب" تھا، اور اپنے عروج کے زمانے میں انتہائی فارغ البال اور متمول شہر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک زمانے میں ہندوستان، مصر و شام اور حبشہ کے درمیان تجارت اکثر بحری راستوں سے ہوتی تھی، مگر ایک عرصے کے بعد جب سمندری ڈاکوؤں کی وجہ سے سمندری راستہ پرخطر ہوگیا، تو تجارت خشکی کے راستہ سے ہونے لگی۔ چنانچہ ہندوستان اور حبشہ سے سامان تجارت جزیرہ عرب کے بندرگاہوں پر آتا اور وہاں سے سبا کے رہنے والے اسے شام، مصر اور عراق کے بازاروں میں پہنچاتے۔ پھر ساحل جزیرہ سے تجارتی قافلے مارب ہوکر شمال کی طرف مکہ پہنچتے اور وہاں سے مقام "بطرہ" میں، پھر بحر روم کے ساحلی علاقہ غزہ میں۔ چنانچہ تجارتی سامان کے اس دو رویہ آمد و رفت سے یمنیوں کو بہت فائدہ پہنچا اور ان کی حیثیت بہت بڑھ گئی، روپئے پیسے کی ریل پیل ہوگئی، فارغ البالی اور خوشحالی کا ایسا سنہری دور آیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ انھوں نے تالاب کھودے، بند باندھے، عظیم الشان محلات بنائے اور امن و چین کی بنسری بجاتے رہے۔ غالباً یہ صورت حال پہلی صدی عیسوی تک جاری رہی، اس کے بعد سمندری راستہ پھر سے پرامن ہوگیا، اور ہندوستانی تجارت پھر اپنے سمندری راستہ پر آگئی۔ اب ہندوستان کا مال تجارت حضرموت ہوتا ہوا "درہ باب المندب" تک سمندر کے راستے پہنچنے لگا اور ان کی معاشی حالت گرنے لگی۔ اس کے بعد ان کی زمینوں کی سرسبزی و شادابی کا سرچشمہ ان کا مشہور "مارب" کا بند بھی ایک طوفانی سیلاب میں ٹوٹ گیا، جو اپنی روانی میں ترقی و عروج کے سارے مظاہر کے ساتھ یمنی قوم کو بھی بہالے گیا۔

مارب کا بندھ

"سد مارب" یا "مارب کا بندھ" ایک مضبوط اور چوڑا بند تھا، جس کے ذریعہ یمنی لوگ پانی کو روکتے تھے۔ اس کی شکل بالکل آج کل کے "ڈیمس" کی سی تھی۔ اس بندھ کے باندھنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یمن میں ہمیشہ بہنے والے قدرتی دریا یا چشمے نہ تھے۔ البتہ ان کے یہاں

بارش کا خاصا پانی جمع ہو جاتا تھا، لیکن وہ سب رفتہ رفتہ بہ کر صحرا میں چلا جاتا تھا۔ چنانچہ یمنیوں نے اپنے زمانۂ عروج میں سوچا کہ کیوں نہ اس پانی کو روک کر جمع کر لیا جائے، اور حسب ضرورت کھیتی باڑی میں استعمال کیا جائے۔ انھوں نے پہاڑوں کی گھاٹیوں میں مختلف جگہ بند باندھ کر پہلے پانی کے رخ کو ایک راستہ پر کیا، اس کے بعد سب سے اخیر میں ایک بہت چوڑا بند باندھا، یہ بڑا بند "مارب کا بند" تھا۔ یہ بند مارب شہر کے جنوب مغرب میں باندھا گیا تھا۔ اس علاقہ میں بڑے بڑے پہاڑ اور گہری وادیاں بکثرت تھیں۔ جب پانی برستا اور سیلاب آتا تو مختلف وادیوں کا پانی بہ کر ایک بڑی وادی میں جسے "اذنہ" کہتے تھے، جمع ہو جاتا تھا۔ جب یہ وادی بھی بھر جاتی تو پھر پانی کا رخ ایک درّہ کی طرف ہو جاتا جو مارب سے تین گھنٹوں کی مسافت پر واقع تھا، اور اس درّہ کے ذریعہ پانی صحرا میں پھیل جاتا تھا۔ یمنیوں نے اس درہ پر ایک مشہور بند باندھ کر پانی کو اپنے قبضہ و تصرف میں کیا تھا۔ اس بند کے دونوں سروں پر انھوں نے دریچے اور کھڑکیاں بنا رکھی تھیں، جنھیں کھول کر حسب ضرورت پانی لے لیتے اور ان کو بند کر دیتے۔ بند کے دونوں کناروں کے پیچھے ان کے باغات اور کھیتیاں تھیں، جو اس پانی سے سیراب ہو کر لہلہایا کرتی تھیں۔ اسی نسبت سے قرآن کریم نے کہا ہے کہ "ان کے دائیں بائیں دو دو باغ تھے"۔ ایک عرصۂ دراز تک اہل یمن، اس بند سے فائدہ اٹھاتے رہے، مگر اس کی دیکھ بھال اور مرمت کا کسی کو خیال نہ آیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دفعتاً زبردست اور طوفانی سیلاب آیا کہ یہ بند ٹوٹ گیا۔ بند کا ٹوٹنا تھا کہ بستیاں بہ گئیں۔ شہر تباہ ہو گئے، مکانات منہدم ہو گئے۔ دوسری طرف بند کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے پانی بھی جمع نہیں ہو پاتا تھا جس سے یمنی اپنی کھیتیاں سینچ سکتے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں مستقل طور سے قحط پڑنے لگا۔ خشک سالی اور قحط سے جب لوگ مرنے لگے تو مجبور ہو کر انھوں نے شمال کی طرف رخ کیا اور یہیں سے جنوبی عربوں کی شمال یعنی حجاز کی طرف ہجرت کا آغاز ہوتا ہے، اور یہ زمانہ ہے تیسری صدی عیسوی کا۔ ان ہجرت کرنے والے قبائل میں "ازد" کا قبیلہ بھی تھا جس کی نسل سے مدینہ کے "اوس و خزرج" کے قبائل تھے۔

کہتے ہیں کہ مارب کے بند کے بعض حصے اب بھی موجود ہیں۔ یمنی اس حادثہ کے بعد ایسے تتر بتر ہوئے کہ عربی زبان میں منتشر ہونے کے لیے ضرب المثل بن گئے، چنانچہ کہتے ہیں کہ "تفرقوا ایدی سبا" یعنی ایسے بکھرے جیسے سبا کے لوگ![1]

علمائے آثار قدیمہ کو یمن اور نواح میں جو کتبے اور نقوش ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا

(1)۔ سد مارب کے متعلق ملاحظہ کیجئے:۔ اسعد افغر، حضارۃ العرب، صفحہ ۳۶ مطبوعہ مطبع ہندیہ الموسکی، مصر۔ اور مصور رپورتاژ "سد مارب" از سلیم زبان۔ مجلۃ العربی، کویت، ماہ مارچ ۱۹۷۰ء

ہے کہ ان کے بادشاہوں کے نام اور ان کی زبان، اس کے لکھنے کا طریقہ اور اس کے اصول و قواعد ان عربی ناموں اور عربی زبان سے بالکل مختلف ہیں جسے ہم آج عربی زبان سمجھتے ہیں۔

سلطنت حمیر

قبیلہ حمیر بھی سبا کی ایک شاخ تھا۔ حمیریوں نے بھی اپنی ایک الگ حکومت قائم کی تھی، جس کا دارالسلطنت "ظفار" تھا۔ غالب گمان یہ ہے کہ ان کی سلطنت، دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر چھٹی صدی عیسوی کے اوائل تک قائم رہی۔ اس پورے عرصہ سلطنت حمیر کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، کیونکہ ان کے درمیان، کبھی ایرانیوں سے اور کبھی حبشیوں سے ہمیشہ جنگیں ہوتی رہتی تھیں جن میں فتح عام طور پر حمیر ہی کو ہوتی رہی۔ تاریخ سے ان کے بادشاہوں کی تعداد اور ان کے دورِ حکومت کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔

مورخین عام طور سے اس سلطنت کے بادشاہوں کو دو طبقوں میں بانٹتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق پہلے طبقہ کے بادشاہوں کی حکومت تیسری صدی عیسوی کے آخر تک جاری رہی۔ اور دوسرے طبقہ کے بادشاہوں نے، اپنے حدود سلطنت "شحر اور حضرموت" تک بڑھالی تھیں۔ اس طبقہ کے بادشاہوں کو "تبع، جمع، تبابعہ" کہتے ہیں۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ "ذونواس" تھا۔

کہتے ہیں کہ یہ آخری تبع حکمراں ذونواس، سخت قسم کا یہودی تھا۔ اس وقت تک عیسائی مذہب جزیرہ عرب میں خاصا رواج پاگیا تھا اور یمن کے ملک نجران میں عیسائی مراکز قائم ہوچکے تھے، ذونواس کو عیسائیت کی یہ بڑھتی ہوئی مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی، چنانچہ اس نے اپنی رعایا میں سے ان لوگوں کو سخت دردناک سزائیں دیں جنہوں نے مذہب عیسوی قبول کرلیا تھا۔ اور عام منادی کرادی تھی کہ سب لوگ یہودی مذہب قبول کرلیں، مگر اس کی رعایا نے اس کی بات ماننے سے انکار کردیا چنانچہ اس نے منکرین کو زندہ جلادیا۔ ملک حبش نے جو بہت پہلے مذہب عیسوی قبول کرچکا تھا، یمن کے ان مظلوم عیسائیوں کی مدد کے لیے یمن پر چڑھائی کردی۔ جنگ میں ذونواس اور اس کی قوم کو شکست فاش ہوئی اور ۵۲۵ء کے لگ بھگ یمن پر حبشہ کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ اسلام کے آنے سے چند سال پہلے تک عرب کے لوگ، یمن کی سب حکومتوں اور یمنیوں کی جملہ زبانوں کو حمیری ہی کہتے تھے، کیونکہ یمنیوں کا یہ قبیلہ تمام قبایل عرب میں زیادہ طاقتور اور رعب و دبدبہ میں مشہور تھا۔

عربوں میں یمنیوں سے متعلق بہادری شجاعت اور اعلیٰ کارناموں کی بہت سی جھوٹی سچی کہانیاں مشہور ہیں، اگرچہ تاریخی اعتبار سے ان میں سے بہت سی کی کوئی حقیقت نہیں ہے، پھر بھی عربی شعروشاعری، قصے کہانیوں، اور ضرب الامثال پر ان کا بہت اثر ہے۔

عدنانی عرب

جنوب کے قحطانی یمنیوں کے مدمقابل شمال میں عدنانی تھے۔ عدنانی حضرت اسمعیل کی اولاد میں سے ہیں، اور حجاز، تہامہ اور نجد کے علاقوں میں رہتے تھے۔ ان میں کچھ عراق اور جزیرہ عرب میں بھی رہتے تھے۔

عدنانیوں اور قحطانیوں میں بہت سی باتوں میں بڑا فرق ہے۔ ان میں سے چند باتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ عدنانی عربوں کے اکثر قبایل خانہ بدوش تھے۔ قریش مکہ کو چھوڑ کر بہت کم قبیلے ایسے تھے جو ایک جگہ مستقل طور سے جم کر رہتے ہوں۔ ان کے برخلاف قحطانی قبایل شہروں میں گھر بنا کر رہتے اور ایک ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کے مالک تھے۔

۲۔ عربوں کے ان دونوں قسموں میں زبان کا بہت بڑا اختلاف تھا۔ چنانچہ قحطانیوں کی زبان اور عدنانیوں کی زبان میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ البتہ اسلام سے کچھ زمانہ پیشتر عدنانیوں میں سے قریش کی زبان کو فوقیت حاصل ہونا شروع ہوئی جو اسلام کے آنے کے بعد مکمل ہوگئی۔

۳۔ اسی طرح عبادت کے طریقوں اور معبودوں میں بھی ان دونوں قبایل میں بہت اختلاف تھا۔ چنانچہ اسلام سے پہلے یمنی اپنے جن خاص دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے، عدنانی انہیں نہیں مانتے تھے۔

جیسا کہ سابقہ شجرہ نسب سے معلوم ہوا ہوگا، عدنانیوں کی بھی بہت سی شاخیں ہوگئیں، ان میں سب سے اہم اور ممتاز دو شاخیں تھیں: ربیعہ اور مضر۔ اور اسلام سے دو سو سال پہلے تک یہی دونوں قبیلے سب سے زیادہ طاقتور اور بااثر قبیلے شمار کئے جاتے تھے۔

باوجود اس کے کہ یہ دونوں قبیلے ایک ہی آباد اجداد کی اولاد تھی، پھر بھی ان میں سخت دشمنی چلی آرہی تھی جس کی وجہ سے ان دونوں میں سخت خونریز جنگیں ہوئیں، جن میں دونوں طرف کے سینکڑوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ یہ لڑائیاں جب چھڑ جاتی تھیں تو رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں بلکہ برسہا برس تک ان کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ ان لڑائیوں میں سے چند مشہور درج ذیل ہیں جو بہت ہی معمولی باتوں کی وجہ سے چھڑ گئیں اور ایک مدت دراز تک خون کی ہولی کھلواتی رہیں:

جنگ بسوس

یہ خونریز لڑائی قبیلہ ربیعہ کی شاخ بکر و تغلب کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کا سلسلہ اتنا کھنچا کہ چالیس سال تک تلواریں چلتی رہیں۔ کہتے ہیں کہ اس جنگ کا سبب سراب نامی ایک اونٹنی تھی، جس کی مالکن "بسوس" نام کی ایک عورت تھی۔ ایک دفعہ یہ اونٹنی کلیب بن ربیعہ کی چراگاہ میں، جو بنو تغلب کا سردار تھا، چلی گئی۔ یہ چراگاہ ایک مقام جس کا نام "عالیہ" تھا، واقع تھی۔ کلیب کا رعب و دبدبہ اتنا تھا کہ بغیر اس کی اجازت کے کوئی جانور تو کیا کوئی آدمی بھی اس میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسی طرح جس گھاٹ پر اس کے جانور پانی پیتے تھے، وہاں پر دوسرے اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتے تھے، جہاں اس کی آگ جلتی تھی، وہاں کوئی دوسرا اپنی آگ نہیں جلا سکتا تھا۔ کلیب نے قبیلہ شیبان میں جو بکر کی ایک شاخ تھی، شادی کر رکھی تھی۔ بسوس نامی یہ عورت اسی خاندان کے ایک شخص جساس بن مرۃ الشیبانی کی خالہ تھی۔ چنانچہ جب کلیب نے اس شیبانی عورت کی اونٹنی کو اپنی چراگاہ میں دیکھا تو تاک کر اس کی تھن میں تیر مارا۔ یہ ماجرا جساس دیکھ رہا تھا، خالہ اور اس کی اونٹنی کی یہ بے عزتی اس سے نہیں دیکھی گئی، وہ کلیب پر جھپٹا اور اسے قتل کر ڈالا۔ اور اس کے بعد بکر و تغلب میں اس منحوس لڑائی کا سلسلہ چھڑ گیا، جو عربی ادب میں نحوست کی ضرب المثل بن گئی۔

حرب داحس وغبرا

قبیلہ مضر کی شاخوں میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان میں سب سے مشہور "داحس اور غبرا" کی جنگ ہے۔ یہ جنگ مضر کی دو شاخوں، قبیلہ ذبیان اور عبس کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ قبیلہ عبس کے ایک شخص "قیس بن زہیر العبسی" نے "حذیفہ بن بدر الفزاری" کے ساتھ، جو ذبیان کا آدمی تھا، گھوڑ دوڑ کے مقابلہ کی شرط باندھی۔ چنانچہ فزاری نے اپنا گھوڑا "الغبراء" دوڑایا، اور عبسی نے اپنا گھوڑا "داحس" چھوڑا۔ داحس آگے نکل گیا۔ لیکن نشان تک پہنچنے سے پہلے ایک چیز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اتنے میں فزاری کا گھوڑا "الغبراء" پالا مار گیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ بنو فزارہ نے راستے میں کوئی اڑنگا رکھ دیا تھا، جس سے عبسی کا گھوڑا ٹکرا کر گر گیا تھا۔ اس پر ہر ایک قبیلہ اپنے گھوڑے کے جیتنے کا دعوی کرنے لگا، ہوتے ہوتے بات بڑھ گئی، اور ایسی خونریز جنگ کی صورت اختیار کر گئی جو "حرب بسوس" کی طرح چالیس سال تک چلتی رہی۔

اسی طرح مضر کے دوسرے قبایل، مثلاً قریش اور کنانہ، میں بھی مستقل جنگوں کا سلسلہ چلتا رہا ہے۔ ان جنگوں کو "حرب فجار" کہتے ہیں[1]۔ غرضکہ عدنانیوں کے مختلف قبایل میں آپس میں اکثر جنگیں رہا کرتی تھیں جن کی وجہ سے نہ صرف جان ومال کا نقصان ہوتا تھا بلکہ یہ جنگیں ان قبایل کے لیے ایک مستقل عذاب بنی ہوئی تھیں، جنھوں نے ان کا چین وسکون اور زندگی کا لطف کھودیا تھا مگر ان جنگوں کا ایک دوسرا اچھا پہلو یہ تھا کہ ان کی وجہ سے ان عربوں میں بہادری، جوش وخروش، وفا اور خودداری کے جوہر پیدا ہوگئے تھے، جن کا عکس ہمیں ان کی شاعری میں اور خاص طور سے حماسہ کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ جس نے آگے چل کر شاعری کی ایک مستقل صنف کی شکل اختیار کرلی۔ مقتولوں پر نوحہ کرنے اور رنج وغم کے اظہار اور بین کرنے سے شاعری میں مرثیہ گوئی کا فن پیدا ہوا، جس میں شعرا کو چھوڑ کر بعض مرثیہ گو شاعرات نے کمال پیدا کیا ہے جیسے تماضر خنساء، کہ مرثیہ گوئی میں انھوں نے مرد شاعروں سے بھی زیادہ نام پیدا کیا۔ ان فنون کے علاوہ ان رزم آرائیوں کی وجہ سے اور کئی فنون پیدا ہوئے جن کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔

عدنانیوں کا سب سے بڑا مرکز شہر مکہ تھا، جس میں ان کی شاخ قریش اور کنانہ رہا کرتی تھی ان قبایل کی دوسروں کے مقابلہ میں بڑی عزت اور وقعت تھی۔ کیونکہ خانہ کعبہ کی تولیت کا شرف انھیں کو حاصل تھا۔ اخیر زمانہ میں یہ عزت صرف قریش کے لیے مخصوص ہوگئی۔ اس زمانے میں قریش کے سردار قصی بن کلاب تھے۔ یہ بڑے ذہین بہادر، پروقار اور سخی آدمی تھے، اس لیے مکہ والوں نے نہ صرف جنگ کا قائد وسپہ سالار انھیں کو بنایا تھا بلکہ خانہ کعبہ کی حفاظت و نگرانی کا کام اور اہم منصب بھی انھیں کے حوالہ کردیا تھا۔ یہ لوگ مشکل مسائل اور آڑے وقتوں میں ان سے مشورہ لیتے اور ان کی بات پر عمل کرتے۔ خانہ کعبہ کے سامنے ان کی انجمن "دار الندوہ" میں امتیازی حیثیت انھیں کو حاصل تھی۔ قصی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے یہ رسم نکالی کہ باہر سے آئے ہوئے حاجیوں کو کھانا کھلاتے۔ ان کے لیے پینے کے پانی کا انتظام کرتے، کیونکہ یہ لوگ اللہ کے مہمان تھے۔ اس کا خرچ چلانے کے لیے انھوں نے قریش پر ایک ٹیکس عائد کیا تھا جسے سب لوگ بخوشی ادا کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھئے سیرت کی کتابیں اور "أیام العرب فی الجاهلیة" محمد ابو الفضل ابراہیم وعلی محمد البجادی۔ مطبوعہ مصر: (دار أحیاء الکتب العربیة)

قصی کی سرداری اور اہمیت کا یہ وقت پانچویں صدی عیسوی کے اوائل کا زمانہ ہے۔ ان کی وفات کے بعد قریش کی سیادت اور خانہ کعبہ کی نگرانی و تولیت کے فرائض ان کی بیٹے عبد مناف، ہاشم اور اخیر میں عبد المطلب کو سونپی گئی۔ عبد المطلب، جیسا کہ سب جانتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا تھے۔ انھیں عبد المطلب کی سرداری کے زمانہ میں حبشہ کے بادشاہ ابرہہ نے خانہ کعبہ کو گرانے کے لیے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ لیکن اس کی فوج میں ایک سخت وبا پھیلی اور جیسا کہ قرآن شریف نے کہا ہے، اللہ نے ایک قسم کی چڑیوں کو ان پر مسلط کر دیا جنھوں نے کنکریاں مار کر انھیں ایسا سراسیمہ کیا کہ جو بچ رہے وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سال کو عربوں نے "ہاتھی کے سال" کے نام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ اس چڑھائی میں اہم رول ابرہہ کے ہاتھی "محمود" کو ادا کرنا تھا مگر بقول مورخین وہ کعبہ کے سامنے ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا بلکہ بیٹھ جاتا تھا۔ اس واقعہ کے بارے میں ایک سورت "الفیل" (ہاتھی) کے نام سے قرآن میں نازل ہوئی ہے۔

عبد المطلب کے انتقال کے بعد، قریش کے قبایل میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے اور ہر ایک نے خانہ کعبہ کے مختلف کاموں میں شرکت کرنی چاہی، چنانچہ بنو ہاشم کو حاجیوں کے پیاؤ کا انتظام سونپا گیا، بنی امیہ کو فوجوں کی سپہ سالاری دی گئی، اور بنی نوفل کے حصہ میں بچھڑے ہوئے حاجیوں کی خبر گیری، رہنمائی اور مالی امداد کا کام سپرد ہوا۔ اور اس طرح خانہ کعبہ کے مختلف کاموں میں شرکت کی عزت سے قریش کے سارے قبایل مشرف ہوتے۔

عربوں کا غیر قوموں سے تعلق اور اس کے ذرائع

باوجود اس کے کہ عرب بڑی حد تک عزلت پسند قوم تھی، مگر حالات کے تقاضوں اور ضروریات کے ماتحت انھوں نے دوسری اقوام سے اپنا رشتہ جوڑا، اور ان تعلقات اور میل جول سے عربی ادب کو بہت فائدہ ہوا۔ نئے نئے الفاظ، نئی نئی ترکیبیں، اور نئے نئے اسالیب بیان آئے، جنھوں نے عربی ادب کو بہت مالا مال، وسیع اور پر مغز بنا دیا۔

عربوں کا تعلق اپنے پڑوسی ملکوں سے اور قوموں سے مختلف طریقوں سے ہوا، ان میں جو بہت اہم اور نتیجہ خیز تھے:

(۱) تجارت

تجارت میں یمن کے باشندے ایک زمانے میں مشہور تھے، ان کے بعد اس میدان میں قریش مکہ بھی داخل ہو گئے۔ چنانچہ قدیم زمانے سے یمن حضر موت، ظفار، ہندوستان، افریقہ اور

بحر ہند سے سامان تجارت لاکر، مصر و شام کی منڈیوں میں بیچا کرتے تھے۔ اور اس طرح ان کا ربط و ضبط ان ملکوں اور وہاں کے باشندوں سے ہوا۔

چھٹی صدی عیسوی میں، جب ان کے اندر کمزوری آ گئی، اور حالات ان کے موافق نہ رہے جن کا ذکر قدرے تفصیل سے پہلے ہو چکا ہے، تو حجاز کے عرب اور خاص طور قریشیوں نے ان کی جگہ لے لی چنانچہ یہ لوگ اب یمنیوں اور حبشیوں سے سامان تجارت خرید کر مصر و شام کے بازاروں میں کھپاتے تھے۔ قریشی سال میں دو مرتبہ تجارتی سفر پر جاتے تھے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ذکر ہے، ایک سفر جاڑے میں اور دوسرا گرمی میں کرتے تھے۔ جاڑوں میں ان کے تجارتی قافلے یمن جاتے، اور گرمیوں میں شام۔ خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے ان کی جو عزت تھی اور عرب قبایل ان کی جو قدر و منزلت کرتے اس کی وجہ سے ان کے یہ دونوں سفر بغیر کسی خطرے اور لوٹ مار کے ڈر کے، بڑے اطمینان اور پر امن طریقے سے انجام پاتے تھے جس کی وجہ سے ایک طرف قریش کی مالی حالت بہت اچھی ہو گئی، تو دوسری طرف عربی زبان کو مالا مال ہونے کا موقع ملا۔ کیونکہ یہ قریشی تاجر جب دوسرے ممالک میں جاتے تو وہاں کی زندگی، رہن سہن اور گھر بار دیکھتے، اس سے ان کے ذہن میں وسعت اور فکر میں جلا پیدا ہوتی۔ پھر ان ملکوں کے باشندوں سے لین دین کرنے میں، ان کے زبان کے بہت سے الفاظ غیر شعوری طور پر ان عربوں کی زبان پر چڑھ جاتے، جنھیں یہ اپنے ملک لاتے اور بول چال میں استعمال بھی کرتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فارسی، رومی، مصری اور حبشی الفاظ ان کی اپنی زبان میں داخل ہو گئے، جنھیں ان عربوں نے اپنی زبان کے قواعد و ضوابط کے مطابق ڈھال کر اپنی زبان کا حصہ بنا لیا۔

۲۔ سرحدی ریاستیں

عربوں کا دوسری قوموں سے ملنے کا ذریعہ وہ عربی ریاستیں بھی بنیں، جنھیں انھوں نے سرحدوں پر قائم کیا تھیں۔ ان ریاستوں میں دو کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ان میں سے ایک "حیرہ" کی ریاست تھی اور دوسری "غسانیوں" کی۔

ان ریاستوں کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ ایرانی اور رومی سلطنتوں کی سرحدیں عربوں کی سرحدوں سے ملتی تھیں، یہ عرب لوگ موقع پا کر ان پر مستقل حملے کرتے رہتے اور اپنی لوٹ مار سے ان کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ اور چونکہ یہ لوگ صحرا میں رہتے تھے، لوٹ مار کر کے اپنے صحرا میں غائب ہو جاتے اور یہ حکومتیں ان کا کچھ نہ بگاڑ پاتیں۔ اس لیے عربوں کی ان

ناگہانی حملوں سے بچنے کے لیے ایرانیوں نے اپنی سرحدوں سے متصل "حیرہ" کی عربی ریاست قائم کی، اور رومیوں نے اپنے سرحدوں کے قریب "غسانیوں" کی، تاکہ عربوں سے یہ ریاستیں نبٹ لیا کریں اور انھیں اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہ پڑے۔

(الف) حیرہ کی ریاست

اس ریاست کو ایرانیوں نے قائم کیا تھا، یہ کوفہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع تھی اس کی ریاست قبیلہ لخم (یمنی۔ کہلانی) کو سونپی گئی تھی۔ ایران کا بادشاہ والی ریاست مقرر کرتا تھا، جو ایک معمولی رقم بطور خراج ایران کو دیتا تھا۔ یہ والی ریاست کے اکثر معاملات میں آزاد ہوتا تھا۔ حیرہ کا سب سے پہلا والی "عمرو بن عدی" ہوا ہے، جسے ساپور اول بن اردشیر نے ۲۴۰ء میں مقرر کیا تھا۔ حیرہ کی یہ عربی ریاست ۶۳۳ء تک قائم رہی، اس کے بعد خالد بن الولید مشہور اسلامی سپہ سالار نے اسے فتح کر کے اسلامی سلطنت کا حصہ بنا دیا۔

حیرہ کے یہ عرب حکام، عربوں اور ایرانیوں میں واسطہ کا کام بھی کرتے تھے، اور ان کے اس میل جول سے عربی ادب کو بڑا فایدہ پہنچا۔ کیونکہ اس واسطہ سے عربی زبان میں ایرانی تہذیب و تمدن کے نمونے آئے، تجارتی تعلق سے فارسی کے الفاظ اور تعبیریں آئیں۔ یہاں کے والیان ریاست بڑے علم پرور اور ادب نواز تھے۔ ان میں خاص طور سے قابل ذکر ابو قابوس النعمان الخامس تھا، جس کے دربار میں معلقات کا مشہور شاعر نابغہ ذبیانی حاضر ہوا تھا اور اس کی شان میں اپنا مدحیہ قصیدہ پڑھا تھا۔

والیان حیرہ نے اس ریاست میں "خورنق" اور "سدیر" (۱) نام کے دو بہت عظیم الشان قلعے بنائے تھے۔ عربی ادب میں ان دونوں قلعوں کا ذکر مضبوطی، شان و شکوہ اور عظمت کے نشان کے طور پر بکثرت آتا ہے، کیونکہ ان عربوں نے اتنے عظیم الشان قلعے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسی خورنق

۱۔ ایک جاہلی شاعر کا قول ہے:

وانا انتشیت فاننی ۔۔۔ رب الخورنق والسدیر

فاذا صحوت فاننی ۔۔۔ رب الشویھۃ والبعیر

یعنی جب ترنگ میں ہوتا ہوں تو اپنے آپ کو خورنق اور سدیر قلعوں کا مالک سمجھنے لگتا ہوں۔ لیکن جب نشہ اتر جاتا ہے تو پھر وہی اونٹ اور بکریوں کا مالک ہی جانتا ہوں۔

کے بانی "سنار" کا ذکر بھی اولوالعزمی اور شان و شوکت میں ضرب المثل کے طور پر بہت زیادہ آتا ہے۔ عربوں کے بعض گروہ اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ حیرہ کے لوگوں نے اسلام سے پہلے قریشیوں کو زندقہ سکھایا، اور اسلام کے بعد انہیں لوگوں نے قریشیوں کو لکھنا پڑھنا بھی۔

(ب) غسانی ریاست

رومیوں نے شام کی اپنی سرحدوں پر غسانی ریاست قائم کی تھی۔ اس ریاست کا پایۂ تخت دمشق کے قریب ایک بستی "جلق" تھا۔ مشہور صحابی شاعر حضرت حسان بن ثابت نے شاہان غسان اور جلق کی تعریف بڑے والہانہ انداز سے کی ہے۔[1] اس ریاست کے والیوں میں سب سے زیادہ مشہور "الحارث بن جبلہ" گزرا ہے، اس کو شہنشاہ کوستنیان نے ۵۲۹ء میں والی مقرر کیا تھا۔ حارث مذہباً عیسائی تھا۔ یہ وہ حارث ہے جو امرؤ القیس کو لے کر ۵۴۲ء میں قسطنطنیہ گیا تھا اور قیصر سے سفارش کی تھی کہ باپ کے قتل کے بعد امرؤ القیس پر جو مصیبت پڑی ہے اس میں اس کی مدد کرے۔

غسانی والیان ریاست میں آخری والی جبلہ بن الایہم تھا۔ جب مسلمانوں نے شام کو فتح کیا تو یہ اسلام لے آیا، لیکن بعد میں حضرت عمرؓ نے ایک معمولی مسلمان، بنو فزارہ کے ایک فرد کے ساتھ زیادتی کرنے پر جبلہ کے خلاف فیصلہ دیا تو یہ خفا ہو کر بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور پھر عیسائی ہو گیا، اور اسی حال میں ۲۰ھ میں مر گیا۔

غسانی والیان ریاست بھی، والیان حیرہ کی طرح، عربوں اور رومیوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے۔ ان کے ذریعہ عربوں میں رومی تہذیب و تمدن کے اثرات آئے، ان کے الفاظ، ترکیبیں اور تعبیریں آئیں۔ یہ غسانی والیان ریاست بھی بڑے مہمان نواز، علم دوست اور شاعر و ادیب نواز تھے۔ ان کے دربار میں اس زمانے کے جلیل القدر اور نامور شعراء آتے تھے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے۔ ان میں قابل ذکر معلقات کے دو شاعر "نابغہ الذبیانی اور الاعشیٰ" ہیں۔

۱۔ غسانی بادشاہوں اور جلق کی تعریف میں حسان کا ایک بہت مشہور مدحیہ قصیدہ ہے جس میں کہتے ہیں:

للّٰہ درّ عصابۃ نادمتہم　　　یوماً بجلّق فی الزمان الاوّل

"بریص" شام کا وہ مرغزار جہاں غسانی بادشاہ رہتے اور بردی شام کے بڑے دریا کا ذکر ... کرتا ہے۔

یسقون من ورد البریص علیہم　　　بردی یصفق بالرحیق السلسل

اللہ اس گروہ کو سلامت رکھے جن کے ساتھ میں نے جلق میں ابتدائی زمانے کے دن گزارے۔ جو لوگ بریص میں ان کے پاس آتے ہیں تو انہیں سلسبیل کے بردی کا خالص شراب ملا پانی پلاتے ہیں۔

ان کے علاوہ جاہلی شعراء میں علقمۃ الفحل اور مخضرمیں حسان بن ثابت بھی ان کے دربار سے متعلق رہے تھے اور ان کی شان میں مدحیہ قصائد لکھ کرلے جاتے اور انعام واکرام سے نوازے جاتے۔

عربوں کی اجتماعی حالت

سماجی اور معاشرتی لحاظ سے عربوں کو دو گروہوں میں بانٹا جاسکتا ہے :

۱۔ بادیہ (دیہات) میں رہنے والے عرب

۲۔ شہروں میں رہنے والے عرب

۱۔ بادیہ میں رہنے والے عرب (بدو)

ملک عرب جیساکہ بیان ہو چکا ہے، ایک جزیرہ نما ہے، جہاں کی زمین خشک، بنجر اور بے آب وگیاہ ہے۔ پانی کی کمی اور نہروں اور دریاؤں کے نہ ہونے کی وجہ سے، وہاں نہ کھیتی باڑی ہو سکتی ہے اور نہ ہی مستقل بستیاں اور شہر بس سکتے ہیں۔ اسی لیے عرب کے اس حصہ کے باشندے صحرا میں اپنی چھوٹی چھوٹی بستیاں بسا کر، دیہاتی زندگی گزارتے تھے۔ یہ لوگ خانہ بدوش تھے، اور کہیں جم کر نہیں رہتے تھے، بلکہ چراگاہوں اور سبزہ زاروں کی تلاش میں ادھر ادھر منتقل ہوتے رہتے تھے اور خیموں میں زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگی کا دارو مدار ان کے جانوروں پر تھا جو صرف اونٹ، بکری اور گھوڑے تک محدود تھے۔ نجد کے اونچے علاقوں میں جب سردیوں میں بارش ہوتی، اور تھوڑی بہت گھاس پھوس اگ آتی تو یہ لوگ اپنے مویشیوں کو لے کر ادھر چلے جاتے، اور جب یہاں کی گھاس اور ہریالی ختم ہو جاتی، اور گرمیوں کی لوئیں چلنے لگتیں، تو اپنے خیمے اپنے مویشیوں پر لاد، اپنے دیہاتوں میں واپس آجاتے۔ ان کے یہ خیمے ان کے جانوروں کی کھالوں کے ہوتے تھے، جن کو نصب کرنے کے بعد دو حصے کر دیئے جاتے تھے، ایک حصہ مردانہ، اور ایک حصہ زنانہ۔ عام طور سے زنانہ حصہ پیچھے ہوتا تھا۔

عربی شاعری میں ان خیموں کو اور جن جگہوں میں نصب ہوتے تھے، اور جہاں جہاں قبیلہ رہتا تھا، بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ عربی کی غزلیہ شاعری میں، ان خیموں کا اور ان میں رہنے والی (خدر) نوجوان پردہ نشیں حسیناؤں اور جن بستیوں میں یہ نصب ہوتے ان کا ذکر عام طور سے بڑے دلکش انداز سے آتا ہے۔ اسی طرح عہد جاہلیت کے شعراء ان خیموں کے "اطلال" کو دیکھ کر، یہاں زہرہ جبینوں سے جو عہد و پیمان ہوئے تھے، انھیں یاد کر کے بے قابو ہو پڑتے تھے، اور خود بھی روتے تھے اور اپنے دوست واحباب کو بھی دعوت گریہ دیتے تھے۔ "اطلال" سے مراد وہ اونچی

جگہیں تھیں جہاں خیمے نصب ہوتے تھے اور وہ نشانات تھے جو قبیلہ کے کسی جگہ سے کوچ کر جانے کے بعد وہاں رہ جاتے تھے۔ جیسے چولہوں کے پتھر جو دھویں سے کالے ہو چکے ہوتے تھے یا ان چولہوں کی راکھ، یا خیموں کے چاروں طرف کی زمین پر بنی ہوئی منڈیریں جس سے پانی یا رینگنے والے جانور اندر نہ آسکیں، یا جانوروں کے گوبر اور اونٹوں اور بکریوں کی مینگنیاں یا بچوں کے ریت کے گھروندے۔ شاعر کو یہ سب نشانات دیکھ کر اپنی محبوبہ اور اس کے ساتھ اس جگہ جو حسین لمحات گذرے ہوتے، یاد آجاتے اور وہ بیخود ہو کر رو پڑتا۔ اس بدعت کو سب سے پہلے جاہلی شاعر" امرؤالقیس "نے ایجاد کیا۔ (۱)

ان خانہ بدوش عربوں کی غذا اپنے جانوروں کا دودھ اور کھجور ہوتی تھی۔ بکریوں اور اونٹوں کا گوشت بھی کھاتے تھے، مگر ان جانوروں کی مہنگائی اور افادیت کے پیش نظر ان کا گوشت سب کو میسر نہ تھا۔

اونٹ ان کی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اونٹ کا گوشت کھاتے، اس کا دودھ پیتے، اور اس کے اون اور کھال سے اپنے کپڑے بناتے۔ اپنے خیمے تیار کرتے، اور اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر سفر کرتے، اپنا سامان ڈھوتے اور عام سواری کے طور پر استعمال کرتے۔ انھیں اونٹوں کے بدلے میں لین دین کرتے، ان کے بدلے میں اپنے قیدیوں کو چھڑاتے، مقتولین کے فدیہ میں دیتے، اور انھیں کو مہر میں دے کر شادیاں کرتے۔ غرضکہ اونٹ ان کی زندگی کا وہ گرانمایہ سرمایہ تھا، جس کے بغیر ان کی زندگی مشکل ہو جاتی اسی لیے عرب ان کی دیکھ ریکھ اور افزائش نسل کا خاص خیال رکھتے تھے، اور اس اہتمام کا اثر زبان پر بھی پڑا۔ چنانچہ عربوں نے اپنی زبان میں اونٹ کے ہر عضو کے لیے مناسب نام رکھے اور ان سے تشبیہات اور استعارے وضع کئے۔ ان کے سہارے بہت سی ضرب المثلیں اور کہاوتیں بنائیں، اور ان کی تعریف و توصیف میں لمبے چوڑے قصیدے لکھے۔ ان کو تیز چلانے کے لیے گانے کی ایک اچھوتی قسم "حدی" ایجاد کی، جسے بڑی لے سے گاتے اور اونٹ اسے سن کر بیخود ہو جاتا اور تیز قدم چلنے لگتا۔

عرب گھوڑوں کو بھی بڑے شوق اور اہتمام سے پالتے تھے۔ خالص گھوڑوں کی افزائش نسل کے خیال سے ان کے شجرہ نسب یاد رکھتے تھے۔ اسی دیکھ ریکھ کا نتیجہ ہے کہ اب بھی دنیا میں

۱۔ چنانچہ اس نے اپنے مشہور معلقہ میں کہا ہے کہ:

تفانبک من ذکری حبیب ومنزل بسقط اللوی بین الدخول وحومل

یعنی اے میرے دونوں ساتھیو، ذرا ٹھیرنا، ہم اپنے محبوب اور اس کے گھر کو یاد کر کے، جو سقط لوی میں دخول اور حومل کے درمیان ہے، رو تو لیں۔

عربی نسل کے گھوڑوں کی شہرت ہے۔ سپہ گیری میں مہارت پیدا کرنے، اور اس فن کو زندہ رکھنے کے لیے جو تدبیریں عرب کرتے تھے ان میں ایک گھوڑ دوڑ بھی شامل تھی۔ اس دن خاص اہتمام ہوتا، مقابلہ میں حصہ لینے والے قبایل آمنے سامنے جمع ہوتے، میدان میں ایک بانس کا ٹکڑا گاڑ دیا جاتا اور گھوڑے چھوڑ دیئے جاتے۔ جو گھوڑسوار آگے نکل جاتا وہ اپنے ساتھ اس بانس کے ٹکڑے کو بھی اکھاڑ لے جاتا اور پالا مار لیتا۔ اس رسم سے عربی زبان میں "حاز قصب السبق"(۱) کی مثل ایجاد ہوئی یعنی پالا مار لیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، عربی قبایل ہمیشہ جنگ وجدال، لوٹ مار، قتل وغارت گری میں معروف رہتے تھے۔ ان جنگوں کے جہاں برے اثرات مرتب ہوتے تھے، وہاں ان کی وجہ سے چند مفید نتائج بھی نکلے۔ عربوں کی تاریخ میں پہلی دفعہ اس کشت وخون کو دیکھ کر ایک جاہلی شاعر نے صلح وآشتی، اور امن وسلامتی کا نعرہ لگایا وہ چیخا کہ خدا کے لیے اس مذموم ومنحوس جنگ وجدال کو بند کرو، ورنہ یہ تم کو اور تمھاری آل واولاد کو ہمیشہ کے لیے بھسم کرکے رکھ دے گی۔ اور یہ شاعر تھا اصحاب معلقات کا زاہد اور فلسفی شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ۔ زہیر بن ابی سلمیٰ نے جب یہ وحشت وبربریت دیکھی تو بڑے دلنشیں انداز سے صلح صفائی، میل جول اور محبت والفت کا پیغام دیا اور اس حرص وہوس کی ماری دنیا میں یہ آواز شبنم کے قطروں کی طرح سوکھی اور پیاسی زمین کے لیے مژدۂ جانفزا بن کر پھیلی۔

عربوں کی اس جنگجویانہ طبیعت اور ماحول کا اثر زبان پر پڑے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ پوری عربی شاعری جنگ کے حالات اور ان کے وصف، معرکہ کارزار کے بیان، انتقام لینے کی خواہش، کامیابی پر فخر، ذلت برداشت کرنے کے مقابلے میں مرجانے کو ترجیح دینے، عزت وناموس کی خاطر جان کی بازی لگا دینے اور اپنے وقار اور خودداری پر سب مال ومتاع کو قربان کر دینے کے جذبات سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح ان جنگوں کے نتیجے کے طور پر ہتھیاروں اور آلات جنگ کے نام عربی زبان میں آئے۔ چنانچہ جو شخص مذکورہ اوصاف پر پورا اترتا وہ قبیلہ کی آنکھ کا تارا مانا جاتا، جس کی عزت صرف قبیلہ کے لوگ ہی نہیں بلکہ حریف بھی کرتے۔

بدویانہ زندگی گذارنے کی وجہ سے سیر وشکار کا مشغلہ بھی ان عربوں کے یہاں رائج تھا، جس کا ذکر جاہلی شاعری میں، خاص طور سے امرؤ القیس اور مرقش الاکبر اور علقمہ الفحل کے یہاں بہت ملتا ہے(۲)

۱۔ لفظی معنی "مقابلے کے بانس پر قبضہ کر لیا۔"

۲۔ امرؤ القیس اور علقمہ الفحل کے درمیان جو شعری مقابلہ ہوا تھا اس میں ہار جیت کا فیصلہ بھی شکار سے متعلق ایک شعر پر ہوا تھا۔ تفصیل علقمۃ الفحل کے حالات زندگی میں دیکھیے۔

چنانچہ نیل گایوں اور گورخروں کے شکار کے تذکرہ سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ شیر کے شکار کا بھی رواج ان کے یہاں تھا اور اس کے لیے یہ بدو لوگ کسی اونچی جگہ گڈھا کھود دیتے تھے جسے زبیہ بن عربی کہتے تھے اسی زبیہ سے عربی کی ضرب المثل "بلغ السیل الزبی" یعنی "پانی سر سے اونچا ہو گیا" نکلی ہے۔ ۴

شراب اور جوا ان عربوں میں عام تھا چنانچہ اس کا ذکر بھی جاہلی شاعری میں بہت اچھے انداز سے ملتا ہے۔ انھیں شراب کی محفلوں میں گانے کی ایجاد ہوئی جسے خاص قسم کی لونڈیاں گایا کرتی تھیں جنھیں قیان (قینۃ کی جمع) کہتے تھے۔ شراب کا بہترین وصف علقمۃ الفحل کے اس قصیدے میں ملتا ہے جس کا مطلع ہے:

هل ما علمت وما استودعت مكتوم　　　ام حبلها اذ نأتك اليوم مصروم

عورت اور بدویانہ زندگی

اس بدویانہ معاشرہ میں عورت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں شریک ہوتی تھی۔ یہ لکڑیاں لاتی تھی، جانوروں کو دوہتی تھی، کپڑے بنتی تھی۔ ان کے یہاں پردہ کا رواج نہ تھا، چنانچہ عورتیں بھی مہمانوں کا استقبال کرتی تھیں۔ شادی کے معاملے میں ان کو پوری آزادی حاصل تھی اور اپنے شوہر اپنی مرضی سے پسند کرنے کا اختیار انھیں حاصل تھا۔ جنگوں میں یہ مردوں کے پیچھے رہتی تھیں کہ مرد انھیں دیکھ کر اس خیال سے بے جگری سے لڑیں گے کہ اگر ہار ہو گئی تو ان کی عورتیں لونڈیاں باندیاں بنالی جائیں گی۔ ان بدوی عورتوں میں سے بہت سی نے بہادری، قوت ارادہ، عقلمندی اور شعر و ادب میں بھی نام پیدا کیا ہے (۱) اس بدوی زندگی کے ان سب مظاہر کا ذکر ہمیں جاہلی شاعری میں پوری طرح ملتا ہے۔

عورتوں کی اس اہمیت اور زندگی میں ناگزیری کے باوجود بعض قبایل اپنی لڑکیوں کو زندہ قبر میں دفن کر دیتے تھے۔ مگر یہ رواج بہت عام نہ تھا۔ صرف تیم اور اسد کے بعض قبایل اس مذموم حرکت کے مرتکب ہوتے تھے۔ اس کی ایک وجہ جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے، غربت تھی۔ یہ قبایل سمجھتے تھے کہ لڑکی ذات صرف بار بڑھائے گی، ہاتھ نہیں بٹائے گی۔ چنانچہ قرآن نے کہا کہ "تم ان کو فاقہ اور تنگ دستی کے ڈر کی وجہ سے نہ مارو، کیونکہ ہم تم کو بھی کھلاتے ہیں اور ان کو بھی" (۲) اس خطرے کے علاوہ سب سے

---

(۴) نقلی معنی: سیلاب شیر کے شکار کے گڈھے تک پہنچ گیا۔

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے: ۱۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، جرجی زیدان ج ۱، اور الاغانی کے مختلف حصے۔ (۲) تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام، ڈاکٹر شکری فیصل مطبوعہ دمشق (۳) الغزل فی العصر الجاہلی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

بڑی وجہ ان کی عزت نفس اور خودداری تھی۔ ان قبائل کو اس میں اپنی ہتک اور توہین محسوس ہوتی تھی کہ کسی کے خسر اور کسی کے سالے کہلائیں۔

جہاں تک جاہلی شاعری کا تعلق ہے، اس میں تو مرکزی حیثیت عورت ہی کو حاصل ہے۔ اس دور کے تمام شعراء اپنے کلام کی ابتدا عورت سے اظہار تشبیب سے ہی کرتے تھے، اور اس کے بعد گریز کرکے اصل مطلب پر آتے تھے۔ عام طور سے یہ شعری محبوبہ اپنی بیوی ہوتی تھی۔ غیر عورت سے اظہارِ تشبیب کرنا جاہلی شعراء اور جاہلی معاشرہ میں معیوب بات تھی۔ سب سے پہلے بیوی کے علاوہ دوسری عورت سے اظہار عشق کی ابتدا امرؤ القیس نے کی ہے، جس نے کئی لڑکیوں سے بیک وقت اظہار تشبیب کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی یہ عشقیہ شاعری اس کے باپ کے خفا ہونے کا سب سے بڑا سبب تھی۔ کیونکہ اس بدعت کو سارے عرب بہت معیوب سمجھتے تھے۔

۲۔ شہروں میں رہنے والے عرب

دوسری قسم ان عربوں کی تھی، جو عام طور سے شہروں میں پختہ مکانات بنا کر رہتے تھے اور شہری زندگی کی آسائشوں اور آسانیوں سے بہرہ مند تھے۔ یہ شہری عرب یمنی تھے، انھوں نے یمن میں بڑے بڑے محلات اور کوٹھیاں بنا رکھی تھیں اور تجارت و زراعت کی کمائی سے عیش و عشرت کی زندگی گذارتے تھے۔ مورخین کہتے ہیں کہ ان کی تہذیب و تمدن اس زمانے میں اتنی ترقی یافتہ تھی کہ ان کے گھروں میں سونے چاندی کے برتن استعمال ہوتے تھے، یہ لوگ باریک کپڑے زیب تن کرتے تھے اور اپنے محلات اور گھروں کو بہت قیمتی ساز و سامان سے سجاتے تھے۔ ظاہر ہے جہاں عیش و عشرت اور شہری زندگی کی اتنی آسانیاں ہوں، وہاں کے لوگوں میں سخت کوشی، محنت کرنے کی عادت، اور جنگجو قوموں کی صفات مثلاً بہادری، بے خوفی، اور دلیری نہیں پیدا ہو پاتی، چنانچہ یمن کے لوگ شمال کے عربوں کے مقابلہ میں ان صفات میں کم تھے۔

حجازیوں میں، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، قریش مکہ متمدن، مہذب اور شہری لوگ تھے، ان کی خوشحالی کا سبب ان کی تجارت تھی، جو یمنیوں کے بعد انھیں کی اجارہ داری میں آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ کعبہ کی تولیت اور اس کی وجہ سے ان کے احترام سے بھی ان کے یہاں فارغ البالی اور خوشحالی آئی۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) ڈاکٹر احمد محمد الحوفی مطبوعہ مصر۔

۲۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: "لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق ، نحن نرزقھم وایاکم"، اپنے اولاد کو تنگ دستی اور فاقہ کے ڈر کی وجہ سے نہ مارو، ہم ان کو اور تم کو بھی رزق دیتے ہیں۔

عربوں کی دینی حالت

زمانہ جاہلیت میں سب عربوں کا کوئی ایک مشترک مذہب نہ تھا، بلکہ ہر قبیلہ اور قبیلہ کی ہر شاخ اپنا ایک الگ مذہب رکھتی تھی۔ چنانچہ ان میں سے بعض سورج کو پوجتے تھے، اور اس کے نام پر "عبدشمس" یعنی سورج کا بندہ نام رکھتے تھے۔ بعض قبایل چاند کی پرستش کرتے تھے۔ قبیلہ لخم، خزاعہ اور قریش "شعری ستارہ" کو معبود سمجھتے تھے۔ ان میں سے بعض فرشتوں کی اور بعض قبایل جنات کی بھی عبادت کرتے تھے۔ قریش کے کچھ لوگ دو خدا مانتے تھے۔ ایک نور کا، اور دوسرا ظلمت (تاریکی) کا۔ خدائے ظلمت کو فتنہ و فساد اور برائیوں کی جڑ سمجھتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے سرے سے مذہب کا انکار کردیا تھا۔

ان چھوٹے موٹے خداؤں کے علاوہ، عام طور سے سارے عرب میں بت پرستی کا رواج تھا۔ قرآن کریم نے ان تمام بتوں کے نام گنائے ہیں، جنھیں اہل عرب پوجتے تھے۔ ان میں سب سے ممتاز بت، لات، منات، عزیٰ، یغوث، یعوق، نسر، ود اور سواع تھے۔ ان میں سب سے زیادہ پرانا بت "منات" تھا۔ یہ بت مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ رکھا رہتا تھا۔ یہاں آکر سارے عرب کے لوگ اس کی عبادت کرتے اور قربانی کے جانور ذبح کرتے۔ قبیلہ اوس اور خزرج کا یہ محبوب بت تھا۔ قبیلہ ثقیف کا محترم بت "لات" تھا، جس کا طائف میں انھوں نے مندر بنا رکھا تھا۔ عربوں میں ان بتوں کے نام پر نام رکھنے کا رواج بھی عام تھا۔ چنانچہ "عبدمناف"، "زیدمنات"، "زیداللات" اور "تیم اللات" کے نام عام طور سے عربوں میں پائے جاتے تھے۔ عزیٰ قریشیوں کا محبوب ترین بت تھا۔ اس کے علاوہ قریش نے خانہ کعبہ میں بھی کئی بت رکھ چھوڑے تھے۔ ان میں سب سے بڑا "ہبل" تھا، جو انسان کی شکل کا عقیق ہیرے کا بنا ہوا تھا۔

عربوں کی زندگی پر ان بتوں کا اثر اور ان کی کارفرمائی بہت نمایاں تھی۔ یہ لوگ ان سے برکت حاصل کرتے، مدد مانگتے، ان پر چڑھاوے چڑھاتے، فال نکالتے، سفر میں جاتے وقت اور واپس آکر ان کو چھوتے اور اپنے جسم پر ملتے۔ غرضکہ بت پرستی اور اس کے اثرات عربوں کی زندگی اور معاشرت میں بری طرح سرایت کرچکے تھے۔ دین ابراہیمی، جس کا پیرو اپنے آپ کو بتاتے تھے، بھولی بسری کہانی بن گیا تھا۔

یمن اور یثرب (مدینہ) میں تیما اور خیبر کے کچھ لوگ یہودی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے۔ بعض غسانی، قبیلہ طئی اور نجران و حیرة کے کچھ لوگ مذہب عیسوی کو مانتے تھے۔ مشہور جاہلی شاعر السموٴل بن عادیا بھی یہودی مذہب کا پیرو تھا۔

قبایل ربیعہ و غسان اور قضاعہ کی بعض شاخوں میں مذہب عیسوی کا رواج تھا۔ حیرہ میں عرب کے مختلف قبایل جن کو "العباد" کہتے تھے، مذہب عیسوی کے پیرو تھے۔ اسی طرح یمن میں نجران کا شہر عیسائی مذہب کا گڑھ تھا۔ عیسائی شعراء میں قس بن ساعدہ الایادی، امیہ بن ابی الصلت اور عدی بن زید کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے علاوہ ایک جماعت ایسی بھی تھی، جو صرف ایک خدا کی عبادت کرتی تھی، اور بت پرستی، یہودیت یا نصرانیت کے قائل نہ تھی۔ یہ لوگ "حنفی" (یعنی خالصۃً صرف ایک خدا کو ماننے والے) کہلاتے تھے۔ یہ لوگ قریشیوں کی بت پرستی کو خام خیالی اور اوہام پرستی سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے چڑھاوے کے جانوروں کے گوشت کو یہ لوگ حرام سمجھتے تھے۔

یہ تو عام معاشرہ کی دینی حالت تھی، لیکن اگر ہم جاہلی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شعراء نے دین اور اس کے معتقدات و نظریات کو دینی حیثیت سے اپنی شاعری کا موضوع عام طور سے نہیں بنایا اور نہ انھوں نے ان مسائل پر کبھی گفتگو کی۔ البتہ بعض شعراء ایسے ملتے ہیں جن کے یہاں لات و عزیٰ کی قسم ملتی ہے، مگر اول تو یہ بہت کم ہے، اور جہاں ہے بھی تو یہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ شاید مخاطب اس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو جو ان بتوں کو مانتا ہو۔ اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ جاہلیت میں عام عرب اور خاص طور سے شعراء دین کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ دوسری بات بھی ممکن ہے کہ اسلامی عہد میں جب ان شعراء کا کلام مرتب ہوا تو شعر کے راویوں نے جان بوجھ کر ایسے اشعار مرتب نہیں کئے، جن میں غیر اسلامی عقاید یا بت پرستی کا ذکر تھا، کیونکہ ان کے خیال میں اس سے اسلامی تعلیمات اور اسلامی عقاید کے مجروح ہونے کا ڈر تھا

عربوں کی ذہنی و فکری حالت

جب کسی قوم کی اجتماعی زندگی کا نہج وہ ہو جس پر عربوں اور خاص طور سے بدویوں کی معاشرتی زندگی چل رہی تھی تو علم اور علمی کام کرنے والے لوگ، اس کو منظم اور منضبط کرنے والے علماء نہیں ابھر پاتے، اور خاص طور سے ایسے معاشرہ میں جہاں لکھنے پڑھنے کا رواج صفر کے برابر ہو، کیونکہ علمی کام کے لیے سکون خاطر کے ساتھ معاشی سکون اور ایک ایسی تہذیب و تمدن کی ضرورت ہوتی ہے جہاں اس کی قدر اور اس سے استفادہ کے مواقع اور اس کو آگے بڑھانے کے امکانات موجود ہوں۔ اور یہی چیزیں بڑی حد تک اس معاشرہ میں مفقود تھیں۔ اسی لیے ہمیں اس زمانے میں کوئی ایسا علمی کام یا تصنیف نہیں ملتی جو خالصۃً عربوں کی دین ہو، اور جس نے علمی دنیا میں کوئی مقام حاصل کیا ہو

مگر کتابوں اور منضبط علوم و فنون کے نہ ہوتے ہوتے بھی ان عربوں نے اور خاص طور سے

عدنانیوں نے ضرورت کے تقاضے سے زندگی کے بہت سے مسائل اور اس سے متعلق کئی فنون میں اپنے تجربات کی روشنی میں یک گونہ دسترس حاصل کرلی تھی۔ جنگل میں لگے رہنے کی وجہ سے جانوروں کے علاج و معالجہ میں ان کو خاصی مہارت حاصل ہوگئی تھی۔ فن سپہ گری میں یہ لوگ یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے۔ بارش اور گھاس پر ان کے جانوروں کی زندگی کا دارومدار تھا، چنانچہ وہ ان تاروں کو پہچانتے تھے جن سے بارش کی اطلاع ملتی تھی۔ یا تاروں کے ذریعہ ملکوں کے جائے وقوع معلوم کرلیتے تھے (۱) یا بری اور بحری سفروں میں تاروں کی مدد سے تاریک راتوں میں رہنمائی حاصل کرلیتے تھے۔ ان عربوں نے اپنی نسلوں کی بقاء اور قومی تعصب کو زندہ رکھنے کے لیے علم نسب، اپنے قابل فخر کارناموں اور واقعات کو بیان کرنے اور انھیں اس طرح محفوظ رکھنے کے لیے قصہ گوئی اور کارناموں کو دوام بخشنے کے لیے شاعری میں اچھا خاصا درک پیدا کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ فراست (۲) اور قیافہ شناسی میں ان کو ایک گونہ مہارت حاصل تھی۔

صحیح علم کے فقدان کی وجہ سے ان لوگوں کے یہاں عرصہ سے کہانت، عرافت اور چڑیوں کو اڑاکر فال لینے اور ان سے فیصلہ کرنے کا رواج بہت عام تھا۔ بیماری آزاری میں صحراء کی بعض جڑی بوٹیوں کے استعمال کے علاوہ یہ لوگ اپنے کاہنوں سے بھی مشورہ لیتے تھے، اسی طرح اپنے مشورہ طلب اور پیچیدہ مسائل میں عرافوں کی طرف رجوع کرتے تھے (۳)

---

(۱) جیسے یمن کی سمت کو سہیل ستارہ کی مدد سے متعین کرتے تھے ایک جاہلی شاعر نے کہا ہے:

ذریني ما امن بنات نعش | من الطیف الذي ینتاب لیلا
ولکن إن اردت فهیجینا | إذا رمقت باعینها سهیلا

(۲) فراست ظاہری آثار و قرائن سے اندرونی حالات کو سمجھ لینے کا نام ہے۔ مثلاً کسی شخص کی باتوں اور اس کے ناک نقشہ سے اس کے اخلاق و عادات کا اندازہ لگانا۔

(۳) چہرے کے خدوخال سے آدمی کی طبیعت اور مزاج کا پتہ لگا لینے کو "قیافہ" کہتے ہیں۔ عرافت و کہانت: غیب کی باتیں معلوم کرنے، نیز گزری ہوئے اور آنے والے واقعات کو بتانے کو کہتے ہیں۔ "کاہن اور عراف" میں فرق یہ ہے کہ "کاہن" آنے والے واقعات کو بتانے والے کو کہتے ہیں (تکہن یتکہن پیشینگوئی کرنا) اور "عراف" اس شخص کو کہتے ہیں جو گذشتہ زمانے کے حالات کو بتائے۔ عربوں کا خیال تھا کہ کاہنوں اور عرافوں کے جنات تابع ہوتے ہیں جو پوشیدہ طور پر عالم غیب سے حالات سن کر ان کو بتا جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس پر پورا یقین رکھتے تھے اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔
(باقی ص پر)

"غرض کہ عربوں کا اجتماعی نظام صرف قبائل تک محدود تھا۔ زبان، سیاست اور معاشی اعتبار سے ان میں آپس میں کوئی یگانگت نہ تھی۔ البتہ خلقت، ذہنیت اور ادب کے لحاظ سے ان میں ایک گونہ اشتراک پایا جاتا تھا، اگر ان کے ادب کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان میں بلند، عالی دماغ، ذہین و طباع ہستیاں ملیں گی۔ دور رسی، تجربہ کاری، وسعت نظر کی ایسی مثالیں بھی ملیں گی جو تمام تر ان کی اپنی جودت فکر اور طباعی کا نتیجہ ہیں۔ ان کی زبان نے، جو درحقیقت ان کی اجتماعی زندگی کی ترجمان ہے، روحانی، مادی، فکری و خیالی، اجتماعی اور انفرادی، الغرض آسمان و زمین کی کسی چیز کو بھی ایسا نہ چھوڑا جس کے اظہار معانی کے لیے اپنے اندر کوئی لفظ نہ بنایا ہو" اور اس کا اظہار ان کے خطبات ان کے امثال اور حکیمانہ مقولوں اور بیان سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

عربی زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما

یہ عرب جن کا ذکر اوپر ہوا، عربی زبان بولتے تھے۔ عربی زبان دنیا کی ان وسیع، شیریں، سلیس، پاکیزہ اور خوبصورت زبانوں میں سے ہے، جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس کے الفاظ کے مخارج بڑے سامعہ نواز، پیرایہ بیان بڑا بلیغ، تراکیب بڑی دل آویز اور صوتی اثرات بڑے وقیع اور موثر ہوتے ہیں۔ پھر اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک ہی مادہ سے (اکثر صرف تین حروف سے) مختلف قسم کے افعال نکلتے ہیں جن میں بسا اوقات سات حروف تک ہوتے ہیں اور جن کے معنی بالکل مختلف ہوتے ہیں، اس کے علاوہ صلات کے بدلنے سے بھی معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ بات کو پراثر بنانے کے لیے مجاز و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ وغیرہ کا، اور معانی میں وسعت اور گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کے لیے مرادفات کا استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ کی آخری آواز (اعراب) کو حروف کے ذریعہ ہی ادا کیا جاتا ہے، انہیں لکھا نہیں جاتا چنانچہ زبر، زیر اور پیش کو علامت کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے، حروف سے نہیں۔ جیسا کہ آریائی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آریائی زبانوں کے مقابلے میں اس کی حروف تہجی بھی زیادہ ہیں، جن کی وجہ ہر قسم کے الفاظ لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ عربی زبان کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے قالب میں ڈھال لینے (معرب کرنے میں) اور بدل کر خوبصورت شکل دے دینے

زجر: جانوروں کے ڈرانے یا چڑیوں کے اڑنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ عرب ان کی حرکت و ہیئت سے آئندہ پیش آنے والے واقعات کا اندازہ لگاتے تھے مثلاً اگر کوئی شخص کسی پرندہ کو پتھر مار کر یا شور مچا کر اڑاتا اور وہ پرندہ اس کے دائیں سمت سے اڑتا ہوا چلا جاتا تو وہ اسے فال نیک (اچھا اور مناسب) سمجھتے اور اگر بائیں جانب سے ہو کر اڑتا تو وہ اسے بدشگونی قرار دیتے اور اس کام سے باز رہتے

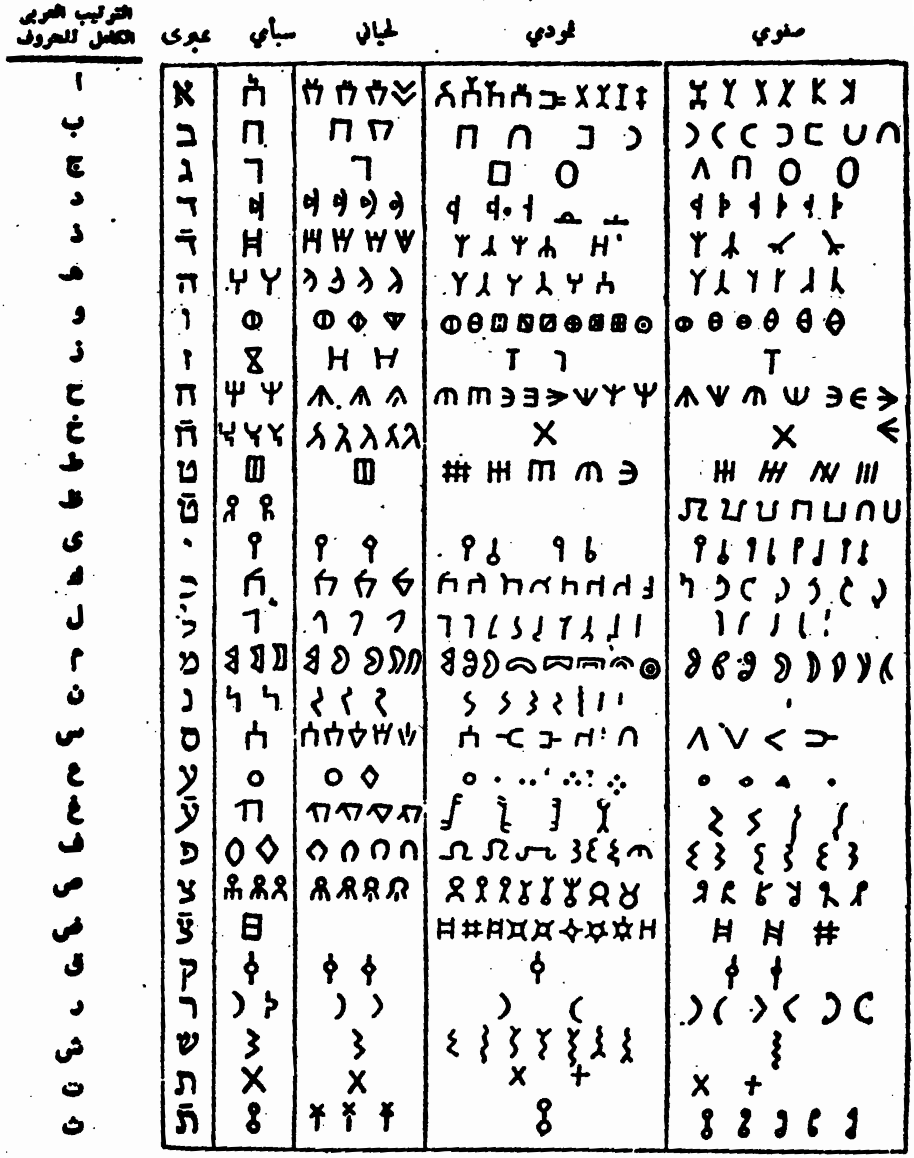

شكل ١ صفوي، ثمودي رسوم التجريد

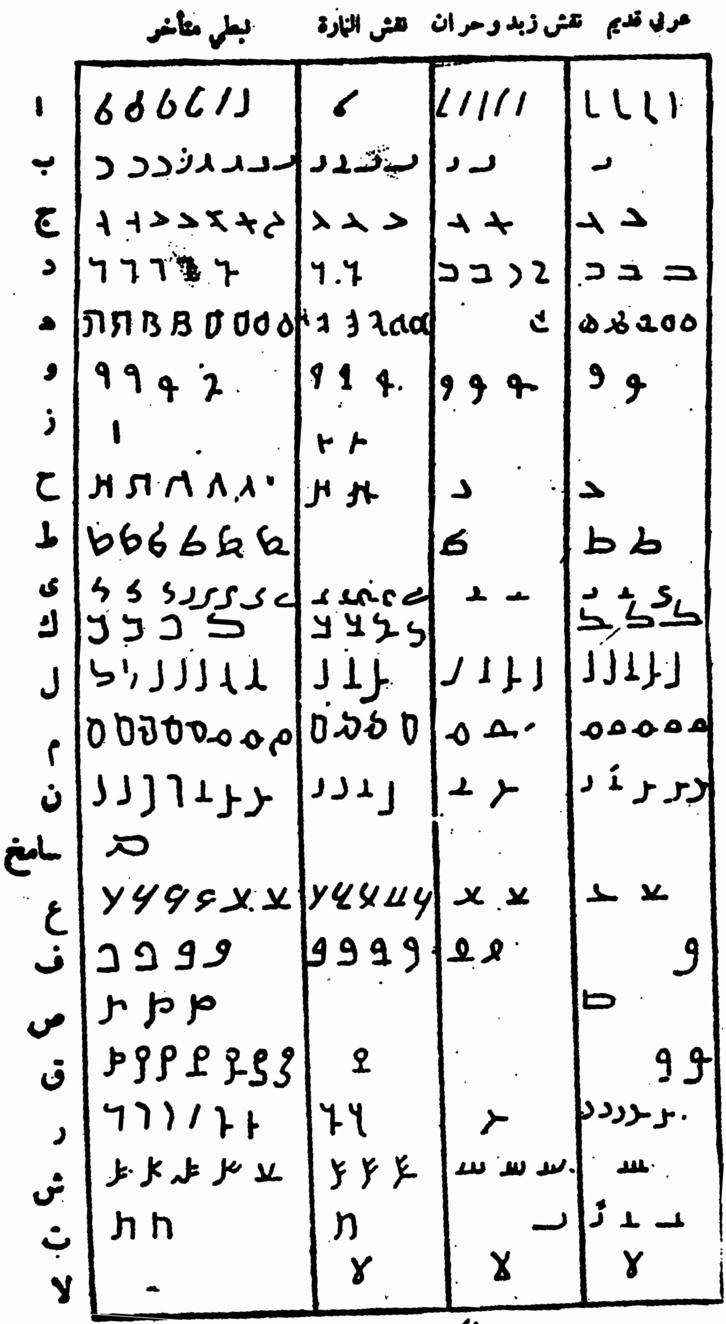

شكل ٢ قديم عربي

شکل - ۱ -

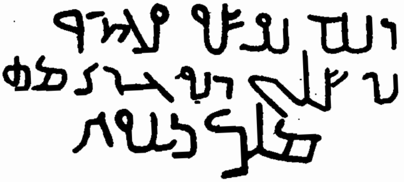

«آ»

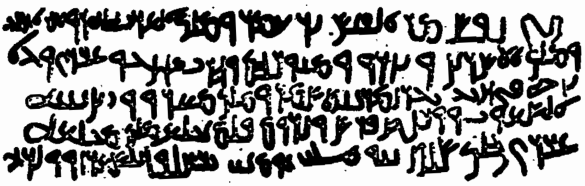

«ب»

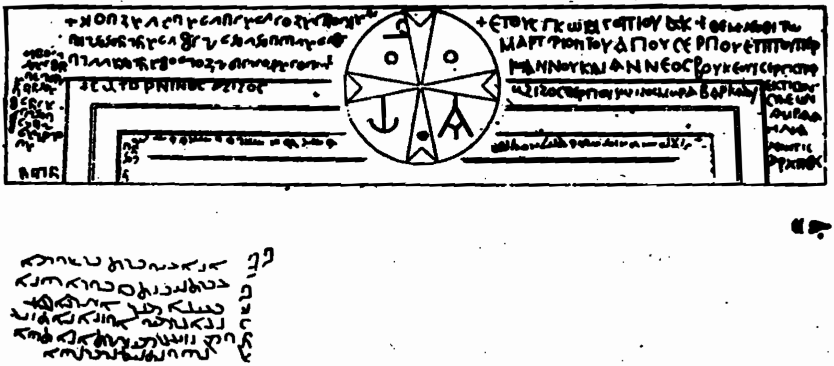

«ج»

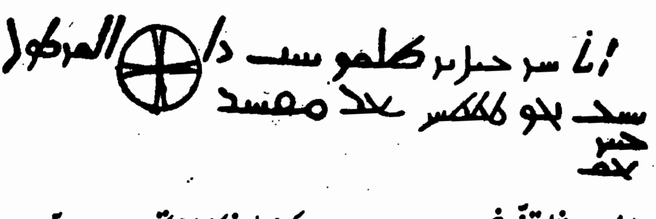

«د»

شکل (الف) شاہ تنوخ (۲۵۰ سے ۲۷۱ء) کے زمانے کا طرز تحریر۔ (ب) نمارہ کا طرز تحریر ۳۲۸ء۔ (ج) حجر زبد ۵۱۱ء کی تحریر جس میں پہلے یونانی، پھر سریانی اور اخیر میں عربی رسم خط ہے۔ (د) ۵۲۹ء اور ۵۶۹ء کے درمیان حوران میں رائج طرز تحریر

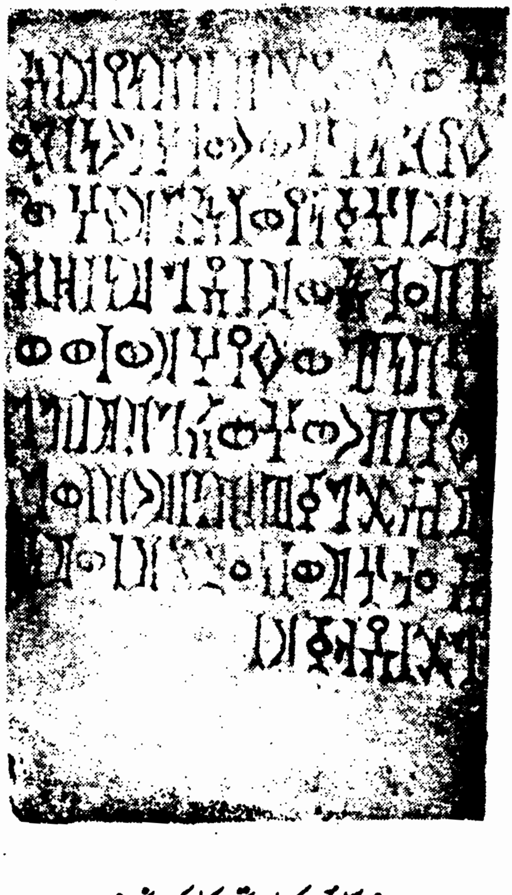

عہدِ سبئی کے طرزِ تحریر کا ایک نمونہ

میں یہ زبان اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کی یہی امتیازی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر خدا نے اپنے کلام کے لیے اسی زبان کو انتخاب فرمایا اور قرآن کریم جیسی معجز نما کتاب اس زبان میں اتاری، جو بلا اختلاف عربی زبان و ادب کی وہ واحد کتاب ہے جس کی ایک سورۃ کی مثال بھی عرب کا بڑا سے بڑا شاعر اور ادیب اب تک نہ لا سکا۔ قرآن کے بعد اسی زبان میں خدا کے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیثیں ارشاد فرمائیں جو عربی ادب میں بلا اختلاف اپنی فصاحت و بلاغت اور معنوی جامعیت میں شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

عربی زبان کا سامی زبانوں سے رشتہ

زبان کے ماہر علماء کے خیال کے مطابق عربی زبان ان سامی زبانوں کی ایک شاخ ہے، جسے حضرت نوح کے بیٹے سام بن نوح کی اولاد کسی زمانے میں، اپنی بستیوں میں بولا کرتے تھے اور اس طرح اس زبان کا آریائی اور حامی زبانوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ان سے بالکل مختلف ایک الگ زبان ہے۔ جب جگہ کی تنگی اور حالات کے ناقابل برداشت ہو جانے کی وجہ سے سامی اقوام ہجرت کر کے مختلف خطوں میں گئیں، اور دوسری قوموں سے اور دوسری زبانوں سے ان کا میل جول بڑھا تو ان کی زبان میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہوا اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، حالات بدلتے گئے، سامی اقوام کی جائے رہائش اور مرکز بھی بدلتے گئے اور اسی حساب سے ان کی زبانوں میں بھی اختلاف اور دوری پیدا ہوتی گئی، یہاں تک کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ان کے مختلف لہجوں میں پوری مغایرت پیدا ہو گئی اور حالت یہاں تک پہنچی کہ ان کے مختلف لہجے بذات خود مستقل زبانیں بن گئیں۔ مگر چونکہ اصل سرچشمہ ایک تھا اس لیے ان کے اکثر الفاظ میں بڑی حد تک مشابہت اور قرب باقی رہا۔ اس کی مثال ہمیں عربی اور عبرانی زبان کے الفاظ میں پوری طرح ملتی ہے۔ چنانچہ بعض ایسے الفاظ جو عربی میں "شین" سے بولے جاتے ہیں، عبری میں "سین" سے بولے جاتے ہیں۔ عربی میں جو "الف" ہوتا ہے وہ عبری میں "واد" بن جاتا ہے۔ جیسے عربی کا "سلام" عبری میں "شلوم" بولا جاتا ہے۔ اسی طرح عربی کا "ث" عبری میں "ش" ہو جاتا ہے، جیسے عربی کا "ثور" عبری میں "شور" لکھا جاتا ہے۔ "ضاد" سے عربی کے جو الفاظ بولے جاتے ہیں وہ عبری میں "صاد" سے ادا کیے جاتے ہیں جیسے عربی کا لفظ "أرض" عبری میں "أرص" کہا جاتا ہے۔

ماہرین لسانیات نے پرانی زبانوں کو مختلف گروہوں اور حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ان کی تقسیم کے مطابق آریائی زبانوں کے تین حصے یا تین بولیاں ہیں: لاتینی، یونانی، اور سنسکرت۔ اسی طرح انھوں نے سامی زبانوں کو بھی تین مختلف حصوں میں بانٹ دیا ہے: آرامی، کنعانی اور عربی۔ کہتے ہیں کہ آرامی زبان سے کلدانی، اشوری اور سریانی زبانیں پیدا ہوئیں، اور کنعانی سے عبرانی اور فینیقی۔ عربی سے

معزکی خوبصورت اور فصیح زبان کے علاوہ دوسری بولیاں جنھیں یمنی اور بعض حبشی قبایل بولتے ہیں، وجود میں آئیں۔

عربی زبان

عربی زبان اپنی اصلی شکل میں کس طرح وجود میں آئی، اس کا یقینی پتہ لگانا بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ جس وقت اس کی تاریخ واضح شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ وہ اسلامی زمانہ ہے اور اس وقت عربی زبان اپنے عروج کو پہنچ ہوئی تھی۔ اس سے پہلے جن مرحلوں سے یہ زبان گزری ہے اس کے متعلق کوئی بات اب تک یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی، مگر اب مستشرقین اور آثار قدیمہ کے ماہروں نے یمن، شام اور شمالی حجاز میں دریافت شدہ ان کتبوں سے جو پتھروں، مندروں، لاٹھوں، چہار دیواری، گنبدوں اور قلعوں میں ملے ہیں، عربی زبان سے متعلق بہت سی اہم باتیں معلوم کر لی ہیں۔ چنانچہ ان کتبوں اور نقوش کو ان علماء نے تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے جن سے مندرجہ ذیل تین لہجوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) جنوبی عربی لہجے: اس زبان کے کتبے یمن کے علاقہ قتبان، معین اور سبا وغیرہ میں ملے ہیں، جہاں اس لہجہ کا رواج تھا۔

(۲) شمالی عربی لہجے: اس زبان کے کتبے حجاز کے شمال میں ثمود کے رہنے کی جگہوں میں ملے ہیں۔

(۳) آرامی نبطی لہجے: یہ لہجے مذکورہ بالا لہجوں کے مقابلہ میں نئے ہیں۔ ان لہجوں کے لکھنے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب زبانوں کے لکھنے اور بولنے میں بڑا اختلاف تھا۔ مگر بعد میں حالات کے تقاضوں سے لہجوں کا یہ اختلاف مٹ گیا اور سب کے میل جول اور خاص طور سے دینی تقاضوں کے ماتحت ایک خوبصورت صاف ستھری اور شیریں زبان نکل آئی۔

اصل بات یہ ہے کہ عرب قوم ان پڑھ قوم تھی۔ قوموں اور گروہوں میں تعلقات اور ربط ضبط قائم کرنے کی ساری بنیادیں، مثلاً دین، تجارت یا حکومت، ان میں سے کوئی چیز ان میں ایسا میل جول اور تعلق نہ پیدا کر سکی جس سے آپس میں گہرا تہذیبی اور لسانی لین دین پیدا ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قبایل ایک ہی چیز کو مختلف ناموں سے پکارنے لگے اور ایک ہی مقصد کو ادا کرنے کے لیے الگ الگ طریقۂ ادا اختیار کرنے لگے، زندگی چونکہ خانہ بدوشانہ تھی، اس لیے شروع میں دوسروں سے اخذ کرنے کے مواقع بہت کم ملتے تھے، مگر جب ان کا تعلق دوسروں سے ہوا تو ان کی زبان میں بھی ان قبیلوں کے الفاظ آنے شروع ہوگئے اور اس طرح ان کی زبان میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور ایک ہی معنی کے لیے مختلف قبایل میں مختلف الفاظ اور تعبیریں آگئیں اور اس سے مترادفات کی کثرت ہوئی۔

پھر تعلیل وغیرہ کے اختلاف سے لہجوں میں بہت اختلاف ہوگیا۔ اس کے علاوہ بہت بڑا اختلاف بعض جملوں، بعض الفاظ اور حروف کو مروج طریقوں کے علاوہ مختلف طریقوں سے ادا کرنے کی وجہ سے بھی پیدا ہوا جیسے قبیلہ مازن کا "ابدال" کا طریقہ(۱) یا "اتمام و نقص"(۲) کا رواج جو قبیلہ خثعم اور زبید میں رائج تھا یا جیسے قبیلہ قضاعہ کا "عجعجہ"، یا حمیر کا "طمطانیہ" ہذیلیوں کا "فحفحہ" یا قبیلہ تمیم کا "عنعنہ" قبیلہ ربیعہ یا اسد کا "کشکشہ" اور قبیلہ طئی کا "قطعہ"۔

عربی زبان کی تقسیم

قبایل کے مختلف لہجات میں مذکورہ بالا اختلاف کی وجہ سے علمائے لغت نے عربی زبان کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔

۱۔ جنوبی عربی زبان: جو یمن میں رائج تھی۔

۲۔ شمالی عربی زبان: جو حجاز میں رائج تھی۔

جنوبی عربی زبان میں جو یمن میں بولی جاتی تھی، سبا اور حمیر کی زبان شامل تھی۔ مگر فوقیت حمیر کی زبان کو حاصل تھی اس لیے اس کو حمیری زبان بھی کہتے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہ شمالی زبان

---

(۱) یہ لوگ "م" کو بدل کر "ب" کر دیتے تھے اور "ب" کو بدل کر "م" کر دیتے تھے چنانچہ "ما اسمک" کی جگہ "با اسمک" اور "بکر" کی جگہ "مکر" بولتے تھے۔ (۲) یہ لوگ "من" حرف جار کے "نون" کو حذف کر دیتے تھے اور "خرجت من البیت" کی جگہ "خرجت ملبیت" کہتے تھے۔ آج بھی مصر اور لبنان میں اکثر جگہ اسی طرح بولتے ہیں

۳۔ عجعجہ یہ ہے کہ اگر کسی لفظ میں "عین کے بعد "ی" آجائے تو اس کو "ج" سے بدل دیا جائے جیسے "راعی" کو "راعج" اور "کرسی" کو "کرسج" کہا جائے۔ چنانچہ "الراعی خرج معی" کو قضاعہ والے "الراعج خرج معج" کہتے تھے۔ "طمطانیہ"، "ال" کی جگہ "ام" بولنے کو کہتے ہیں جیسے "البر" کو "امبر"، "الصیام" کو "امصیام" یا "طاب الھواء" کی جگہ "طاب امھوا" کہنا۔ "ح" کی جگہ "ع" بولنے کو "فحفحہ" کہتے ہیں جیسے "احل الله الحلال" کو "اعل الله العلال" کہا جائے یا "الحسن" کو "العسن" کہا جائے۔ "عنعنہ" میں شروع لفظ کے ہمزہ کو "عین" سے بدل دیتے تھے جیسے "أمان" کو "عمان"، "ان" کو "عن" کہتے تھے۔ "کشکشہ" یہ ہے کہ مؤنث حاضر کے "ک" کو "ش" سے بدل دیا جائے اور "علیک" کی جگہ "علیش" کہا جائے یا "ک" کے بعد "ش" بڑھا دیا جائے اور "علیک" کی جگہ "علیکش" بولا جائے۔ "قطعہ" کسی لفظ کے آخری حرف کو حذف کر دینے کا نام ہے، جیسے "یا ابا الحسن" کو "یا ابا الحسا" کہا جائے۔

یعنی حجازی کے مقابلہ میں زیادہ قدیم زبان ہے، کیونکہ یہ یمنیوں کی اصل زبان تھی۔ جنوب میں یمنیوں کی یہ زبان شمال میں عدنانیوں کی زبان سے بہت مختلف تھی۔ یمن میں جو کتبے وغیرہ ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جنوبی یمنی زبان، شمال کی عدنانی زبان سے نہ صرف صیغوں، تنوین، جمع مذکر سالم اور ضمیروں وغیرہ میں مختلف تھی بلکہ اس کے حروف تہجی بھی بڑی حد تک مختلف تھے۔ اسی لیے مشہور لغت کے عالم عمرو بن علا نے کہا تھا کہ "مالسان حمیر من لساننا فی شیئ، وما لغتہم من لغتنا فی شیئ" یعنی نہ تو حمیر (یمن) کی زبان ہماری زبان ہے اور نہ ان کی لغت ہماری لغت

شمالی علاقہ حجاز میں جو عربی بولی جاتی تھی، وہ عدنانیوں کی زبان تھی اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہ یمنی زبان کے مقابلے میں نئی زبان تھی اور ہمارے پاس جاہلی شاعری کا جو سرمایہ پہنچا ہے وہ اسی عدنانی لہجہ میں ہے، کیونکہ یہ جن شعراء کا کلام ہے وہ یا تو قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتے تھے جیسے الاعشیٰ اور طرفہ بن العبد جو قبیلہ تغلب سے تعلق رکھتے تھے یا مضر سے جیسے النابغہ الذبیانی اور عنترہ بن شداد العبسی جن کا تعلق قبیلہ مضر سے تھا۔ اور یہ دونوں قبیلے عدنان کی شاخیں ہیں۔ یا اگر کوئی شاعر نسلاً یمنی ہے بھی، تو وہ ان قبیلوں سے تعلق رکھتا ہے جو شمال کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے جیسے قبیلہ طئی، کندہ اور تنوخ۔ کہتے ہیں کہ شمال کی یہ عدنانی زبان اپنی اصل زبان سامی سے، دوسری زبانوں کے مقابلے میں، بہت قریب تھی۔ کیونکہ ان عدنانی قبایل کا دوسری قوموں سے بہت کم میل جول ہوا۔ اسی طرح یہ قبایل دوسری سامی قوموں جیسے عبرانی، بابلی، اور اشوری کی طرح دوسری قوموں کے کبھی غلام نہیں رہے، کیونکہ صحرا میں رہنے کی وجہ سے حملہ آوروں کی دست برد سے یہ ہمیشہ محفوظ رہے۔

جنوبی اور شمالی عربی زبانوں میں اختلاف کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں آپس میں سرے سے کوئی تعلق رہا ہی نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب یمن میں عرم کا سیلاب آیا اور اس کی وجہ سے تاریخ قدیم کا مشہور بند "مارب" ٹوٹا، اور اس ملک کے شہروں اور گاؤں کو اس سیلاب نے تباہ و برباد کر دیا تو سبا کے قبایل نے وہاں سے ہجرت کر کے جزیرہ عرب میں پناہ لی۔ یمن کے

(۱) یمنی قبایل کی اس حادثہ اور ان کے آپس کے جنگ و جدال کی وجہ سے تتر بتر ہو جانے کا واقعہ اتنا موثر ہے کہ عربی ادب میں یہ حادثہ ضرب المثل بن گیا، چنانچہ کہتے ہیں کہ تفرقوا أيدي سبا یعنی ایسے تتر بتر ہوئے جیسے سبا کے قبایل۔

یہ لوگ متمدن، طاقتور اور ذہین و زیرک تھے، چنانچہ انہوں نے شمال میں آکر کوشش کی کہ جس طرح یمن میں عدنانی ان کے تابع تھے، اسی طرح یہاں بھی ان کے زیرِ نگیں رہیں، مگر ان کو اپنی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی، کیونکہ عدنانیوں کا پورے صحرا پر قبضہ تھا اور یہاں ان کی حیثیت کافی مضبوط تھی۔ ایک دوسرے پر غلبہ اور بالادستی حاصل کرنے کی یہ کوشش بعد میں تعلقات قایم کرنے اور میل ملاپ بڑھانے کا ذریعہ بن گئی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ دونوں گروہوں میں سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم ہوگئے اور اس طرح دونوں میں غیر شعوری طور پر الفاظ اور طریقہ ادا کا لین دین بھی ہونے لگا اور زمانے کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں میں یکسانیت کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ یہ کشمکش چھٹی صدی عیسوی تک قایم رہی، یہاں تک کہ یمن میں حمیری حکومت کا زور رفتہ رفتہ، کبھی ایرانی اقتدار کی وجہ سے اور کبھی حبشیوں کے تسلط کی وجہ سے کم ہوتا گیا۔ ادھر عدنانیوں کی حالت ان کے برعکس پہلے سے بہت اچھی ہوتی گئی۔ یہ لوگ بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے تھے، حج بیت اللہ کی سربراہی ان کو حاصل تھی اس کے علاوہ یہ لوگ حمیری اور ایرانی حکومتوں سے نبرد آزمائی کے لیے تیار رہتے تھے۔ پھر تجارت کی وجہ سے آس پاس کے ملکوں سے تعلقات استوار تھے۔ چنانچہ انہوں نے موقع پاکر، اپنی زبان و ادب کو تباہ شدہ اور خستہ و مغلوب حمیریوں پر تھوپ دیا۔ اکھاڑ پچھاڑ اور بناؤ بگاڑ کا یہ دور ابھی چل ہی رہا تھا کہ اسلام آگیا اور اس کی وجہ سے رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ یمنی لہجہ اور یمنی قوت بالکل ختم ہوگئی کیونکہ قرآن کے قریشی لہجہ میں اترنے کی وجہ سے اس لہجہ کو دوسرے تمام لہجوں پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ دوسری تمام زبانیں اور لہجے ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئے، اور اب صرف لہجہ قریش کی حکمرانی اور اس کا غلبہ ہوگیا، جو قرآن کی وجہ سے اب تک جاری ہے۔ (ص)

قریش کی زبان کو غلبہ حاصل ہونے میں جہاں اسلام اور قرآن کے نزول کا دخل ہے، وہاں بعض دوسرے اسباب بھی ہیں جنھوں نے اس فوقیت کو قایم اور برقرار رکھنے میں مدد کی۔ (۱) ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

(ص) قریش کے لہجہ کی فوقیت کے اسباب و علل کے لیے ملاحظہ کیجیے: ۔ مضمون "مقدمہ تاج العروس: دراسۃ نقدیۃ" از ڈاکٹر محمد عبدالسلام اشرف الدین، نیجیریا۔ مطبوعہ "اللسان العربی" الرباط، مراکش۔ المجلد الثالث عشر عام ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۱۳۶: "قریش واللغۃ المشترکۃ"

(۱) سامی زبانوں سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: (۱) "فقہ اللغۃ" مولفہ دکتور علی عبدالواحد وافی۔ (۲) "علم اللغۃ"
(باقی اگلے صفحہ پر)

میلے اور بازار

عربوں کا دستور تھا کہ سال کے خاص مہینوں میں، جن میں عام طور سے لڑائی جھگڑا لوٹ مار بند رہتی تھی، خاص قسم کے میلے، بازار لگاتے اور تہواروں کی طرح انھیں مناتے۔ اور اپنا سامان تجارت بیچتے اور ضرورت کی چیزیں خریدتے۔ ان میلوں اور بازاروں میں جمع ہونے کے بعد صرف مال تجارت کا ہی لین دین نہیں ہوتا تھا بلکہ زبان و لغت، افکار و خیالات، کا بھی لین دین ہوتا تھا۔ کیونکہ ان میلوں میں عرب کے ممتاز شعراء، خطباء، روساء بڑی شخصیتیں اور قابل قدر لوگ جمع ہوتے تھے۔ جب اس قسم کا اجتماع کہیں ہونے لگے، اور خاص طور سے عرب جیسی قوم کے افراد کا تو ظاہر ہے اپنی اور اپنے قبیلے کے اہم واقعات، بہادری کے قصے، حسب نسب میں برتری کے دعوے، زبان دانی اور اس میں تفوق کے مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان میلوں میں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تجارتی منڈیاں، جن کی حیثیت "انٹر عرب نمائشوں" کی سی تھی، ایک طرف شعراء و خطباء کے افکار و خیالات کی نشرگاہیں بننے لگیں تو دوسری طرف عربوں کو اپنے دین، اخلاق، عادات و اطوار اور اپنی زبان میں اتحاد پیدا کرنے کا موقع بھی ملنے لگا۔

ان میلوں کی سب سے بڑی اور اہم مجلس "محفل مشاعرہ" ہوتی تھی، جس میں کلام سنانے کے لیے شعراء بہت پہلے سے اور بڑی ریاض کرکے تیاری کرتے تھے۔ عام دستور تھا کہ کسی سن رسیدہ باوقار اور متفق علیہ شاعر کو ثالث یا "میر مشاعرہ" مقرر کیا جاتا۔ پھر شعراء اپنا کلام پڑھ کر سناتے اور لوگ سن کر سر دھنتے اور جب سب شعراء فارغ ہو جاتے تو ثالث یا میر مشاعرہ اپنا فیصلہ سناتا کہ اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مؤلفہ مصنف مذکور: مطبوعہ لجنۃ البیان العربی، المنیرہ، القاہرہ ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۲ء۔ (۳) تاریخ العرب قبل الاسلام: الدکتور جواد علی ج ۷، مطبعۃ المجمع العلمی العراقی (۴) فقہ اللغۃ و خصائص العربیہ: محمد المبارک مطبوعہ دار الفکر الحدیث لبنان۔ (۵) الفلسفۃ اللغویۃ: جرجی زیدان، مطبوعہ الہلال مصر ۱۹۰۴ء۔ (۶) نشوء اللغۃ العربیۃ و نموہا و اکتمالہا، مطبوعہ القاہرہ ۱۹۳۸ء۔ (۷) مقدمۃ لدراسۃ لغۃ العرب: عبداللہ العلایلی مطبوعہ القاہرہ۔ (۸) من اسرار العربیۃ: ڈاکٹر ابراہیم انیس، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۸ء (۹) دراسات فی العربیۃ و تاریخہا: محمد الخضر حسین مطبوعہ دمشق ۱۹۶۰ء۔ (۱۰) اللغۃ الشاعرہ: عباس محمود العقاد، مطبوعہ قاہرہ۔ (۱۱) مشکلات اللغۃ العربیۃ: محمود تیمور، قاہرہ (۱۲) دراسات فی فقہ اللغۃ: ڈاکٹر صبحی الصالح، دمشق ۱۹۶۰ء۔ (۱۳) دراسات فی اللغۃ: ڈاکٹر ابراہیم السامرائی، بغداد ۱۹۶۱ء۔

سال کس شاعر کا قصیدہ سب سے اچھا رہا، چنانچہ اس قصیدہ کو لکھ کر خانہ کعبہ کے دروازہ پر لٹکا دیا جاتا۔ یہی وہ قصیدے ہیں جن کو "معلقات" (لٹکائے ہوئے قصیدے) کہتے ہیں۔ عکاظ کے میلہ میں عام طور سے مشہور جاہلی شاعر "النابغہ الذبیانی" مشاعروں کا میر یا ثالث مقرر ہوتا تھا۔ اس کے لیے چمڑے کا ایک خاص قسم کا سرخ رنگ کا خیمہ لگایا جاتا جہاں وہ بڑی عزت واحترام سے قیام کرتا تھا۔ مشاعروں کے علاوہ شعراء نجی طور پر بھی اس کو اپنا کلام دکھا کر اس کی رائے معلوم کرتے تھے۔

ان میلوں میں سنایا ہوا کلام عربوں کے مختلف قبائل میں پھیل کر بہت جلد عام ہو جاتا۔ نشر و اشاعت کے اس عوامی طریقہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف لہجوں، مروجہ افکار، پڑھے لکھے طبقہ کے خیالات، اسلوب بیان اور طریقہ ادا میں رفتہ رفتہ ہم آہنگی اور تال میل پیدا ہونا شروع ہوا جس کی وجہ سے ایک مربوط گٹھی ہوئی اور شستہ زبان پیدا ہو گئی جو سب کا مشترک سرمایہ بن گئی۔

یوں تو اس قسم کے کئی میلے لگتے تھے (۱) جن میں بعض کی حیثیت بالکل مقامی کی سی تھی، لیکن ان میں سب سے مشہور اور اثر و رسوخ حیثیت کے میلے تین تھے:

۱۔ عکاظ

۲۔ مجنہ

۳۔ ذوالمجاز

عکاظ مکہ اور طائف کے درمیان اور مکہ سے تین منزل کی دوری پر ایک گاؤں تھا۔ اس جگہ میلہ لگنے کا رواج ۵۴۰ء سے شروع ہوا۔ (۲) اور اسلام کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر میں خوارج کی لوٹ مار کی وجہ سے ۱۲۹ ھ سے اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

---

(۱) جیسے "دومۃ الجندل" کا میلہ جو یکم ربیع الاول سے شروع ہوتا تھا۔ یا ہجر، عمان، حضر موت، عدن اور صنعاء کے میلے، جن کے بعد عکاظ کا میلہ شروع ہوتا تھا۔ عکاظ کے میلہ کی تاریخ بعض مورخین نے عام الفیل کے پندرہ سال بعد بتائی ہے، اس حساب سے ۵۸۵ء تاریخ نکلتی ہے۔

(۲) اسواق اور مجالس عرب کے لیے تاریخ کی کتابوں کے علاوہ ملاحظہ ہوں: اسواق العرب۔ یعقوبی ج ۱ طبع لیدن۔ المحبر لابن حبیب طبع حیدرآباد۔ معجم البلدان یاقوت الحموی، ومعجم ما استعجم للبکری، وصفۃ جزیرۃ العرب للہمدانی، والاغانی للاصفہانی ج ۱، ۲، ۴، ۷، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، اور ۱۹ اور تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ج ۱، طبعۃ جدیدۃ تحقیق الدکتور شوقی ضیف مطبوعہ دار الہلال ۱۹۵۷ء۔

مخنۃ مجنۃ (یا محنہ) مکہ کے قریب ایک بستی تھی۔

ذوالمجاز میدان عرفات سے ایک فرسنگ کے فاصلہ پر ایک بازار تھا۔

مجالس ادب اور چوپالیں

میلوں ٹھیلوں کے علاوہ عربوں نے بعض بیٹھکیں بھی بنا رکھی تھیں، جن میں عام سماجی مسائل پر غور و خوض کے علاوہ ادبی نشستیں بھی ہوتی تھیں، ان میں شعراء اپنا کلام سناتے اور بڑے بوڑھے مسائل اور معاملات پر اپنی رائے دیتے اور فیصلہ کرتے۔ ان بیٹھکوں میں مشہور "نادی قریش" اور "دارالندوہ" تھیں جو کعبہ شریف کے سامنے واقع تھیں۔ ان کے علاوہ محلوں میں امراء کے گھروں کے سامنے خاص بیٹھکیں بھی ہوتی تھیں جہاں روزمرہ کے مسائل اور معاملات پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ بادیوں میں بھی ان مجالس اور بیٹھکوں کا رواج تھا، جہاں لوگ جمع ہو کر اپنے مسائل پر غور و خوض کرنے کے علاوہ شعر و شاعری اور حسب نسب پر مفاخرہ کرتے تھے۔

مکہ کی مرکزیت

ان میلوں ٹھیلوں اور مجالس نے زبان کو ترقی دینے اور لہجات کے اختلاف کو مٹانے میں جہاں اہم رول ادا کیا ہے، وہاں خود مکہ کی جائے وقوع، اور قریش کی حیثیت نے بھی اس سلسلہ میں اہم کام کیا ہے۔ کیونکہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے یہ علاقہ ان قافلوں کی پڑاؤ کی جگہ تھی جو ہندوستان اور یمن کا تجارتی مال لے کر جنوب سے آتے تھے۔ مکہ والے ان سے تمام مال خرید کر خود اس مال کو شام اور مصر کے بازاروں میں کھپاتے تھے۔ خانہ کعبہ کی حرمت اور قریش کی بزرگی پر تمام قبایل کے اتفاق نے مکہ کے تجارتی راستے ان کے لیے پرامن بنا دیئے تھے۔ چنانچہ قریشی اپنے تجارتی مال سے لدے ہوئے قافلے بخوبی لے جاتے تھے۔ بازاروں اور میلوں میں شرکت، ملکوں کی سیاحت، اور تجارتی سفروں نے ان کے کاروباری معلومات میں اضافہ کر دیا تھا۔ عقل اور سمجھ بڑھنے کی وجہ سے، زندگی کے دوسرے مسائل سے بھی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی پھر مالی حالت بھی سدھر گئی تھی۔ اس کے علاوہ خود مکہ عرب والوں کی ایک تجارتی منڈی بن گیا تھا، جہاں لوگ پاپیادہ اور سواریوں پر چاروں طرف سے آ کر جمع ہوتے تھے تاکہ ارکان حج (بھی) بجا لائیں اور اپنی ضرورت کا سامان (بھی) وہاں سے خرید لائیں۔

قریش کی حیثیت اور سرداری کا اثر

مختلف لہجات کے میل جول اور آپس میں الفاظ و تعبیرات کے لین دین اور انتخاب کرنے میں قریش کی حیثیت اور ان کی سرداری اور برتری کو کافی بڑا دخل ہے۔ خاندان قریش مکہ کا اصلی

— باشندہ تھا اور حسب نسب میں سب سے اونچا اور وہاں کا مالدار طبقہ۔ انہیں اپنے تمدن، خانہ کعبہ کے انتظام، دیکھ بھال، حج کی قیادت، عکاظ کے بازار پر حکمرانی، جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام کی تجارتی سفروں نے تمام عربی قبایل سے ربط و ضبط رکھنے، اور ان سے بخوبی واقف ہونے کا پورا موقع بہم پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی متفرق بولیوں اور لہجوں کو سن کر ان میں غور اور اپنی زبان سے مقابلہ کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان میں الفاظ کے پرکھنے کا اچھا خاصا ملکہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی مدد سے انہوں نے اپنے لیے ایک پیاری اور نہایت شیریں زبان منتخب کر لی تھی، جو الفاظ اور لہجوں کی خامیوں سے پاک وصاف اور نہایت درجہ دلنشیں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مواد کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ گراں قدر تھی۔ پھر شعراء و خطباء وغیرہ نے اس زبان کو اپنا کر اس کی ترویج و اشاعت اور ترقی کے راستے ہموار کر دیئے۔ اور بعد میں جب قرآن مجید بھی اسی زبان میں اترا تو اس کے کامل غلبہ اور بالادستی میں جو کمی باقی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔

عربی زبان کی امتیازی خصوصیات

کسی زبان کی اہمیت اور مقبولیت کا پیمانہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا دائرہ عمل زمین کے کتنے لمبے اور چوڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے یا اسے دنیا کی آبادی میں سے کتنی بڑی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کی کسوٹی یہ بھی ہے کہ اس کا دامن کتنا وسیع ہے۔ اس میں کتنی گہرائی اور کتنی گیرائی ہے۔ اس کے نحوی قاعدوں اور گرامر کے اصولوں میں کتنا استحکام، پختگی اور اسی کے ساتھ کتنی وضاحت ہے۔ اس کے الفاظ کتنے شیریں، اس کا پیرایہ بیان کتنا دلکش اور اس کا طریق تلفظ اور صوتی اثرات کتنے موثر اور اس کے سیکھنے سکھانے کے امکانات اور طریقے کتنے سادے اور آسان ہیں۔ جس زبان میں دائرہ عمل کی وسعت اور کثرت استعمال کے ساتھ ساتھ نحوی قاعدے (گرامر) جتنے سائنٹفک، واضح اور مستحکم ہوں گے، جس کے الفاظ جتنے شیریں اور طرز ادا جتنا دلکش اور اسلوب بیان جتنا موثر اور جس کے معانی جتنے عمیق اور گہرے ہوں گے اسی اعتبار سے زبان کی اہمیت، مقبولیت اور کارفرمائی کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس نقطہ نظر سے اگر ہم عربی زبان کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس میں یہ تمام خوبیاں پوری طرح موجود ہیں۔ اور اس وجہ سے اسے دنیا کی مروجہ زبانوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ عربی زبان کی یہی بے مثال خوبیاں اور امتیازی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے سرداران قریش باہر سے آنے والوں عربوں کے کانوں میں قرآن کی بھنک بھی نہ پڑنے دینا چاہتے تھے کہ مبادا اس کی سحر طرازی کی وجہ سے اسلام لے آئیں۔ اس زبان کی یہی خوبیاں اور امتیازی خصوصیات ہیں، جنھوں نے ڈیڑھ ہزار سال سے نہ صرف اسے بول چال کی ایک کثیر الاستعمال زبان کی حیثیت سے قائم رکھا ہے بلکہ ایک ترقی پذیر، وسیع اور دلکش ادبی وفنی زبان کے قالب میں زندہ رکھا ہے اور اس کو بدلنے یا کمزور کرنے کی مختلف کوششوں کے باوجود اس کے اثر و رسوخ اور ہمہ گیری میں

کوئی کمی نہیں آئی۔ کیونکہ اس میں زندہ رہنے، ترقی کرنے، زمانے کے ساتھ چلنے اور پھلنے پھولنے کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک زبان کو زندہ جاوید بنا دیتی ہیں۔

سامی زبانوں کی شاخوں میں عربی زبان سب سے زیادہ سائنٹفک مربوط، منضبط اور اصول و قواعد کے اعتبار سے گٹھی اور منظم زبان ہے جس کی وجہ سے اس میں چند ایسی امتیازی خصوصیات پیدا ہو گئیں جو عام طور سے دوسری زبانوں میں کمیاب ہیں۔ ان خصوصیات میں سے چند درج ذیل ہیں:

عربی زبان کی گرامر

عربی زبان کو لکھنے بولنے اور اس میں مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے جو نحوی اور صرفی قاعدے وضع کیے گئے ہیں ان کی بنیاد قرآن و حدیث کے لسانی شواہد خالص عربی قبائل میں مروج طریقوں اور مستند علماء و ادبا کے طریق استعمال پر ہے۔ اور ان کے وضع کرنے میں علمائے لغت نے بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اور مدتوں کی تحقیق و جستجو، جہاں بینی اور غور و فکر کے بعد ان کو آخری شکل دی ہے۔ اس لیے ان میں ایسا استحکام، ایسی پختگی اور تیقن کی شان پیدا ہو گئی ہے کہ تغیر و تبدل، حذف اضافہ کی مطلقاً گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ زبان کے قاعدوں کی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیکھنے سکھانے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے کیونکہ جو قاعدہ ہے وہ اپنی جگہ اٹل ہے اور اگر کہیں استثناء کی شکل ہوتی ہے تو اس کا ذکر بھی اسی جگہ کر دیا جاتا ہے اور اس قسم کی استثنائی صورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس صفت کی وجہ سے ان قاعدوں کو یاد کر کے برتنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ یوں تو عربی زبان کے قواعد ایک مستقل فن بن گئے ہیں، لیکن جہاں تک زبان سیکھنے، اس میں دسترس حاصل کرنے اور مافی الضمیر کو ادا کرنے کی ضرورت ہے اس پورے دفتر کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی۔ یہ کام تو ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو "نحو" کو بحیثیت فن سیکھنا چاہتے ہوں اور ایسے لوگوں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ عربی زبان کے ادیب یا انشا پرداز بن جائیں۔ زبان کو لکھنے بولنے اور سمجھنے کے لیے ان سب قاعدوں کو نوک زبان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے لیے تو چند گنے چنے اور متعین قاعدے یاد کر کے انہیں قلم و زبان پر رواں کر لینا ہی کافی ہے۔ اور تجربہ نے بتایا ہے کہ اس طریقہ پر عمل کر کے بعض طلبا اس ہندوستان میں بھی عربی ادب کے اچھے انشا پرداز اور خطیب بن گئے ہیں۔

عربی زبان کا اعراب

عربی زبان دنیا کی شاید ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جن میں الفاظ کی آوازوں کو علامتوں

کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس زبان کے وسیع، متمدن اور صاف ستھرے ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ عربی میں الفاظ کے صوتی شکلوں کو لکھ کر نہیں بلکہ چند اشاروں کے ذریعہ جنہیں اعراب کہا جاتا ہے، ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور اس کے لیے زیر، زبر اور پیش کی علامتیں ایجاد کی گئی ہیں۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے کے حروف کم ہو جاتے ہیں اور اس سے وقت کی بچت ہو جانے کے علاوہ ادبی ذوق اور ملکہ کی پوری طرح آبیاری ہوتی ہے کہ اگر گرامر کے قاعدے اور اصول ذہن نشین ہیں تو عبارت کو پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

نزاکت بیان

زبان میں نزاکت کا وجود خواہ وہ لفظی ہو یا معنوی یا ترکیبی، اس کی خوبصورتی اور دل آویزی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ عربی زبان اس نقطۂ نظر سے دنیا کی بڑی سامعہ نواز اور دل آویز زبانوں میں سے ہے۔ اس کے حروف تہجی میں ثقیل حروف مثلاً ژ، پھ، چھ، ڈھ، گھ، ڑھ وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے الفاظ بہت شیریں اور سامعہ نواز ہو گئے ہیں۔ غیر زبانوں کے جو الفاظ اس میں مستعار آئے ہیں انھیں عربی ذوق کا ایسا جامہ پہنا دیا گیا ہے کہ معرب ہو کر وہ بھی عربی زبان کے حسن میں ڈھل کے نکھر گئے ہیں۔ عربی الفاظ کی نزاکت بیانی کا یہ عالم ہے کہ معانی کے جزئیات بھی پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں اور کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہتا۔ جیسے دن کے ہر گھنٹہ اور پہر کے لیے ایک الگ مخصوص نام کا پایا جانا۔ یا چاندنی رات کے ہر مرحلہ کا ایک مخصوص نام۔ اسی طرح بالوں، آنکھوں اور ان کے امراض کے اور اونٹ و گھوڑے کے ذرا سے فرق کے ساتھ الگ نام اور تلوار کے اس کے صفات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ اور امتیازی نام۔ اسی طرح اس زبان میں بعض ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معانی میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ اس کا ترجمہ کئی سطروں میں آتا ہے۔ یہی حال مصادر اور ان کے مشتقات کا ہے کہ ایک ہی مصدر کی جڑ سے مختلف معانی دینے والے مختلف قسم کے افعال مشتق ہوتے ہیں۔ چنانچہ افعال میں ایک حرف بڑھا دینے سے یا گھٹا دینے سے معانی بالکل بدل جاتے ہیں۔ جیسے "طعم" (کھایا) "اطعم" کھلایا۔ اسی طرح صلات کے بدلنے سے افعال کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں جیسے "رغب الی" (کسی کی طرف مائل ہونا) اور "رغب عن" (کسی سے منہ موڑ لینا۔ نفرت کرنا)۔ عربی ادب میں صلات کے علم کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بعض علماء نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زبان دانی صرف صلات کا علم ہے۔ انسان کے اوصاف اور اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے جو موزوں ترین طریقے اور جو الفاظ عربی زبان میں پائے جاتے

ہیں شاید ان کی مثال دوسری زبانوں میں نہ ملے۔ چنانچہ صرف محبت کے جذبات اور اس کے مختلف نازک ترین مراحل کے اظہار کے لیے عربی زبان میں کم سے کم دس الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نفرت و حسد اور بخل و سخاوت اور لالچ اور ان کے مختلف مراحل کے لیے بھی متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جو ان صفات و احساسات کے جزئیات تک کو واضح کر دیتے ہیں۔

اعجاز و ایجاز

عام طور سے دنیا کی ہر زبان میں کم الفاظ کے ذریعے بہت معانی پیدا کرنے کا طریقہ رائج ہے جسے اصطلاح میں "اعجاز" کہا جاتا ہے۔ عربی زبان اعجاز کے معاملہ میں منفرد زبان ہے۔ اس میں بکثرت ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی تشریح کے لیے ایک دفتر چاہیئے۔ مثلاً لفظ "الحمد" کو لے لیجئے جس سے قرآن کی سورہ فاتحہ شروع ہوتی ہے جس کے معانی علماء یہ بتاتے ہیں کہ انعامات و احسانات کے اعتراف کے جذبہ کے ساتھ انسان نے شکر ادا کرنے کے جتنے طریقے ایجاد کئے ہیں یا ایجاد کرے گا یا سوچا ہے یا سوچ سکتا ہے وہ سب اس خدائے منعم و محسن کے لیے مخصوص ہیں۔ اس ایک لفظ میں ایسی وسعت اور شمولیت ہے کہ دفتر کے دفتر اس معنی کو ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ اور الفاظ کی یہ صفت جامعیت عربی زبان میں بہت عام ہے۔ بات کو اشاروں کے ذریعے پر لطف بنانے کے لیے کنایہ، مجاز اور اسلوب کو دلنشیں اور موثر بنانے کے لیے معانی و بدیع کا استعمال عربی زبان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

مترادفات اور اضداد کا وجود

دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ایک معنی کے ادا کرنے کے لیے کئی لفظ استعمال کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ ان الفاظ کو مترادفات "یا" مرادف الفاظ" کہا جاتا ہے۔ عربی زبان کا دامن مترادفات کے معاملہ میں بڑا وسیع ہے۔ چنانچہ علماء لغت نے صرف سال کے لیے ۲۴ نام اور روشنی کے لیے ۲۱ تاریکی کے لیے ۵۲، کنویں کے لیے ۸۸، پانی کے لیے ۱۷۰، شیر کے لیے ۳۵۰ اور اونٹنی کے لیے ۲۵۵ نام لکھے ہیں۔ اسی طرح انسانی حلیہ کے لیے اور اوصاف کے لیے بھی متعدد الفاظ آتے ہیں، چنانچہ عربی میں درازی قد کے لیے ۹۱ الفاظ، پستہ قدی کے لیے ۱۲۰ الفاظ آئے ہیں۔ اوصاف میں بخل سخاوت، شرافت، رذالت وغیرہ کے الفاظ کے لیے بھی مختلف الفاظ آئے ہیں۔

الفاظ کے معانی کے اظہار کے سلسلہ میں عربی زبان کو دوسری زبان کے مقابلہ میں یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو متضاد معنی دیتے ہیں جیسے "دون"

کا لفظ ہے کہ اس کے معنی کم، زیادہ، قریب، دور اور آگے پیچھے کے بھی آتے ہیں۔

ایک لفظ سے کئی معانی کا نکالنا

غالباً عربی زبان دنیا کی زبانوں میں اس حیثیت سے بالکل منفرد زبان ہے کہ ایک ہی لفظ بسا اوقات کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ علما لغت نے دو سو سے زائد الفاظ ایسے جمع کئے ہیں جو تین معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور ایک سو سے زائد الفاظ جو چار اور پانچ معنی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض الفاظ ۲۵ معنی دینے والے بھی ہیں۔ چنانچہ "قال" کا لفظ ۲۷ معنی کو ظاہر کرتا ہے اور "عین" کا لفظ ۳۵ معنی کو اور "عجوز" کا لفظ ۶۰ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

حکم و امثال کا وجود

کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کو دلنشیں انداز میں ظاہر کرنے کا طریقہ کم و بیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے جسے مثل یا کہاوت کہتے ہیں۔ مگر عربی زبان میں اس کی بہت کثرت اور اس میں بڑا تنوع ہے۔ عربوں کو اپنے مخصوص طرز زندگی کی وجہ سے عناصر فطرت سے براہ راست مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرز زندگی کے تجربات سے عربوں نے براہ راست نتائج اخذ کئے۔ ان نتائج کو حکمت و فلسفہ، دانشمندی و جزرسی کی آمیزش سے الفاظ کے ایسے خوبصورت قالب میں ڈھالا گیا جو صوتی اثرات کے حسن و جمال کے علاوہ معنویت میں بھی ایک بحر بیکراں تھے اور یہی قالب "ضرب الامثال" یا کہاوتیں کہلائیں۔

ان اہم اور امتیازی خصوصیات کے علاوہ عربی زبان میں "سجع" یعنی مقفی اور مرصع نثر کا طریقہ بھی رائج تھا جسے عام طور سے اسلام سے پہلے پروہت (کہان) اور مقررین بھی استعمال کرتے تھے الفاظ کے صوتی اثرات کے ذریعہ منظر کشی کرنے میں عربی زبان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس زبان میں بعض ادبا ایسے گزرے ہیں جنہوں نے الفاظ کے ذریعے کسی چیز کا ایسا نقشہ کھینچ دیا کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ جیسے ابو زبید الطائی نے حضرت عثمان کے سامنے شیر کا حلیہ اس طرح بیان کیا کہ اس کا مہیب تصور آنکھوں کے سامنے آگیا۔ (۱)

---

(۱) عبارتوں کے لیے جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغة العربیة۔ ج ۱ صفحہ ۵۵۔ ملاحظہ کیجئے ضرب الامثال کے لئے دیکھئے: فجر الاسلام۔ احمد امین۔ الفن و مذاهبه، ڈاکٹر شوقی ضیف۔ الامثال فی النثر العربی القدیم۔ عبد المجید عابدین۔ لفظ مثل دائرة المعارف الاسلامیة۔

غرضکہ عربی زبان ان گوناگوں امتیازی خصوصیات کی وجہ سے مختلف زمانوں کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی، مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق پیدا کرتی ہوئی، کبھی ان سے چھٹتی ہوئی کبھی ان سے جڑتی ہوئی نہ صرف آج تک باقی ہے بلکہ روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اپنا دائرۂ اثر و عمل بڑھا رہی ہے۔

عربی ادب کی مختلف ادوار میں تقسیم

عربی ادب، تاریخ کے مختلف مراحل اور زمانے کے مختلف نشیب و فراز سے گزر کر موجودہ صورت کو پہنچا ہے۔ جنھوں نے اسے ترقی دینے، مستحکم کرنے اور دوام بخشنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری تاریخ کو ان مراحل اور ادوار میں تقسیم کر دیا جائے جن سے گزرتا ہوا اس نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ تاکہ مطالعہ میں آسانی ہو اور نتائج کے اخذ کرنے میں اسباب و علل کے تانے بانے کے ڈھیلے پڑ جانے یا مخلوط ہو جانے کی وجہ سے غلطی نہ ہونے پائے۔

۱۔ زمانۂ جاہلیت :

اس زمانہ کو دو دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے :

پہلا دور : پانچویں صدی عیسوی سے پہلے کا زمانہ یعنی الجاہلیۃ الاولیٰ (پہلا جاہلی زمانہ) (۱)

دوسرا دور : پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے ۲۳-۶۲۲ء تک یعنی ظہور اسلام سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شروع ہوتا ہے اور ہجرت نبوی پر یعنی ۲۳-۶۲۲ء پر ختم ہوتا ہے۔

۲۔ اسلامی زمانہ :

اس زمانے کے بھی دو دور ہیں۔

---

(۱) جاہلیۃ الاولیٰ اس زمانے کو کہتے ہیں جس میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے اور الجاہلیۃ الاخریٰ دوسرا جاہلی زمانہ، اس زمانہ کو کہتے ہیں جس میں آنحضرت پیدا ہوئے طبقات ابن سعد ۸/۱۴۳-۱۴۵، اور تاریخ العرب قبل الاسلام جواد علی ۱/۴۱۔ جاہلی زمانہ کی تعریف اور بحث کے لیے دیکھیے : شعر المخضرمین و اثر الاسلام فیہ ص۸۱ اور اس سے آگے مؤلفہ ڈاکٹر یحییٰ الجبوری

پہلا دور: صدر اسلام۔
یہ دور آنحضرتؐ کی ہجرت سے شروع ہو کر آخری خلیفہ حضرت علیؓ کے دور تک رہتا ہے یعنی
سنہ ۱ہجری سے سنہ ۴۰ھ مطابق ۲۳-۶۲۲ء سے ۶۲-۶۶۱ء تک۔

دوسرا دور: عہد بنی امیہ۔
یہ دور حضرت معاویہ کی خلافت سے شروع ہو کر عباسی سلطنت کے قیام یعنی سنہ ۴۱ھ سے
سنہ ۱۳۲ھ مطابق سنہ ۶۶۱ء سے سنہ ۷۵۰ء تک رہتا ہے۔

۳۔ عباسی زمانہ:

اس زمانے کو بھی دو دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔
پہلا دور (ترقی و عروج کا زمانہ) سنہ ۱۳۲ھ سے سنہ ۳۳۴ھ مطابق سنہ ۷۵۰ء سے سنہ ۹۴۶ء تک۔
دوسرا دور (طوائف الملوکی کا زمانہ) سنہ ۳۳۴ھ سے سنہ ۶۵۶ھ مطابق سنہ ۹۴۶ء سے سنہ ۱۲۵۸ء
تک (زوال بغداد)

۴۔ عثمانی زمانہ یا عہد تنزل وانحطاط:

یہ زمانہ سنہ ۶۵۶ھ سے سنہ ۱۲۲۰ھ مطابق سنہ ۱۲۵۸ء سے سنہ ۱۷۹۸ء تک رہتا ہے۔

۵۔ عبوری زمانہ

یہ زمانہ نپولین کے مصر پر قبضہ سنہ ۱۷۹۸ء اور اس کے بعد محمد علی پاشا کے برسراقتدار
آنے یعنی سنہ ۱۸۰۵ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۱۹ء پر ختم ہوتا ہے۔

۶۔ موجودہ زمانہ:

سنہ ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر اب تک چل رہا ہے۔

عربی ادب کی تعریف

عربی ادب کی تاریخ کے مختلف مراحل میں ادب کی مختلف تعریفیں کی جاتی رہی ہیں کبھی اس میں اتنی وسعت دی گئی کہ سارے علوم و فنون کو اس میں جمع کر دیا گیا اور کبھی اس کا دامن اتنا تنگ کر دیا گیا کہ صرف نظم و نثر کی ایک مخصوص قسم کے اندر ادب سمٹ کر رہ گیا۔ چنانچہ تاریخ ادب کے ابتدائی مرحلوں میں ادب سے مراد وہ علوم لیے جاتے تھے جن کے ذریعہ سے تہذیب نفس کا کام لیا جائے جس کے نتیجے میں آدمی کے اندر اچھے اخلاق، بلند کردار، بے داغ سیرت اور معاملہ و برتاؤ میں صفائی اور ستھرائی پیدا ہوتی ہے۔

مگر جب عربی معاشرہ میں وسعت اور عربی فکر و نظر میں جلا اور گہرائی پیدا ہونے لگی تو ادب کے مذکورہ دائرہ میں تعلیم کو بھی شامل کر لیا گیا۔ چنانچہ "موؤدب" یا "معلم" اس شخص کو کہا جانے لگا جو تعلیم کو بطور پیشہ اختیار کر کے اس سے اپنی روزی کماتا ہو اور ادب میں علوم دینیہ مثلاً قرآن و حدیث اور ان کی شرح و تفسیر کو چھوڑ کر وہ سارے علوم شامل کیے جانے لگے جو یہ "موؤدب" یا "معلم" اپنے شاگردوں کو سکھاتا تھا، خواہ وہ قصے کہانیاں ہوں، شعر و شاعری ہو یا تاریخی واقعات یا انساب وغیرہ۔ حضرت علی سے روایت ہے کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ " یا رسول اللہ نحن بنو اب واحد ونراك تکلم وفود العرب بما لا نفهم اکثرہ " یعنی اے رسول اللہ ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ عربوں کے وفدوں سے ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جس کا بیشتر حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ " ادبنی ربی فاحسن

تأدیبي و ربّیتُ فی بنی سعد " مجھے میرے رب نے تعلیم دی ہے اور بہترین تعلیم دی ہے۔ پھر میں نے قبیلہ بنو سعد میں پرورش پائی ہے۔ (حلیمہ سعدیہ کا خاندان جو اس زمانے میں فصاحت و بلاغت میں قبائل عرب میں ممتاز تھا۔) یہاں پر آپ نے " ادّبنی " کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے " ادب " کا لفظ پہلی دفعہ عربی زبان میں آپ ہی کی زبان مبارک سے نکلا ہے۔ اس سے پہلے ادب کا لفظ غالباً استعمال نہیں ہوا۔ جس کے معنی بہر حال ادب یا تہذیب سکھانے کے نہیں ہیں۔ کیونکہ خود قرآن کا فیصلہ ہے کہ " انّک لعلی خلق عظیم " (یعنی آپ بڑے بلند اخلاق کے مالک ہیں) یہاں " ادّبنی " سے مراد " علّمنی " ہے یعنی مجھے تعلیم دی ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صدر اسلام میں تادیب بمعنی تعلیم کے لیے جاتے تھے۔ چنانچہ مؤدّب بمعنی معلّم بولا جاتا تھا اور عہد اموی میں بھی ممتاز اساتذہ کی جماعت کو " مؤدِّبین " کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ اس زمانہ کے دستور کے مطابق نظم و نثر اور اخبار و وقائع کی تعلیم روایت کے طریقے سے دیتے تھے۔ (۱)

ادب کا مذکورہ بالا مفہوم صدر اسلام اور پہلی صدی ہجری تک قائم رہا۔ بعد میں جب اسلامی معاشرہ میں اور وسعت پیدا ہوئی۔ مختلف قوموں کے اس میں داخل ہونے سے علم و فن میں ترقی کے ساتھ انہیں مختلف شاخوں میں متعین اصطلاحوں کے ساتھ تقسیم کیا جانے لگا تو زبان سے متعلق علوم بھی علاحدہ تقسیم کئے گئے۔ چنانچہ نحو و صرف، بلاغت، معانی، بیان، بدیع وغیرہ کے فنون پیدا ہوئے اور ان فنون کو بھی ادب میں شامل کر لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب مجموعہ فنون ہو گیا۔ جس میں زبان سے متعلق علوم و فنون کے علاوہ تاریخ، سیرت، قصے کہانیاں، انساب غرضکہ اس زمانہ تک کے تمام مروجہ علوم و فنون کے سارے ذخیرے کو ادب کے دائرہ میں کر دیا گیا اب مشکل یہ تھی کہ اگر ادب علوم و فنون کے اس تمام مجموعے کا نام ہے تو اس کی ما بہ الامتیاز خصوصیت کیا رہی؟ اس موقع پر اس زمانے کا مایہ ناز ادیب اور ممتاز عالم جاحظ اٹھا اور اس نے اعلان کیا " الادب ھو الاخذ من کل فن بطرف " تمام مروجہ فنون میں سے تھوڑے کو بقدر ضرورت استعمال کرنے کو ادب کہتے ہیں (۲) جاحظ

۱۔ فی الادب الجاہلی : ڈاکٹر طہ حسین ۔ ۲۔ اسس النقد الادبی عند العرب ۔ للدکتور احمد احمد بدوی ۔ فی الادب الجاہلی کے مقدمہ میں ڈاکٹر طہ حسین نے ادب کے معنی و مفہوم پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ محمد حسین ہیکل نے اپنے مضمون " اللغۃ الادب " میں بھی ادب سے متعلق اچھی بحث کی ہے۔

۲۔ البیان والتبیین ۔ جلد اول

نے ان تمام مروجہ علوم و فنون میں سے تھوڑے سے اور بقدر ضرورت کی قید لگا کر ادب اور ان علوم و فنون کے فرق کو واضح کر دیا ہے اور اس طرح سے کہ اگر آپ ان علوم و فنون پر تفصیل اور پوری شرح و بسط کے ساتھ بحث کرنے لگیں گے تو ظاہر ہے کہ یہ بحث یا تحریر اس فن کا حصہ ہو جائے گی کیونکہ اس میں مجرد حقائق کا بیان آ جائے گا اور مجرد حقائق بذات خود کبھی ادب کا حصہ اس لیے نہیں ہو سکتے کہ ان سے انسانی جذبات و احساسات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ عقل کو اپیل کرتے ہیں، انسانی مشاعر یا احساسات کو نہیں۔ لیکن اگر ان علوم و فنون کو ضرورت کے تقاضے کے مطابق تھوڑا سا اور ادب کے اصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ ادب کا حصہ ہو جائیں گے۔ اسی لیے جاحظ نے ادیب کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ جملہ فنون کے اصول اور مبادیات اسے ضرور آنے چاہئیں تاکہ وہ حسب ضرورت ان سے مدد لے سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر ادب میں ان تمام علوم و فنون کو شامل کرنے کی۔ خواہ کسی مقدار میں کیوں نہ ہو۔ ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی زبان میں جتنے مروجہ علوم و فنون ہوتے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی موضوع ہوتا ہے۔ مثلاً فن تاریخ ہے کہ اس کا موضوع اقوام و افراد کے واقعات کی تحقیق و جستجو اور ان کے عروج و زوال کے اسباب و علل معلوم کر کے نتیجے اخذ کرتا ہے۔ اسی طرح ادب کا موضوع انسان ہے۔ جب ادب کا موضوع انسان ٹھہرا تو ظاہر ہے کہ جو چیزیں اور جو علوم انسان سے متعلق ہوں گی وہ سب اس کے دائرہ میں آجائیںگی۔ انسان سماجی مخلوق ہے۔ یہ ایک جگہ رہتا ہے۔ لوگوں سے تعلقات رکھتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ حکومت و جہانبانی کرتا ہے۔ اس کے جسم میں ایک دماغ اور دل ہے، جو جذبات و احساسات اور مشاعر کے مرکز اور سرچشمہ ہیں چنانچہ ادب کا انسان کے ناتے سے ان سب چیزوں اور ان سب علوم سے تعلق پیدا ہو گیا اور اس طرح بالواسطہ ادب میں تاریخ، اقتصادیات، نظم و نثر، فنون جمیلہ، آرٹ اور فن سبھی علوم آ گئے اور انھیں مرقعوں سے زندگی تشکیل پاتی ہے اس طرح دوسرے لفظوں میں ادب کا موضوع درحقیقت انسان کی زندگی ہے، اور ادیب زندگی کے ان سب مظاہر یعنی فنون سے بحث کرتا ہے۔ مگر بحیثیت فن نہیں بلکہ ضمنی طور پر ایک خاص حد تک۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ خاص حد کیا ہے؟۔ وہ خاص حد یہ ہے کہ ان علوم و فنون کو اس قدر اور اس انداز سے استعمال کیا جائے جس سے پڑھنے والے یا سننے والے کے جذبات میں تغیر آجائے یعنی جس ذہنی یا جذباتی کیفیت میں اس نے اس چیز کو سنتا یا پڑھنا شروع کیا ہے اس کو ختم کرنے کے بعد وہ جذبات یا کیفیات بدل کر دوسری کیفیت اور دوسرے جذبات طاری ہو گئے ہوں۔ دوسرے لفظوں

میں یوں کہہ لیجئے کہ اگر قاری یا سامع کے جذبات میں ہیجان یا تغیر پیدا ہو گیا تو وہ چیز ادب پارہ ہو گئی ورنہ وہ فن رہ گئی۔ اور جذبات کا یہ تغیر اور ذہنی کیفیت کا یہ انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا جب تک بیان کردہ چیز میں ندرت بیان، رفعت تخیل اور دقت معانی اور جاذبیت و کشش کی ایسی کیفیت نہ ہو جو انسان کو مسحور کر دے اور معانی میں نزاکت، خیال میں رفعت، بیان میں ندرت و جاذبیت اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک اس کو حسین طریقے سے بیان کرنے کے لیے منتخب، حسین، چیدہ اور خوبصورت و موثر الفاظ اختیار نہ کیے جائیں۔ جب معانی کو ان چیدہ اور منتخب الفاظ کے ذریعہ حسین پیرایہ بیان اور دلکش انداز کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جائے گا تو اس میں جذب و کشش اور اثر اندازی کی وہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ جس کی طرف انسان کا دل خود بخود کھینچنے لگے گا۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائیگی تو اس میں اعجاز و فسوں کاری کی وہ حالت پیدا ہو جائے گی جو اس تحریر یا تقریر کو ادب کا شہ پارہ بنا دے گی۔ اسی لیے کسی تحریر کو یا تقریر کو۔ خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ ادب پارہ ہونے کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں ایسے معانی و مطالب کا ذکر ہو جو انسان کے جذبات و احساسات کو جگا دیں دوسرے یہ کہ ان معانی و مطالب کو خوبصورت، موزوں اور منتخب الفاظ کے ذریعہ بیان کیا جائے۔

یہیں سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر نحو کے قاعدوں کو نظم کر دیا جائے تو اس سے پڑھنے والے کے جذبات یا کیفیات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو گی۔ کیونکہ یہ بیان انسان کے عقل اور ذہنی کاوش کا نتیجہ ہو گا جو اس کے جذبات و احساسات کو نہیں بلکہ صرف عقل کو اپیل کرے گا۔ اسی طرح دوسرے فنون کا حال بھی ہے، کہ ان کو پڑھ کر یا سن کر انسانی جذبات اور احساسات میں ارتعاش نہیں پیدا ہوتا بلکہ صرف عقل کی آبیاری ہوتی ہے۔ اور اس لیے یہ ادب میں شامل نہیں۔ کیونکہ ان میں جذبات و احساسات میں ہیجان پیدا کرنے کی شرط مفقود ہے۔ پھر ان فنون کو بیان کرنے کے لیے آدمی خوبصورت الفاظ یا حسین پیرایہ بیان بھی نہیں اختیار کرتا جس کی وجہ سے لذت اندوزی جو احساسات کو متاثر کرنے کے لیے ضروری ہے مفقود ہو جاتی ہے اور یہ فنون اپنی ادبی حیثیت کھو دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ ہمارے کلام کا وہی حصہ ادب پارہ ہے جس میں جذبات و احساسات کو جگا دینے کی صفت ہو اور یہ خوبصورت چیدہ الفاظ کے ذریعہ دلکش اور حسین پیرایہ بیان میں ادا کیا گیا ہو اسی کو "الجید من المنظوم والمنثور" یعنی نظم و نثر کا اعلا مثالی نمونہ کہتے ہیں۔ نظم و نثر کا یہ اعلا نمونہ جسے ہم ادب العالیہ بھی کہہ سکتے ہیں نظم و نثر کی وہ قسم ہے جس کو سن کر یا پڑھ کر آدمی کے احساسات و جذبات میں ارتعاش و ہیجان پیدا ہو جائے اور وہ فرط لذت سے جھوم جائے یا

شدت کرب والم سے دل گیر ہو جائے۔ یعنی ادب عالیہ وہ تحریر یا تقریر ہے جس میں اثراندازی کی وہ شان ہو جو انسان کو اس کے موجودہ عالم سے نکال کر اس عالم میں پہنچا دے جہاں ادیب اس کو لے جانا چاہتا ہے۔ جب ہم کوئی بہترین غزل یا قصیدہ یا بہترین تقریر یا موثر کہانی سنتے یا پڑھتے ہیں تو ہمارے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ہم اس کیفیت میں نہیں رہتے جس میں اس کے سننے یا پڑھنے سے پہلے تھے۔ اس کیفیت کو ہم لذت اندوزی، طرب انگیزی، تاثر پذیری یا جھومنے سے تعبیر کرتے ہیں یہ کیفیت ہم پر بالکل اسی طرح طاری ہوتی ہے جس طرح کسی اچھے گانے کو یا موسیقی کی کسی سحر طراز نغمہ کو سن کر یا کسی خوبصورت تصویر یا دل آویز مجسمہ کو دیکھ کر طاری ہوتی ہے۔ یہ کیفیت ہم پر اس لیے طاری ہوتی ہے کہ یہ فن پارے ہمارے احساسات، جذبات، خیالات اور اس سے بڑھ کر ہمارے ذوق جمال کی آبیاری کرتے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر گوش و ہوش کے تاروں کو جھنجھنا دیتے ہیں اور ہم بے خود و مست ہو کر جھوم جھوم اٹھتے ہیں یا غم واندوہ کا موقعہ ہے تو آنکھوں سے مئے عشرت شبانہ بہانے لگتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ادیب جب کوئی منظر یا کوئی چیز دیکھتا ہے تو اس کے اثرات کو اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتار لیتا ہے پھر ان سے اپنے تجربات کی روشنی میں حسین الفاظ اور خوبصورت ترین پیرایۂ بیان سے ایک مرقع بنا دیتا ہے اور مرقع کی اثرانگیزی دوبالا کرنے کی غرض سے تخیل کی چاشنی، یا مبالغہ کی آمیزش سے کام لے کر اسے تحریر یا تقریر یا تصویر کے پیکر میں ڈھال دیتا ہے۔ جب ڈھلا ڈھلایا۔ ترشا ترشایا الفاظ کا یہ پیکر سامع یا قاری کے سامنے آتا ہے تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس میں گم ہو جاتا ہے اور اسی کو "الجید من المنظوم والمنثور" یعنی نظم و نثر میں سب سے پسندیدہ ترین حصہ کہا جاتا ہے جس کا دوسرا نام "ادب خاص" "فنی ادب" یا "ادب عالیہ" ہے جو در حقیقت جان ادب ہے۔ اثرانگیزی اور لذت افروزی کا یہی وہ بلند مقام ہے جہاں ادب صرف جادو ہی نہیں بن جاتا۔ ان من البیان سحراً ۔ بلکہ خود زندگی بن جاتا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ادیب زندگی میں ڈوب کر، اس کے تلخ و شیریں مزہ کو چکھ کر، اس کی اتھاہ گہرائیوں سے حقیقت کے موتی نکالتا ہے۔ کیونکہ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین "ادب شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے ہوئے خیالات کا نام ہے جو زندگی کی چھیڑ سے جاگتے ہیں۔ زندگی کی آنچ میں تپتے ہیں اور زندگی کے سانچے میں ڈھل کر خود زندگی بن جاتے ہیں۔ ادب کی اسی قسم کی تاریخ کا مطالعہ ہمارا موضوع ہے۔ زندگی کی انھیں حقیقتوں کا اظہار ہم اپنے خیالات کے ذریعہ کرتے ہیں اور یہ خیالات یا تو نظم میں ظاہر کئے جاتے ہیں یا نثر میں۔ اس لیے ہمارے کلام کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ نظم ۲۔ نثر

اب ہم صفحات ذیل میں ادب کے ان دونوں حصوں کا تاریخی مطالعہ کریں گے۔ پہلے نثر کا پھر نظم کا۔

تیسرا باب

جاہلی زمانہ میں نثر

نثر کی تعریف

ہم اپنے گھروں، بازاروں، دفتروں اور ملنے جلنے کی دوسری جگہوں پر اپنی روزمرہ ضروریات کو پوری کرنے، اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے زبان سے جو کچھ بولتے ہیں اسے عام طور سے نثر میں بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر انسان سوچ سمجھ کر خاص ترتیب سے اور اپنی بات میں موزونیت یا موسیقیت پیدا کر کے دوسروں سے مخاطب نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنے خیالات و افکار پیش کرنے میں فنی تسلسل کا خیال

۱۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے مولیئر کی ایک کہانی کا ذکر کیا ہے جس میں JOURDAN اپنے فلسفی استاد سے کہتا ہے کہ "میں آپ سے ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ شوق سے کہو۔ اس پر شاگرد جھجکتے کہتا ہے کہ میں ایک خوبصورت خاتون کو ایک خط لکھنا چاہتا ہوں اور اس میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔ گرو کہتا ہے کہ ہاں، ہاں شوق سے۔ مگر تم خط شعر میں چاہتے ہو؟ جوردان نے کہا جی نہیں۔ پھر نثر میں؟ گرو بولا۔ نہ نثر میں۔ جوردان نے جواب دیا۔ اس پر استاد گرو کہتا ہے کہ بھائی تمہیں نثر میں یا شعر میں سے کسی کو پسند کرنا ہی ہوگا کیونکہ کلام یا تو نثر میں ہوتا ہے یا نظم میں۔ یہ سن کر جیوا تعجب سے اپنے گرو سے پوچھتا ہے "تو گویا میں جب اپنے نوکر سے کہتا ہوں کہ ذرا میری ٹوپی یا میرا جوتا اٹھا دینا تو میں نثر میں بولتا ہوں؟ جب گرو اثبات میں سر ہلاتا ہے تو جیوا کہتا ہے کہ ارے کتنی تعجب کی بات ہے کہ میں پورے چالیس سال سے نثر بول رہا ہوں اور مجھے احساس تک نہیں کہ میں کیا بول رہا ہوں۔"

(من حدیث الشعر والنثر ص ۱۲ - مطبوعہ دارالمعارف۔ مصر)

رکھتا ہے اور نہ عقلی اور منطقی اصولوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور نہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے مطالب کو بیان کرنے کے لئے منتخب اور چیدہ الفاظ کو استعمال کرے۔ بلکہ ایسے موقعوں جس ترتیب اور موقع محل کے اعتبار سے جس انداز سے خیالات اس کے ذہن میں آتے جاتے ہیں انھیں بیان کرتا جاتا ہے۔ اس طرز تخاطب یا اس انداز سے اپنے دل کی بات کہنے کو اصطلاح میں "عام بول چال" کہتے ہیں۔ کیونکہ عام بول چال میں وہ فنی باریکیاں نہیں ہوتیں جو کسی کلام کو عام سطح سے اٹھا کر اس خاص سطح پر پہنچا دیں جہاں کلام ہماری روزمرّہ کی بول چال سے ممتاز ہو کر اس بلند اور اعلیٰ سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں سامع کے گوش و ہوش جھنجھنا اٹھتے ہیں یا کسی ابدی حقیقت کا اس پر انکشاف ہوتا ہے یا ایسی پتہ کی بات معلوم ہوتی ہے جو عام طور سے روزمرّہ کی گفتگو میں نہیں معلوم ہوتی اس لئے نثر کی اس قسم کو ادب کا درجہ حاصل نہیں۔ کیونکہ جب کسی کلام میں فنی شرائط مفقود ہوں تو وہ کسی زبان و لغت کا وہ حصہ یا جز نہیں بن سکتا ہے جسے "ادب" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے "کلام جس میں نحوی و صرفی غلطی ہو یا نحوی و صرفی اعتبار سے تو کوئی خامی نہ ہو لیکن اس میں بلند افکار و خیالات نہ ہوں۔ یا اگر ایسے خیالات و افکار ہوں بھی مگر انھیں مربوط و منظم اور سلیقہ سے اور خوبصورت و دلکش انداز میں پیش نہ کیا گیا ہو تو اسے ہم ادب کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ کسی کلام کے نثری ادب پارہ ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ ایسے مضامین، اغراض یا خیالات جن سے جذبات میں انقلاب، تغیر یا ہیجان پیدا ہو جائے۔ یعنی کلام کی اثر اندازی۔

۲۔ خوبصورت اور چیدہ الفاظ کے ذریعہ ان مضامین یا خیالات کو بیان کرنا۔

چونکہ ہماری روزمرّہ کی گفتگو میں یہ شرائط مفقود ہوتی ہیں اس لئے وہ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ لیکن اگر کسی نثر میں مذکورہ بالا شرائط پائی جائیں تو وہ ادب میں شمار ہوگا اور ایسے ادب کو ہم "نثر فنی" کہیں گے۔ کیونکہ نثر فنی اس مقصدی نثر کو کہتے ہیں جس میں وزن اور قافیہ نہ ہو لیکن وہ خاص قاعدوں، ضابطوں اور فن کے متفقہ اور معین کردہ اصولوں کے مطابق خوبصورت الفاظ اور دلکش انداز میں ادا کیا جائے تاکہ اثر اندازی کا وصف جو کسی کلام کے ادب ہونے کے لئے ضروری شرط ہے، پوری طرح ظاہر ہو۔[1]

اس قسم کے نثر کو یا تو زبان سے بولا جائے گا یا قلم کے ذریعے لکھ کر ادا کیا جائے گا۔ زبان سے

۱۔ "نثر فنی" سے متعلق ملاحظہ کیجئے: التوجیہ الادبی، طٰہٰ حسین اور النقد الادبی، احمد امین وغیرہ۔

کہا جائے تو اس کی دو شکلیں ہوں گی۔

۱۔ بول چال یا گفتگو کے ذریعہ

۲۔ تقریر یا خطابت کے ذریعہ

اور اگر قلم سے لکھا جائے تو اس کو فن "انشا پردازی" کہیں گے۔ اس وقت ہم نثر فنی کی صرف ان قسموں کو بیان کرتے ہیں جن کا تعلق زبان سے ادا کرنے سے ہے۔ "فن انشا پردازی" سے متعلق گفتگو بعد میں آئے گی۔

نثر کی پہلی قسم یعنی بول چال کے اس حصہ کے بارے میں جس میں مذکورہ دونوں شرائط پائی جائیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ عربوں نے اس کے بہت سے نمونے چھوڑے تھے۔ لیکن راویوں نے صرف انھیں کو محفوظ رکھا جو مختصر، دلکش اور موثر ہونے کے علاوہ اپنے اندر ابدی حقائق رکھتے تھے۔ جیسے حکیمانہ مقولے، کہاوتیں، بعض مختصر لیکن مثالی خطبے اور بعض قصے۔

زمانۂ جاہلی میں نثر کی قسمیں

ذیل میں ہم نثر کی مختلف قسموں کا ذکر کرتے ہیں جن کا رواج جاہلی زمانہ میں عام طور سے تھا۔ اور جن کے نمونے ہم تک کم وبیش پہنچ سکے ہیں۔

ا۔ محاورہ یا بول چال

انسان عام طور سے اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں صرف نثر سے کام لیتا ہے۔ اس کے ذریعہ اپنے کسی ساتھی یا عام مخاطب سے اپنا کوئی ذاتی معاملہ بیان کرتا ہے یا احباب یا متعدد اشخاص سے کسی مجلس میں کسی مسئلہ میں مشورہ لیتا ہے اور تبادلۂ خیال کرتا ہے اور مخاطب کی بات سن کر اس کا جواب دیتا ہے۔ یہ طرز بیان "گفتگو" یا "بول چال" کہلاتا ہے۔ اب گفتگو کرنے والے کی ذہنی سطح جتنی اونچی، ذہن جتنا صاف اور بیان جتنا مربوط اور دلکش ہوگا اسی کے بقدر سننے والے پر اس کا اثر ہوگا اور اس کی طرف سے اس کا رد عمل اچھا یا برا ظاہر ہوگا۔ عربوں کی بول چال کی زبان بھی لکھنے کی زبان سے کم دلکش اور موثر نہ تھی۔ وہ اسی فصاحت و بلاغت سے بولتے بھی تھے جس انداز سے لکھتے تھے۔ یہ فرق ضرور تھا کہ موقع محل کے لحاظ سے لکھی ہوئی عبارت میں فصاحت اور بلاغت کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ اور یہ طبعی بات بھی ہے کیونکہ لکھتے وقت دل و دماغ اس موضوع پر ہر طرح مرکوز ہوتے ہیں۔ بولنے میں یہ بات نہیں ہوتی۔ پھر بھی زمانۂ جاہلی کے عربوں کے محاورہ یا بول چال کے جو نمونے ہم تک پہنچے ہیں وہ بہت دلکش ہیں۔ ان کا اسلوب بیان اور الفاظ کی سج دھج بھی بہت موثر اور حقیقت افروز ہے۔ جیسے کہاوتیں یا حکیمانہ مقولے، نصیحتیں وغیرہ۔ بلکہ بعض مناظرے تو ایسے

ملتے ہیں کہ جن کی زبان پر گفتگو کا نہیں بلکہ کتابت کا شبہہ ہوتا ہے۔

۴۔ خطابت یا تقریر

تقریر نثر فنی کی بہترین قسموں میں شمار ہوتی ہے یہ نثر کی اس قسم کو کہتے ہیں جس میں کوئی ممتاز شخص کسی ملکی، قومی، سماجی مسئلہ یا زندگی کے کسی اہم پہلو پر کسی مجمع میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اس غرض سے کرے کہ وہ مجمع کو متاثر کر کے اپنا ہم خیال بنا لے۔

چونکہ تقریر یا خطابت کا اصل مقصد یہ ہے کہ مقرر یا خطیب کسی مسئلہ یا موضوع پر مجمع کو اپنا ہم خیال بنائے، اس لئے اسے ایسا طرز بیان اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ جس سے مجمع کے افراد اپنے خیالات و نظریات اور رایوں کو مقرر کے خیالات، نظریات اور رایوں کے مقابلے میں چھوڑ دیں اور مقرر کے ہم خیال اور ہم رائے ہو جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مقرر میں مندرجہ ذیل دو شرطیں پائی جائیں۔

۱۔ سننے والوں کو اپنے انداز خطابت اور استدلال کی قوت کے ذریعہ مطمئن کر کے اپنا ہم رائے بنانے کی صلاحیت کا پایا جانا۔

۲۔ سننے والوں کو اس بات پر آمادہ کر لینا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اسے مان لیں اور جو کرانا چاہتا ہے اسے کرنے لگیں۔ اس طرح سے مقرر کے اندر دو صفات کا ہونا ضروری ہے۔ ایک مطمئن کرنے کی صلاحیت اور دوسری سننے والوں کو اپنی طرف کھینچنے کی قدرت۔ مقرر میں جب یہ دونوں شرطیں اور صفات پیدا ہو جائیں تو یہ طرز کلام نثری ادب کا ایک فن بن جاتے گا جسے فن خطابت کہتے ہیں۔

فن خطابت کی تعریف

فن خطابت اس فن کو کہتے ہیں جس میں کوئی شخص انسانوں کے کسی مجمع میں ان کو مطمئن اور قائل کرنے یا اپنا ہم خیال بنانے کے لئے زبانی تقریر کرے۔ جب فن خطابت کی یہ غرض و غایت ہے تو خطیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ سننے والوں کی عقلی و ذہنی سطح و کیفیت سے پوری طرح واقف ہو۔ پھر جس موضوع پر بول رہا ہے اس میں اسے مہارت تامہ حاصل ہو۔ اور زبان پر ایسی قدرت ہو کہ جب بولنا شروع کرے تو اپنی قوت بیان کی جاذبیت، الفاظ کے زیر و بم و خوبصورتی، قوت استدلال کے اچھوتے پن اور ندرت سے سامعین کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہو کر وہ سب کچھ کہنے لگیں جسے مقرر ان سے کہلوانا چاہتا ہے یا وہ سب کچھ کرنے لگیں جسے مقرر ان سے کرانا چاہتا ہے۔

خطبات کی تقسیم   عربی ادب میں خطبات کی حسب ذیل تقسیمیں کی گئی ہیں۔

۱۔ سیاسی تقریریں

وہ تقریریں ہیں جو سیاسی جماعتوں کے لیڈر اور رہنما سیاسی پلیٹ فارموں پر ملک یا بیرونِ ملک کے سیاسی مسائل پر کرتے ہیں۔ یا وہ تقریریں جو ملک کے نمائندے پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیوں میں کرتے ہیں۔

۲۔ دینی تقریریں

اس صنف میں وہ تقریریں یا مواعظ آتے ہیں جو علماء لوگوں کو خدا، دین اور مذہب کی باتیں سمجھانے کے لئے کرتے ہیں۔

۳۔ قانونی تقریریں

اس ضمن میں وہ تقریریں آتی ہیں جو عدالتوں میں وکلاء اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لئے اور جج حضرات کسی مقدمہ میں اپنا فیصلہ سناتے وقت کرتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں تقریر کے محرکات ، ان کے خاص اغراض اور تقریر کے ڈھنگ

زمانۂ جاہلیت کے نثری ادب کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ خطابت کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کوئی نثر اگر صحیح معنوں میں نثرِ فنی کی حیثیت رکھتی تھی تو وہ صرف خطابت ہے۔ اس زمانے میں فنِ خطابت کے بہت سے ماہرین پیدا ہوئے جنھوں نے اس صنف میں ایسی دسترس، ایسی قادر الکلامی اور طلاقتِ لسانی کا ثبوت دیا ہے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب قوم ان پڑھ تھی۔ لکھنے پڑھنے کا عام رواج نہ ہونے کی وجہ سے اپنی بات کہنے کا ذریعہ صرف ان کی اپنی زبان تھی۔ اور یہ زبان بھی کیسی، ایسی کہ جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ دنیا کی واحد زبان ہے کہ جس میں سامعہ نوازی و دلکشی وسعت و گہرائی اور حسن و رعنائی کا وہ جوہر ہے کسی اور زبان میں نہیں ملتا۔ یہی نہیں بلکہ ان کا خیال تھا کہ دل کے لطیف محسوسات کو صحیح طریقے سے بیان کرنے کا سلیقہ صرف ان کی اپنی ہی زبان میں ہے اور یہ تو عام بات ہے کہ عرب اپنے آپ کو دنیا کی وہ تنہا قوم سمجھتے ہیں جو "ضاد" بول سکتی ہے۔ اس لئے یہ قوم اپنے آپ کو "عربی" یعنی اپنے دل کی بات زبان کے ذریعہ کہنے والی" اور دوسری قوموں کو "عجمی" یعنی "گونگی" کہتی تھی۔ اپنی زبان کے متعلق یہ زعم اس بات کا بہت بڑا محرک تھا کہ اس کے ذریعہ اپنی گفتار و تعبیر کے جوہر دکھائے جائیں۔ پھر یہ قوم منتشر اور مختلف علاقوں میں قبیلوں کی صورت میں پھیلی رہتی تھی۔ جن میں آپس میں نفرت و عداوت، قتل و غارت گری کی فضا قائم رہتی تھی۔ ایسی صورت میں اگر ان کو ایک دوسرے سے کوئی بات کہنی ہوتی تو انھیں کسی مقررہ جگہ پر جمع کرنا دشوار تھا۔ پھر رسل و

رسائل اور پیغام رسانی کے طریقے اور ذریعے بھی ناپید نہیں تو اس حد تک دشوار ضرور تھے، کہ ان کے ذریعے دور تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس لئے اگر کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا تو کسی قاصد کی ضرورت ہوتی جو زبان کا ماہر ہوتا، قوت بیان اور قوت استدلال میں کار آزمودہ ہوتا۔ اس کے علاوہ جھگڑا اور لڑائی کی معمولی سی بات پر لڑ مرنے کی وجہ سے بھی ان عربوں کو ایسے شعلہ بیان، قادر الکلام اور چرب زبان اشخاص کی ضرورت رہتی تھی جو اپنے قبیلے کے موقف کی وضاحت اس انداز سے کر سکیں کہ اس پر ظلم و زیادتی کا الزام نہ عائد ہو سکے۔ یا اگر کسی سے انتقام یا دیت (جان کے بدلے میں مال لینا) لینی ہے تو اس کے لئے سارے قبیلے کو اپنی جادو بیانی اور قادر الکلامی سے ابھار سکے۔ ان محرکات اور سماجی ضروریات کی بنا پر جاہلی زمانہ میں خطابت کو بڑی ترقی ہوئی۔ اسی لئے زمانہ جاہلیت میں خطیب اور شاعر کی بڑی قدر و منزلت تھی کہ دونوں قبیلہ کی زبان تھے۔ اور اس کی عزت و آبرو کے پاسبان اور ان کی طرف سے زبان کے ذریعے لڑنے والے سورما اور بہادر۔

تقریر کرنے کا انداز

عام طور سے عرب کسی بلند جگہ یا اپنی سواری پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر تقریر کرتے تھے۔ تاکہ آواز دور تک جا سکے، اور لوگوں کو اپنی شخصیت اور تقریر کے دوران اعضا و جوارح کے اشاروں سے متاثر کر سکیں۔ ہاتھ میں چھڑی، نیزہ، سونٹا یا کمان رکھتے تھے، جس سے ٹیک لگاتے یا حسب ضرورت اشارے کرتے تھے مقرر کے لئے ضروری تھا کہ اس کی آواز گونجدار، انداز بیان دلکش اور موثر اور استدلال قوی اور طاقت گویائی بے پایاں اور شخصیت پرکشش، پُر رعب اور پروقار ہو۔

یوں تو عربوں میں بہت سے ممتاز اور نامور مقرر گزرے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کے حالات اور کمالات کا ہمیں علم نہیں۔ پھر بھی قدیم ترین خطباء میں کعب بن لوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آبا و اجداد میں سے تھے[1] اور حرثان بن محرث جو ذو الاصبع العدوانی کے لقب سے مشہور ہیں، بہت نامور گزرے ہیں۔

۱۔ احمد ذکی صفوت نے "جمہرۃ خطب العرب" حصہ اوّل میں صفحہ ۳۲ پر ان کا ایک خطبہ اور چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ خطبہ کا انداز اور موضوع تقریباً وہی ہے جو قس بن ساعدہ الایادی کا مگر خطبے کے بعض الفاظ سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ یہ بعد کی ایجاد ہے کیونکہ آخر میں کہتے ہیں کہ "زینوا حرمکم وعظموہ وتمسکوا بہ ولا تفارقوہ، فسیاتی لہ نبأ عظیم وسیخرج منہ نبی کریم"۔ نبی کریم کے پیدا ہونے کی بشارت دینا، ور وہ بھی اتنے پہلے

بعد کے مقررین میں سے جن کو اپنی فصاحت و بلاغت میں شہرت دوام حاصل ہوئی قیس بن خارجہ بن سنان ہے جو داحس اور غبرا کی مشہور جنگ کا مشہور مقرر گزرا ہے۔ خویلد بن عمرو الغطفانی جس نے حرب فجار کے موقع پر امتیاز حاصل کیا تھا۔ قس بن ساعدہ الایادی بازار عکاظ کا مشہور مقرر، اکثم بن صیفی اور عمرو بن معدی کرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہم مذکورہ بالا خطبا میں سے صرف مندرجہ ذیل تین کے حالات زندگی، اسلوب بیان طرز خطابت اور اس فن میں ان کے رتبہ کا ذکر کریں گے۔

۱۔ قس بن ساعدہ الایادی۔

۲۔ عمرو بن معدی کرب۔

۳۔ اکثم بن صیفی۔

(باقی حاشیہ ص ۸۸)

اور پھر ایسے آدمی کی زبانی جس کی دینداری اور اللہ سے تعلق کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو، سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کو بنی ہاشم میں ہی مقدر ہونے کی دلیل میں اسے گڑھا گیا ہے۔ اس شبہہ میں تقویت ان کے اشعار سے بھی ہوتی ہے اور خاص طور سے اس شعر سے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام "محمد" تک لے لیا گیا ہے۔ حالانکہ اتنے پہلے انھیں رسول اللہ کا نام کیسے معلوم ہو گیا؟ وہ شعر درج ذیل ہے:

علی غفلة یأتی النبی محمد فیخبر أخبارًا صدوقًا خبیرها

زمانۂ جاہلیت کے نثری نمونے اور ان کے فنکار

۱۔ خطابت یا تقریر

۱۔ قس بن سَاعِدَہ أَلْاَیَادی

قس بن ساعدہ قبیلہ ایاد کا نامور خطیب اور نجران کا پادری تھا۔ اسے صرف دورِ جاہلی ہی کا مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق مقرر نہیں سمجھا جاتا بلکہ واقدی کے قول کے مطابق وہ پوری عرب قوم میں سب سے ممتاز، قادر الکلام، شعلہ بیان اور سحر طراز مقرر گزرا ہے۔ فصاحت و بلاغت اور زبان پر پوری قدرت رکھنے کی وجہ سے اس کی مثال دی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس دورِ جہالت میں یہ پہلا شخص تھا جس نے نعرۂ توحید بلند کیا اور مرنے کے بعد پھر سے اٹھائے جانے اور حساب و کتاب دینے کے عقیدہ کا پرچار کیا۔ عربوں کو بت پرستی چھوڑ کر صرف ایک خالق کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے کی دعوت دی۔ اور عام جلسوں، میلوں ٹھیلوں اور جشنوں کے موقعوں پر لوگوں کو عبرت و موعظت کے قصے اور حکمت و فلسفہ کی باتیں سنا کر ایمان و عمل اور حُسنِ اخلاق کی طرف مائل کرتا تھا۔ اور جزا و سزا کا فلسفہ سمجھا کر انہیں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتا تھا۔ لوگ اس کی نیک دلی، دانشمندی، معاملہ فہمی اور بے لوثی سے اس قدر متاثر تھے کہ اپنے پیچیدہ معاملات میں اس سے مشورہ لیتے۔ اپنے مقدمات اس کے سامنے فیصلہ کرنے کے لئے پیش کرتے اور اس کا فیصلہ سر آنکھوں سے تسلیم کرتے۔ قس بن ساعدہ ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے مقدمات میں یہ اصول نکالا کہ "البینة علی من ادعیٰ والیمین علیٰ من انکر" یعنی مدعی کے لئے جرم کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے اور جو جرم سے انکار کرے اس پر قسم لازم ہے۔ آج کل جمعہ کے خطبوں میں خاص طور سے اور عربی تقریروں میں عام طور سے حمد و ثناء کے بعد "اما بعد" کہنے کا جو رواج ہے دراصل اسے سب سے

پہلے قس ہی نے کہا تھا۔ یہ جملہ اس قدر پسند کیا گیا کہ اس وقت سے لے کر آج تک ہر تقریر کا جز بن گیا ہے اور مستقل استعمال ہو رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قس کو عکاظ کے میلے میں تقریر کرتے ہوئے سنا تو آپ اس کی خدا لگتی اور ایمان ویقین سے بھرپور باتوں کو سن کر بے حد متاثر ہوئے اور آپ نے اس کی بڑی تعریف فرمائی۔

جاحظ نے لکھا ہے کہ قبیلہ ایاد اور تمیم کے لوگوں کو تقریر میں ایسی امتیازی شان حاصل تھی کہ جو کسی اور کو نہیں۔ اور خاص طور سے قس کو اس فن میں جو مہارت اور دسترس حاصل تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے کمال فن کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عکاظ کے میلے میں قس کے مٹیالے رنگ کے اونٹ پر بیٹھ کر تقریر کرنے کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ آپ نے قریش اور عربوں سے اپنی زبان مبارک سے اس کی تقریر کی بھی روایت کی ہے۔ آپ اس کے بولنے کے دلکش انداز سے کبھی اتنے متاثر ہوتے تھے کہ دل کھول کر اس کی داد دیتے تھے، اور جو کچھ کہتا تھا اس کی تصدیق بھی فرماتے تھے کہ قس کو زبان پر یہ قدرت اور اثر اس لئے حاصل ہوا کہ وہ توحید کی دعوت دیتا تھا، اور قیامت اور جزا وسزا کے معانی بیان کرتا تھا اور خلوص ونیک نیتی پر لوگوں کو ابھارتا تھا۔[1] روایتوں میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا کہ خدا قس پر رحم فرمائے۔ مجھے امید ہے کہ وہ قیامت کے روز ایک تنہا امت کی شکل میں اٹھائے جائیں گے۔ (رحم اللہ قساً انی لارجو یوم القیامۃ ان یبعث امۃ واحدۃ)

قس بن ساعدہ قیصر روم کے پاس اکثر آیا جایا کرتا تھا۔ قیصر روم اس کے علم وفضل، حکمت وفلسفہ سے بہت متاثر تھا۔ ایک دن قیصر نے ان سے کہا کہ: سب سے بہترین عقلمندی کیا ہے؟ قس نے کہا: آدمی کا اپنے علم کی حد پر ٹھہر جانا۔ اس نے پھر پوچھا مروت (یعنی انسانی شرافت) کا بہترین نمونہ کیا ہے؟ قس نے کہا: آدمی کا اپنا بھرم قائم رکھنا۔ ———— پھر قیصر نے پوچھا: بہترین مال کیا ہے؟ قس نے جواب دیا: وہ دولت جس سے حقوق ادا کئے جائیں۔

آخر عمر میں قس نے بالکل ترک دنیا کر دی تھی۔ عبادت وریاضت میں روکھی سوکھی کھا کر زندگی گذارتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے بڑی عمر پائی تھی۔ سنہ ۶۰۰ء میں بعثت نبوت سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔

امتیازی خصوصیات

قس بن ساعدہ الایادی نے جہاں پند ونصیحت کرنے میں اچھوتا اور بہت ہی دلکش اور موثر انداز دکھایا ہے وہاں اس نے فن خطابت میں بعض ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو آج تک چل رہی ہیں ان میں

۱۔ البیان والتبیین ۱/۲۰۵، مطبوعہ لجنۃ التالیف والترجمہ، مصر ۱۹۴۹ء۔

سے ایک تو یہ ہے: اس نے سب سے پہلے "اما بعد" کہنے کی رسم ایجاد کی تھی جو آج تک جمعہ کے خطبوں میں خاص طور سے اور دوسری تقریروں میں عام طور سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ پہلا شخص ہے جس نے تقریر کے دوران چھڑی یا تلوار پر سہارا لینے کی ریت نکالی۔ یہ ریت اس قدر مقبول ہوئی کہ آج تک عرب ملکوں میں خاص طور سے مسجدوں میں خطبہ دیتے وقت امام صاحبان عصا کا سہارا لے کر ممبر پر کھڑے ہوتے ہیں۔

جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے قس کا انداز بیان بہت شستہ اور شگفتہ تھا۔ الفاظ بڑے شیریں اور منتخب ہوتے تھے۔ ترکیب بڑی دلآویز اور موثر ہوتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے لیکن انتہائی گٹھے اور نپے تلے اور بسا اوقات خوبصورت مسجع جملے کہتا تھا۔ اور بیچ بیچ میں ضرب الامثال اور کہاوتوں کا بھی استعمال بکثرت کرتا تھا۔ گزشتہ زمانے کے ظالم، جابر اور سرکش لوگوں کی کہانیاں اور ان کے انجام کی داستان سنا کر لوگوں کو متاثر کرتا اور عبرت دلاتا تھا۔ وہ لنکار اور مبالغہ آمیز باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا۔ اس لئے اس کی تقریروں میں جادو کا سا اثر ہوتا، اور حاضرین سر دھننے لگتے۔ کہتے ہیں کہ اس نے موزوں طبیعت بھی پائی تھی اور اچھے خاصے شعر بھی کہہ لیتا تھا جس میں بڑا اثر، درد اور سوز ہے۔ اس کی طرف ایک مرثیہ بھی منسوب کیا جاتا ہے، جسے اس نے اپنے دو بھائیوں کے مرنے کے بعد ان کی قبر پر جو دیر سمعان میں تھی کھڑے ہو کر کہا تھا۔ یہ مرثیہ واقعی بہت پر اثر اور دلخراش ہے، اور بقول جاحظ جس کی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔[1] جس میں اس نے کہا ہے کہ "یا ایھا الناس اسمعوا وعوا من عاش مات ومن مات فات" الخ اس کا ترجمہ یہ ہے:

اے لوگو! گوش و ہوش سے سنو! اور یاد رکھو کہ جو زندہ ہے اسے ایک دن مرنا ہے اور جو مر گیا وہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ جو چیز آنے والی ہے وہ آکر رہے گی۔ ایک گھٹا ٹوپ اندھیری رات ہے اور ایک پُرسکون انمٹ دن، ایک مختلف برجوں والا آسمان ہے اور اس میں چمکتے دمکتے ستارے (ایک طرف) ٹھاٹھیں مارتے سمندر ہیں اور دوسری طرف ٹھوس اور مضبوطی سے جمے پہاڑ اور (حد نگاہ تک) پھیلی ہوئی زمیں اور بہتے ہوتے دریا، آسمان میں کچھ چیزیں ہیں (یعنی آسمان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ کوئی بڑی ہستی خالق ہے) اور زمین میں عبرتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جاتے ہیں تو واپس نہیں آتے، کیا ان کو وہ جگہ ایسی بھا گئی ہے کہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ یا ان کو وہاں چھوڑ دیا گیا تو ہمیشہ کے لئے وہیں سو گئے۔ قس خدا کی ایسی قسم کھا کر کہتا ہے جس میں ذرہ بھر بھی گناہ کا شائبہ نہیں کہ اللہ کا ایک خاص دین ہے جس کو وہ تمہارے لئے سب

---

[1] البیان والتبیین، ۲/۳۰۸، لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، قاہرہ۔

سے زیادہ پسند کرتا ہے اور اس دین سے بہت بہتر ہے جسے تم مانتے ہو۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ قس نے اپنے قبیلہ کے سامنے ایک مختصر لیکن بڑی موثر اور عبرت و موعظت سے بھری تقریر کی جس میں گزشتہ زمانہ کے مشہور اور طاقتور قوموں اور بادشاہوں کے عبرتناک انجام کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ زمانہ نے سب کو پیس کر رکھ دیا جن کا اب نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اس کے بعد اپنے کہے یہ اشعار پڑھے،

فی الــذاھبین أولیــ ن من القرون لنا بصــائر

لما رأیت مــوارد أ للموت لیس لھــا مصــادر

ورأیت قـومی نحوھـا تمضی الأکابـر والأصاغر

لا یرجع الماضی إلیھـا ولا من البـاقین غـابر

أیقنت أنی لا محــالــة حیث صار القوم صــائر

ترجمہ۔ گذشتہ بھولی بسری صدیوں (زمانوں) میں ہمارے لئے آنکھیں کھولنے والی باتیں پوشیدہ ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ موت کی طرف جانے کا راستہ تو ہے لیکن واپس آنے کا کوئی راستہ نہیں اور یہ کہ میری قوم کا ہر چھوٹا بڑا اس کی طرف ضرور جاتا ہے۔

اور یہ کہ جو یہاں سے چلا جاتا ہے (مرجاتا ہے) وہ لوٹ کر واپس میرے پاس نہیں آتا، اور جو رہ گئے ہیں ان کو دوام حاصل نہیں تو؛

میں نے یقین کر لیا کہ میرا بھی ضرور وہی انجام ہونا ہے جو ان سب کا ہوا (یعنی مر کر یہاں سے چلا جانا ہے)

قس کو اپنے دو بھائیوں کے مرنے کا بہت غم تھا۔ اگرچہ دنیا کی بے ثباتی اور موت پر اس کا پورا یقین تھا لیکن جب دیر سمعان میں اپنے بھائیوں کی قبر پر پہنچا تو اس کے اندر کا انسان غم پنہاں کو چھپا نہ سکا، اور بڑے درد و کرب کے ساتھ پکار اٹھا۔

خلیلی ھبا طالما قد رقدتما أجدکما لا تقضیان کراکما

ألم تعلما أنی بسمعان مفرد وما لی فیھا من حبیب سواکما

اقیم علی قبریکما لست بارحا طوال اللیالی أو یجیب صداکما [1]

۱۔ الصدی۔ شدید پیاس: بڑے سر کا ایک الو جو عام طور سے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ عربوں کا خیال تھا کہ مقتول (باقی ۹۴ پر)

جری الموت مجری اللحم والعظم منکما کأن الذی یسقی العقار سقاکما
فلو جعلت نفس لنفس وقایہ لجدت بنفسی ان تکون فداکما

ترجمہ: اے میرے دونوں پیارو، اب اٹھو بھی جاؤ، تمھیں سوئے ہوئے بڑی دیر ہو گئی۔ مجھے تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ تم کبھی بھی اپنی نیند پوری نہیں کر پاؤ گے۔
کیا تمھیں یہ نہیں معلوم کہ سمعان میں میں اکیلا رہ گیا ہوں، اور تم دونوں کے سوا میرا وہاں اب کوئی ساتھی نہیں۔
اب میں تم دونوں کی قبروں پر ہی رو پڑوں گا، اور پوری راتیں یہیں بتا دوں گا۔ یا تم دونوں کی (صدا) روح میری باتوں کا جواب دے۔
موت تمھاری رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ جیسے (عقار، ایک تیز قسم کی شراب) پلانے والے نے تمھیں بھی یہ شراب پلا دی ہو۔
اگر کوئی جان کسی جان کے بچانے کے لئے دی جا سکتی تو بلاتکلف میں اپنی جان کو تم پر فدا کر دیتا۔"

اصحاب سیر کا کہنا ہے کہ قس بن ساعدہ نے نثر میں حکمت و فلسفہ اور عقلمندی کی بعض باتیں ایسی کہی ہیں جو عربی زبان میں ضرب المثل بن گئی ہیں۔ مثلاً "جو شخص تمھیں کسی چیز سے عار دلائے تو اس میں بھی وہ چیز ضرور ہو گی۔" "اگر کوئی شخص تم پر ظلم کرے گا تو اس کو بھی کوئی ظلم کرنے والا مل جائے گا۔" "اگر تم کسی کو کسی بات سے روکو تو سب سے پہلے اس کی ابتدا اپنے آپ سے کرو۔" کسی مشغول آدمی سے مشورہ مت لو چاہے وہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو۔" اور نہ کسی بھوکے سے، چاہے کتنا ہی سمجھدار کیوں نہ ہو، اور نہ کسی ڈرے ہوئے آدمی سے چاہے وہ کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو۔"

۲۔ اکثم بن صیفی

اکثم بن صیفی[1] دور جاہلیت میں زور بیان، قوت خطابت اور عقل و حکمت کے علاوہ نسب دانی

کا باقی ۹۳ کا

کے سرسے یہ الو پیدا ہوتا ہے اور جب تک مقتول کے خون کے بدلے میں قاتل کو قتل نہ کر دیا جائے اس وقت تک یہ چلا تا رہتا ہے کہ "مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ"۔ چنانچہ جاہلی شاعری میں صدیٰ کا ذکر عام طور سے خون کا بدلہ خون سے لینے پر ابھارنے کے لئے اکثر آتا ہے۔

ضرب الامثال اور اصابت رائے اور قوت استدلال میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ رواۃ نے لکھا ہے کہ اس کے جیسا قادر الکلام مقرر اور صحیح فیصلہ کرنے والا حکم اور اپنی قوم میں معزز و محترم شخص مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی دور بینی، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کی چہار دانگ عالم میں شہرت تھی۔ اس کے حکیمانہ مقولے اور پند و نصیحت کے جملے سارے عربوں کی زبان پر تھے۔

اس کی انھیں صفات کی وجہ سے النعمان بن المنذر نے کسری نوشیرواں کے پاس عربوں کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے کے لئے جن کو بھیجا تھا ان کا سردار اسی کو منتخب کیا تھا۔ حالانکہ اس جماعت میں اس زمانے کے جلیل القدر اور ممتاز ترین مقررین، جیسے عمرو بن معدی کرب، حاجب بن زراۃ التمیمی وغیرہ شامل تھے۔ چنانچہ اسی نے ہی سب سے پہلے کسری کے دربار میں تقریر کی۔ تقریر کے بعد کسری نے اکثم سے چند سوالات کئے۔ کسری اس کے جوابات سے اس قدر خوش اور متاثر ہوا کہ اس نے کہا کہ اگر عربوں کے پاس تمہارے علاوہ کوئی اور نہ بھی ہوتا تو تم ہی کافی تھے۔ اکثم نے بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ آنحضرتؐ جب مبعوث ہوئے تو اس نے اپنی قوم کو جمع کیا اور آپ پر ایمان لانے کی تلقین کی، لیکن خود اس کے اسلام لانے کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں[2]۔

۱- پورا سلسلۂ نسب یہ ہے، اکثم بن صیفی رباح بن حارث بن مخاشن بن معاویہ بن شریف بن جروہ بن اسید بن عمرو بن تمیم التمیمی۔

اکثم صیفی کے لئے ملاحظہ کیجئے۔ البیان والتبیین، جاحظ ۳/۳۵۰

الاصابۃ فی أحوال الصحابہ۔ ص ۳۴۳۔ المعرین للسجستانی۔ ص ۱۲۔

۲- ایک روایت یہ ہے کہ جب انھیں آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے کی خبر ملی تو انھوں نے خود آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا لیکن ان کی قوم نے ان کو روک دیا تو انھوں نے اپنی قوم میں سے دو آدمیوں کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ وہ دونوں آپ کی باتیں سن کر آئے اور انھیں اکثم سے بیان کیا، تو انھیں سن کر ان کے دل کو بڑی ٹھنڈک پہنچی۔ چنانچہ ان کا اونٹ لایا گیا اور وہ حضورؐ سے ملنے کے ارادے سے نکل پڑے مگر راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل آیت انھیں کے بارے میں آتری تھی۔ "ومن یخرج من بیتہ مہاجرا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ" یعنی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی خاطر نکل کھڑا ہوا، پھر اسے موت آجائے تو اللہ کے ذمہ اس کا اجر یقینی ہو گیا ——— اور یہیں سے بعض راویوں کا خیال ہے کہ وہ مسلمان مرا۔

خصوصیات

اکثم بن صیفی اپنی تقریروں میں مجاز وکنایہ کم استعمال کرتا تھا۔ اس کو مختصر اور چھوٹے جملے کہنے میں کمال حاصل تھا۔ اس کی تقریروں میں الفاظ بہت خوبصورت اور سبک، معانی بہت گہرے اور دور رس ہوتے تھے۔ اکثر ضرب الامثال استعمال کرتا۔ سننے والوں کو مطمئن کرنے کے لئے زوردار دلیل لاتا اور ان کو متاثر کرنے کے لئے اپنا پوراز ور بیان، اپنی فصاحت وبلاغت اور اپنی شخصیت کا جلال وجمال صَرف کر دیتا۔ لیکن مبالغہ یا دوراز کار باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا۔ انھیں خصوصیات کی وجہ سے وہ جاہلی دور کے مقررین کے صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے کسریٰ کے دربار میں النعمان کے ایماء پر جو تقریر کی تھی وہ اس کے اسلوب بیان اور اندازِ خطابت کا مثالی نمونہ ہے جس میں اس نے کہا تھا :

ان افضل الاشیاء اعالیھا ۔۔۔۔۔۔۔[1]

ترجمہ۔ (دنیا کی) چیزوں میں سب سے بہتر اور افضل وہ ہیں جو سب سے اعلیٰ ہوں، اور لوگوں میں سب سے اونچے اور ارفع ان کے بادشاہ ہیں۔ اور بادشاہوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جن کے ذریعہ نفع عام ہو اور زمانوں میں سب سے بہتر خوشحالی اور ہریالی کا زمانہ ہے۔ اور مقررین میں سب سے بہتر حق گو ہیں۔ سچائی نجات کا ذریعہ ہے اور جھوٹ تباہی کا گڈھا ہے، برائی کی جڑ اس میں پڑا رہنا ہے۔ عقلمندی اور دانشمندی کی راہ بڑی کٹھن راہ ہے۔ اور عاجزی وانکساری کی راہ بڑی آسان راہ ہے۔ خود رائی کا روگ خواہشات نفسانی ہیں اور کچھ نہ کرسکنا (بے عملی) غریبی کی کنجی ہے۔ سب سے اچھی بات صبر کرنا ہے اور اپنے سے (حسنِ ظن) میں ہلاکت ہے، اور سوءِ ظن میں حفاظت ہے۔ رعایا کی خرابی کی اصلاح کرنا بادشاہ کی اصلاح کرنے سے بہتر ہے۔ جس کے خاص دوست اور ہم راز بُرے ہوں تو اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جسے پانی سے پھندا لگ گیا ہو۔ بدترین ملک وہ ہے جہاں کوئی بادشاہ نہ ہو اور بدترین بادشاہ وہ ہے جس سے بے گناہ لوگ ڈریں۔ آدمی خود سپر ڈال دے ایسے تدبیر نہیں ہارتی۔ بہترین فوجوں میں فتح کی سب سے زیادہ مستحق وہ فوج ہوتی ہے جس

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے :

(۱) جمہرۃ رسائل العرب فی العصور العربیۃ الزاہرۃ۔ جلد اول۔ احمد زکی ۱۹۳۷ء۔

(۲) جمہرۃ خطب العرب فی العصور العربیۃ الزاہرۃ۔ ۱/۲۱۔ (۱۹۳۳ء)

(۳) العقد الفرید، لابن عبد ربہ، الجزء الاوّل۔

کے اخلاق وعادات پاکیزہ ہوں۔ تمہارے لئے زادِ راہ اتنا ہی کافی ہے جس سے منزلِ مقصود تک پہنچ سکو۔ کسی بُرائی کا صرف سن لینا ہی کافی ہے۔ خاموشی عقلمندی ہے لیکن اسے اپنانے والے بہت کم ہیں۔ بلاغت درحقیقت اختصار کا نام ہے۔ جو سخت کوشی کرتا ہے اس سے لوگوں کو نفرت ہو جاتی ہے اور جو سہل انگاری سے کام لیتا ہے لوگوں کو اس سے الفت ومحبت ہو جاتی ہے۔[2]

اکثم صیفی سے بعض وصیتیں اور رسائل بھی منسوب کئے جاتے ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہاں موقع نہیں۔[1]

۳۔ عمرو بن معدی کرب الزبیدی

عمرو بن معدی کرب کی کنیت ابو ثور تھی۔ قبیلہ زبید کا فرد تھا۔ سلسلۂ نسب یمنی قبیلہ قحطان سے ملتا ہے۔ بہت اچھا گھوڑ سوار تھا، اس لئے اسے فارس الیمن یعنی یمن کا شہسوار کہتے تھے۔ ۹ھ ہجری میں جب آنحضرتؐ غزوۂ تبوک سے واپس آرہے تھے تو عمرو اپنی قوم کے ساتھ آپ سے ملا اور اسلام لے آیا۔ لیکن چونکہ زندگی گزری تھی کسی اور ڈھب سے جس میں دن معرکوں میں اور راتیں کاشانوں میں گزرتی تھیں۔ اس لئے قید وبند کو قبول نہ کر سکا اور مرتد ہوگیا۔ لیکن پھر حق نے اس کے دل میں روشنی پیدا کر دی اور دوبارہ مسلمان ہوگیا اور اسلام کی راہ میں کئی جنگوں میں شریک ہوا۔ اسلام کی مشہور جنگ قادسیہ میں بھی شریک ہوا تھا۔ اور بقول رواۃ اس وقت اس کی عمر ایک سو دس سال سے بھی زیادہ تھی۔

امتیازی خصوصیات

کہتے ہیں کہ عمرو بن معدی کرب بھاری بھر کم طاقتور اور خوش خور آدمی تھے۔ سب لوگ ان کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ تلوار کے دھنی ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے بھی دھنی تھے۔ مقررین کی صفِ اول میں اور شعرا کی دوسری صف میں شمار کئے جاتے تھے۔ خطابت میں بڑا زور تھا۔ تقریر کرتے وقت عام طور چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرتے تھے۔ بلاتکلف اگر سجع آجاتا تو سجع اپنی تقریر کو پُراثر بناتے۔[2] زندگی کے تجربوں اور ضرب الامثال اور اشارہ کنایہ سے اپنی تقریر کو موثر، دلکش اور دلنشین بناتے۔ اکثر خالص بدوانہ اور مشکل الفاظ استعمال

۱۔ جمہرۃ رسائل العرب اور جمہرۃ خطب العرب، احمد زکی صفوت جلد اول میں اس کی وصیتیں اور رسائل درج ہیں۔

۲۔ جاحظ نے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن معدی کرب سے سعد بن ابی وقاص والیِ کوفہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جو جواب دیا ہے وہ ان کی خوبصورت اور دلکش مسجع کلام کا بہترین نمونہ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ البیان والتبیین جلد اول وثانی اور جلد چہارم۔

کرتے تھے۔ اشعار میں عام طور سے اپنی بہادری و شجاعت اور زبان پر قدرت کا ذکر کر کے فخر کرتے۔ شاعری میں انداز بیان بہت خوبصورت، دل نشین، غریب و ثقیل الفاظ سے پاک و صاف ہے۔ جاحظ نے کئی موقعوں پر ان کے کلام سے استدلال کیا ہے۔[1]

کہتے ہیں کہ نعمان بن المنذر نے انھیں عمائدین عرب کی ایک جماعت کے ساتھ انوشیروان کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ یہ لوگ اپنے زورِ بیان کو دکھلا کر عربوں کی زبان دانی، شرافت و فضیلت اور مروت کے بارے میں اس کے دعووں کی تصدیق اور ان پر اس کے فخر کو حق بجانب ثابت کریں۔ چنانچہ عمرو بن معدی کرب نے انوشیروان کے سامنے حسب ذیل مختصر اور جامع تقریر کی۔

انما المرء باصغریه، قلبه ولسانه، فبلاغ المنطق السداد وملاک النجع الارتیاد وعفو الرای خیر من استکراه الفکرة .... الخ[2]

ترجمہ۔ آدمی اپنی دو چھوٹی چیزوں سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک اس کا دل اور دوسری اس کی زبان۔ طاقت گویائی کی معراج حق گوئی ہے چراگاہ پانے کی کنجی تلاش و جستجو ہے۔ (یعنی مقصد بلا دوڑ دھوپ کے حاصل نہیں ہوتا) جو بات دل میں سب سے پہلے بغیر کچھ سوچے بچارے آجائے وہ ذہن پر زور دے کر قائم کی ہوئی رائے سے بہتر ہے۔ تجربات کی روشنی، حیرت و پریشانی کے اندھیارے سے بہتر ہے۔ تو آپ ہماری اطاعت کو اپنے الفاظ کے ذریعے کھینچ لیجئے اور جلد بازی میں ہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے اپنی بردباری سے برداشت کیجئے۔ آپ ہمارے لئے اپنے شانے نرم کریجئے (نرم خوئی اختیار کیجئے) تو آپ کے لئے ہماری رہنمائی کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم ایسے لوگ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمیں تباہ و برباد کر دینے کے ارادے سے لوہے کے ٹکڑے کو (یعنی ہتھیاروں کو) کھنکھٹائے تو اس سے ہماری عادات و اخلاق پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ ہم نے اپنی چراگاہ کی ہر اس شخص سے حفاظت کی ہے جو ہمیں ہڑپ کر جانا چاہتا ہے۔

۱۔ جمہرۃ خطب العرب الاول، احمد ذکی صفوت، الاغانی لابی فرج الاصفہانی۔
الشعر والشعرا لابن قتیبہ۔ خزانۃ الادب للقیروانی، اسد الغابہ
الاصابۃ فی احوال الصحابہ، العقد الفرید جلد اول، الاستیعاب۔

۲۔ تفصیل کے لئے جمہرۃ خطب العرب اول دیکھئے۔

عمرو بن معدی کرب نے بھرپور اور بامقصد زندگی گزار کر حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں انتقال کیا۔

۲۔ وصیتیں

"وصیت" ان چھوٹے چھوٹے مگر حکمت و فلسفہ اور عقلمندی کے جملوں کو کہتے ہیں جو کوئی شخص اپنے قریب، کسی عزیز، دوست یا جاننے والے سے بربنائے خلوص کسی خاص موقع پر اس نیت سے کہے کہ اسے کسی کام سے نقصان پہنچنے کے ڈر سے باز رکھے یا نفع کی امید میں کوئی کام کرنے کی ترغیب دے۔ یہ ضروری نہیں کہ وصیت مرنے سے پہلے ہی کی جائے۔ جیسا کہ ہماری اردو زبان میں اس اصطلاح کا مفہوم "مرنے والے" کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ عربی میں وصیت بالکل نصیحت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جو مرنے والے اور زندہ آدمی دونوں کے لئے مستعمل ہے

دور جاہلی میں جن لوگوں نے دلکش اور موثر انداز بیان میں مفید اور نفع بخش باتوں کی تلقین کی، ان میں زہیر بن جناب الکلبی اور ذوالاصبع العدوانی خاص طور پر مشہور ہیں۔ جاہلی نثر میں وصیتوں کو بھی فصاحت و بلاغت، جامعیت اور معنویت میں ایک خاص مقام حاصل ہے ذیل میں چند وصیتوں کے ترجمے بطور نمونہ دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ زہیر بن جناب الکلبی

زہیر بن جناب الکلبی نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ "اے میرے بیٹو! میری عمر بہت لمبی ہو چکی ہے اور اپنی زندگی کی ساری خواہشات کو پورا کر چکا۔ زندگی کے معاملات اور کاموں سے جو تجربات میں نے حاصل کئے ہیں، انھوں نے مجھے کندن بنا دیا ہے۔ اس لئے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو اور اچھی طرح یاد رکھو۔ خبردار! مصیبت کے وقت ہمت مت ہارنا۔ اور نہ پریشانی میں کسی کا سہارا ڈھونڈنا۔ کیونکہ یہ بات غم کو بلاتی ہے اور دشمنوں کو خوش ہونے کا موقع دیتی ہے۔ اور اپنے آپ سے بدگمانی پیدا کرتی ہے۔ خبردار! حوادث زمانہ کی طرف سے کبھی غافل نہ رہنا اور نہ اپنے کو ان سے محفوظ و مامون سمجھنا۔ اور نہ کبھی ان کا مذاق اڑانا۔ کیونکہ جب کبھی کسی قوم نے ان کا مذاق اڑایا ان سے دوچار ہوئے۔ مگر تم ان سے دوچار ہونے کی توقع رکھے رہنا۔ کیونکہ انسان اس دنیا میں اس نشانہ جیسا ہے جس پر تیر پھینکنے والے نشانہ بازی کیا کرتے ہیں، تو بعض تیر چوک جاتے ہیں اور بعض اس کی جگہ کو پار کر جاتے ہیں اور بعض اس کے داہنے اور بائیں پڑتے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ایک دن اس کو نشانہ بنا لیں۔" [1]

۱۔ جمہرۃ خطب العرب، جلد اول، امالی السید مرتضی، جلد اول۔

۲۔ ذو الاصبع العدوانی

مرتے وقت ذو الاصبع العدوانی نے اپنے بیٹے اسد کو بلایا اور یہ وصیت کی ۔ اے میرے بیٹے! بیشک تمھارا باپ زندگی میں ہی ختم ہو چکا تھا اور اس قدر کہ زندگی سے اکتا گیا تھا۔ میں تمھیں ایسی باتوں کی نصیحت کر رہا ہوں کہ اگر تم نے انھیں یاد رکھا تو تم بھی اس مرتبہ کو پہنچ جاؤ گے جس مرتبہ کو میں پہنچ چکا ہوں۔ اس لئے تم میری طرف سے یہ باتیں اچھی طرح یاد رکھو کہ تم اپنی قوم سے نرمی کا برتاؤ کرو وہ تم سے محبت کرے گی۔ ان سے خاکساری سے ملو، وہ تم کو بلند رتبہ دے گی۔ ان سے خندہ پیشانی سے ملو، وہ تمھاری فرمانبرداری کرے گی۔ ان کے مقابلہ میں کسی چیز کو ترجیح نہ دو، وہ تمھیں سردار بنائے گی۔ انکے چھوٹوں کا بھی ایسا ہی احترام کرو جیسا کہ ان کے بڑوں کا کرتے ہو، تو ان کے بڑے تمھارا احترام کریں گے۔ اور چھوٹے تمھاری محبت پر پروان چڑھیں گے۔ اپنے مال سے سخاوت کرو۔ اپنی عورتوں کی حفاظت کرو، اور اپنے مہمان کی عزت کرو۔ اور جو مصیبت کے وقت مدد کے لئے پکارے، اس کی مدد کے لئے فوراً اٹھ کھڑے ہو۔ اس لئے کہ تمھاری موت کا وقت مقرر ہے۔ جو ٹل نہیں سکتا۔ کسی سے کوئی چیز مانگنے سے اپنی عزت بچائے رکھو۔ اس طرح تمھاری سرداری مکمل ہو جائے گی!

ایک دیہاتی عورت (اعرابیہ) نے اپنی لڑکی کو شب زفاف میں اس طرح نصیحت کی۔

اے میری لاڈلی! اگر زیادتی علم و ادب کی بنا پر نصیحت نہ کی جاتی ہوتی تو میں تمھیں نصیحت نہ کرتی لیکن نصیحت سے غافل آدمی کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور عقلمند آدمی کو اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اگر کوئی عورت ماں باپ کی مالداری اور انھیں اس کی شدید ضرورت ہونے کی وجہ سے شوہر سے مستغنی ہو سکتی، تو یقیناً تم لوگوں میں سب سے زیادہ مالدار ہوتیں۔

اے میری بچی! تم وہ ماحول چھوڑ کر جس میں پلی بڑھی تھیں اور اس آشیانہ کو خیر باد کہہ کر جس میں تم رہی بسی تھیں، ایسے آشیانے میں جا رہی ہو جسے تم نہیں جانتی ہو اور ایسے ساتھی سے مل رہی ہو جس سے اب تک تمھارا کوئی واسطہ نہیں پڑا ہے۔ اس لئے میرے پاس سے دس عادتیں لیتی جاؤ کہ تمھارے آڑے وقت میں کام دیں گی۔

قناعت کے ساتھ اس کے ساتھ رہنا اور فرمانبرداری اور اطاعت سے اُس کے ساتھ زندگی گذارنا۔

۱۔ جمہرة خطب العرب، جلد اوّل، احمد ذکی صفوت، الاغانی الاصفہانی، ج ۳۔

اور اس کی نگاہ پڑنے کی جگہ کو دیکھتی رہا کرنا۔ اور اپنی کسی برائی پر اس کی نگاہ نہ پڑنے دیا کرنا۔ اس کے بعد اس کے کھانے کے وقت کو اچھی طرح جان لینا اور اس کے سونے کے وقت پرسکون رہا کرنا۔ کیونکہ بھوک کی آگ مزاج کی تیزی کو بڑھا دیتی ہے، اور نیند کو خراب کر دینا بغض پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ رنجیدہ ہو تو اس کے سامنے خوشی کے اظہار سے اور جب خوش ہو تو غم کے اظہار سے پرہیز کرنا۔ کیونکہ پہلی عادت اس کے حق میں کوتاہی ہے اور دوسری عادت سے بے کیفی پیدا ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی تعظیم کیا کرنا تو وہ سب سے زیادہ تمھاری عزت کرے گا۔ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اپنی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں میں جب تک اپنی مرضی کے مقابلہ میں اس کی مرضی کو ترجیح نہ دو گی، اس وقت تک اپنی مراد حاصل نہیں کر سکو گی۔ اور اللہ تمھارا بھلا کرے [1]

۳- کہاوتیں (ضرب الامثال)

کہاوت اس جملہ کو کہتے ہیں جو کسی خاص موقع پر کسی خاص بات کو مختصر لیکن جامع طریقے سے بیان کرنے کے لئے کہا گیا ہو اور وہ جملہ خاص وعام میں مقبول ہو کر زبان پر چڑھ گیا ہو۔ عربی زبان کی کہاوتوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ بخلاف شعر انھیں صرف پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں ہی نے نہیں کہے ہیں بلکہ عوام نے بھی حکیمانہ کہاوتیں کہی ہیں۔ اسی لئے بعض کہاوتوں میں لفظ ومعنی کا وہ حسین امتزاج نہیں ہے جو عام طور سے ان کہاوتوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یعنی ان میں وہ خوبصورت اور دقیق معنی نہیں جو پڑھے لکھے اور مہذب طبقہ کے افراد کی کہاوتوں میں ملتے ہیں۔ جیسے "اول ما اطلع ضب ذنبہ"۔ اسی لئے بعض کہاوتوں کے معنی الفاظ سے نہیں، بلکہ بطریق سماع معلوم ہوتے ہیں جیسے "بعین ما ارینک"۔ ابو الہلال العسکری نے اپنی کتاب جمہرۃ الامثال میں اس کے معنی جلدی کر دکے بتائے ہیں۔ جو الفاظ سے نہیں ملتے۔ محض سن کر یہ معنی معلوم ہوتے۔

عربی زبان میں کہاوتیں دو طرح کی پائی جاتی ہیں۔ حقیقی یعنی جنھیں انسانوں نے کہی ہیں اور فرضی جو جانوروں کے منہ سے ادا کرائی گئی ہیں۔ جانوروں کے منہ سے کہاوتیں کہلانے کا رواج اس وقت پڑا جب معاشرہ میں حکمران طبقہ اور سربرآوردہ لوگوں کی ظلم وزیادتی بڑھ گئی اور مفکرین ومصلحین کو اس کا خطرہ پیدا ہوا کہ اگر انھوں نے اپنی زبان سے اس قسم کے جملے کہے جن کی چوٹ حکمراں طبقے پر یا سربراہ مملکت پر پڑے گی تو وہ ان پر ظلم وزیادتی کریں گے۔

کہاوتوں (ضرب الامثال) کے علاوہ جاہلی نثر کے نمونوں میں پہیلیاں اور بوجھ بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ

۱- جمہرۃ خطب العرب، مجمع الامثال للمیدانی، ج ۲ - العقد الفرید لابن عبدربہ، ج ۳.

نقاد اور تذکرہ نگاروں نے انکی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور انھیں جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ پہیلیاں اور بجھاوتیں مختلف کتابوں میں بکھری پڑی ہیں۔ جیسے عبید بن الابرص اور امرؤالقیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عبید نے امرؤالقیس سے شعر میں پہیلی کہی اور اس کا جواب اس نے شعر میں دیا۔ عبید نے کہا۔

ماحیۃ میتۃ قامت بمیتتہا   درداء ما انبتت نابا و اضراسا

یعنی وہ کونسی زندہ اور مردہ چیز ہے جو اپنی لاش کے سہارے کھڑی رہتی ہے اور جھونے میں کھردری ہے لیکن نہ اس کے دانت ہیں اور نہ ڈاڑھ۔

امرؤالقیس نے اس کی بوجھ بتائی۔

تلک الشعیرۃ تسقی فی سنابلہا   قد اخرجت بعد طول المکث اکداسا[1]

وہ جو ہے جو اپنی بالیوں کے ذریعہ پانی پیا کرتا ہے اور ایک مدت تک زمین میں پڑے رہنے کے بعد ڈھیر کے ڈھیر دانے پیدا کرتا ہے۔

یا امرؤالقیس کی یہ قسم کہ وہ صرف اس لڑکی سے شادی کرے گا جو اس کی یہ پہیلی "ماثمانیۃ واربعۃ واثنین" (یعنی ۸۔۴ اور ۲ کیا ہیں) بوجھ لے گی اب تک جتنی لڑکیوں سے اس نے یہ پہیلی بجھائی تھی۔ سب نے کہا کہ چودہ (۱۴) چنانچہ وہ ایسی لڑکی کی تلاش میں چلا جا رہا تھا کہ اس نے ایک آدمی کے ساتھ ایک بہت ہی خوبصورت کمسن لڑکی دیکھی۔ اس سے وہی پہیلی پوچھی، تو اس نے جواب دیا: "آٹھ تو کتیا کے تھن ہیں چار اونٹنی کے تھن اور دو عورت کی چھاتیاں"۔[2] چنانچہ رواۃ نے لکھا ہے کہ امرؤالقیس نے لڑکی کے باپ سے رشتہ مانگا اور شادی کر لی۔

ذیل میں زمانہ جاہلی کی چند منتخب کہاوتیں دی جاتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں نے زندگی

۱۔ اسی طرح اس کا وہ شعری مقابلہ بھی قابل ذکر ہے جو اس کے اور الحارث بن التوأم الیشکری کے درمیان ہوا تھا جس میں امرؤالقیس نے شعر میں پہیلی کہی، اور اس کا جواب حارث نے بھی شعر ہی میں دیا۔ دیکھئے مذکورہ بالا کتابیں۔ اس کے علاوہ شعراء النصرانیۃ شیخو الیسوعی میں بھی امرؤالقیس کے شعری مقابلوں کا تفصیلی ذکر ہے۔ ابوعمرو نے روایت کی ہے کہ ابن التوأم نے جب اسے زچ کر دیا تو اس نے قسم کھائی کہ اب کبھی کسی شاعر کے منہ نہ لگے گا۔ مگر جدید تحقیق یہ ہے کہ یہ شعری مقابلے اور یہ شعری پہیلیاں من گھڑت چیزیں ہیں۔ کیونکہ ان میں ایسی باتوں کا ذکر ہے اور ایسی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جو اس زمانے میں رائج نہ تھیں۔ بلکہ ان کا رواج بعد میں اسلامی زمانے میں ہوا۔

۲۔ فقالت "اما ثمانیۃ فاطباء الکلبۃ واما اربعۃ فاخلاف الناقۃ واما اثنتان فثدیا المرأۃ": کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے بھی اس سے کچھ شرطیں رکھی تھیں اور اس سے کچھ پہیلیاں بجھوائی تھیں۔ ان قصوں کے لئے الاغانی للاصفہانی اور مجمع الامثال للمیدانی اور المعلقات العشر و اخبار شعرائھا للشیخ احمد بن الامین الشنقیطی دیکھئے۔

اور تجربات سے ایسی جامع ومانع اور موثر کہاوتیں وضع کی ہیں جو آج تک اپنی معنویت اور جامعیت میں نمونہ اور عربی ادب کی جان ہیں۔ اور آج بھی ان کے استعمال سے کلام میں حسن اور معنی میں گہرائی اور اعجاز پیدا کیا جاتا ہے:

۱- "ان البغاث بارضنا تستنسر" یعنی کمزور چڑیاں بھی ہماری زمین میں گدھ جیسی طاقتور بن جاتی ہیں۔ یہ مثل ایسے موقع پر کہی جاتی ہے جب کمزور آدمی طاقت اور قوت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ گھٹیا آدمی بڑا بن جائے جیسے اردو میں کہتے ہیں: "بلی بھی اپنے دروازے پر شیر ہوتی ہے"

۲- "رب رمیۃ من غیر رام" یعنی کبھی تیر اندازی نہ جاننے والے کا تیر بھی ٹھیک نشانہ پر لگ جاتا ہے اسے سب سے پہلے ابن عبدالغوث النقری نے کہا تھا۔ یہ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب ہمیشہ غلطی کرنے والا کبھی صحیح بات کہہ جائے یا صحیح کام کر جائے۔ جیسے اردو میں "اندھے کے ہاتھ بٹیر"

۳- "الحدیث ذو شجون" یعنی یہ بات مختلف راستوں والی ہے۔ اسے ضبعہ بن ادبن طابخہ نے کہا تھا۔ جیسے اردو میں: "بات سے بات نکلتی ہے"

۴- "ان العوان لا تعلم الخمرۃ" شادی شدہ عورت کو دوپٹہ اوڑھنا نہیں سکھایا جاتا۔ یعنی بوڑھے لوگوں کو ادب تمیز نہیں سکھائی جاتی، جیسے بوڑھے طوطے نہیں پڑھائے جاتے۔ اس مثل کو ایسے موقع پر بھی بولتے ہیں جب کوئی کم علم والا بڑے عالم یا تجربہ کار بزرگ کے سامنے باتیں بنائے جیسے اردو میں کہتے ہیں "چھوٹا منہ بڑی بات"

۵- "سبق السیف العذل" تلوار ملامت سے سبقت لے گئی۔ اسے ضبعہ بن ادبن طابخہ نے کہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت گزرنے کے بعد تلافی ممکن نہیں۔ جیسے اردو میں "تیر کمان سے نکل گیا" یا "اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

۶- "ان کنت ریحا فقد لاقیت اعصارا" یعنی اگر تم ہوا تھے تو گرد باد یعنی بگولے سے تمہارا سابقہ پڑ گیا۔ یہ اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو اپنے آپ کو بہت زیادہ چالاک اور ہوشیار سمجھتا ہو لیکن اس کا پالا اس سے بھی چالاک اور ہوشیار آدمی سے پڑ جائے۔ جیسے "سیر کو سوا سیر" یا "جیسے کو تیسا"

۷- "رمتنی بدائها وانسلت" یعنی اپنی بیماری میرے اوپر تھوپ کر کھسک گئی۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی آدمی اپنی غلطی یا برائی کو دوسرے کے سر منڈھنے کی کوشش کرے، جیسے اردو میں کہتے ہیں: "ناچ نہ آوے آنگن ٹیڑھا"

۸- "انک لا تجنی من الشوک العنب" یعنی تم کانٹوں سے انگور نہیں توڑ سکتے۔ یعنی کسی برے آدمی

سے بھلائی کی امید نہیں کی جا سکتی یا کسی بُری جگہ سے خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جیسے نیم نہ میٹھا ہوئے سینچو گڑ گھی سے۔

۹۔ "ذکرنی فوت حماری اہلی": تیرے منہ نے میرے گھر کے دونوں گدھے یاد دلا دیئے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب امید و توقع کے خلاف کوئی بات ہو جائے۔ اس کہاوت کو ایک آدمی نے کہا تھا، اس کے دو گدھے کھو گئے تھے، وہ ان دونوں کو ڈھونڈنے نکلا۔ راستے میں ایک عورت دکھائی دی، اور اسے بھا گئی۔ چنانچہ گدھوں کو بھول کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد راستے میں جب اس نے اپنا منہ کھولا اور اس آدمی نے اس کا بدصورت چہرہ دیکھا تو یہ مثل کہی۔ جیسے اردو میں کہتے ہیں" ڈھول میں پول"۔

۱۰۔" اوسعتھم سبا واودوا بالابل": میں نے انھیں جی بھر کے گالیاں دیں لیکن وہ اونٹ لے بھاگے۔ اس کہاوت کے پیچھے بھی ایک واقعہ ہے۔ ایک آدمی اپنے اونٹ چرا رہا تھا۔ اچانک کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا اور اونٹ لے بھاگے۔ یہ بیچارہ کمزور تھا اپنے اونٹ نہ چھڑا سکا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو ایک ٹیلہ پر چڑھ گیا اور خوب چلا چلا کر سخت گالیاں دیں اور منہ لٹکائے اپنے قبیلہ میں چلا آیا۔ لوگوں نے کہا منہ کیوں لٹکائے ہوئے ہو اور اونٹ کیا ہوئے۔ تو یہ مثل کہی۔ جیسے اردو میں کہتے ہیں ۔۔۔" کھسیانی بلی کھمبا نوچے"۔

۴۔ فلسفیانہ اور حکیمانہ مقولے

وہ دلکش، جامع و مانع اور خوبصورت جملے جن میں زندگی کے تجربات کی بنا پر ایسی صحیح اور اٹل حقیقت کا اظہار ہو جن کا کوئی انکار نہ کر سکے۔ عربی زبان میں کہاوتیں اور حکیمانہ مقولے نظم و نثر دونوں اصناف میں ملتے ہیں۔ اور بڑے ہی دلکش اور موثر ہوتے ہیں[1]

۱۔ "من سلک الجدد امن العثار": یعنی جو سیدھی راہ چلتا ہے ٹھوکر سے بچا رہتا ہے۔ جیسے اردو میں کہا جاتا ہے" سیدھی راہ چلو چاہے دور ہو"۔" راہ راست برو گرچہ دور است"۔

۲۔ "خیر الموت تحت ظلال السیوف": بہترین موت تلواروں کے سایہ میں ہے۔ یعنی بہادری سے جان

۱۔ امثال سے متعلق پوری تفصیل کے لئے دیکھئے۔

احمد امین، فجر الاسلام، اوّل ص ۷۲ تا ۷۹، طبع ثانیہ ۱۹۳۳ء مطبعۃ الاعتماد، مصر۔

مجمع الامثال للمیدانی۔

جمہرۃ امثال العرب للعسکری۔

دینا ذلت کی موت سے بہتر ہے۔

۳۔ "جلو اللسان انکی من کلم السنان" زبان کا زخم نیزہ کے زخم سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

۴۔ "خیر الغنی القناعۃ" یعنی قناعت بہترین مالداری ہے۔

۵۔ "رضا الناس غایۃ لاتدرک" یعنی لوگوں کو خوش رکھنا ایسا مقصد ہے جو کبھی پورا نہیں ہوتا۔

۶۔ "رب عجلۃ تھب ریثا" یعنی کبھی جلد بازی تاخیر کا باعث بن جاتی ہے۔ اس سے ملتا جلتا اردو میں "جلدی کا کام شیطان کا"۔

۷۔ "انجز حر ما وعد" یعنی شریف آدمی جو وعدہ کرتا ہے اسے پورا کرتا ہے۔

۸۔ "اترک الشر یترکک" یعنی تم برائی کو چھوڑ دو، وہ بھی تمہیں چھوڑ دے گی۔

۹۔ "من ضاق صدرہ اتسع لسانہ" جس کا دل چھوٹا ہوتا ہے اس کی زبان لمبی ہوتی ہے۔

۱۰۔ "رب ملوم لا ذنب لہ" بسا اوقات ملامت کیا جانے والا آدمی بے گناہ ہوتا ہے۔

۵۔ نثر مرسل و مسجع

"مرسل" نثر کی وہ قسم ہے جس میں عبارت کے آخری کلمات میں قافیہ بندی نہ ہو یعنی ہر جملہ کا آخری لفظ ایک وزن پر ختم نہ ہوتا ہو۔

"مسجع" ہر جملہ یا دو جملوں یا ان سے زیادہ جملوں کے بعد کے الفاظ میں قافیہ بندی یعنی ہم وزن الفاظ استعمال کیے جائیں، تو یہ مسجع کہلائے گا۔ سجع اگر بغیر تکلف کے عبارت میں آجائے تو اسے برا نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ اس قسم کی عبارت بشرطیکہ آمد ہو، آورد نہ ہو، کانوں کو بھلی لگتی ہے اور موسیقیت کی وجہ سے دل و دماغ میں جلد اتر جاتی ہیں۔ عبارت کو اس طریقہ سے حسین و دلکش بنانے کا رواج زمانہ جاہلی کی تقریروں، کہاوتوں، حکمت اور عقلمندی کے مقولوں، فخریہ موقعوں اور کاہنوں کی بانیوں میں زیادہ ملتا ہے۔ جہاں تک لکھنے کا سوال ہے تو ایک عرصہ تک عربی کے انشاپرداز اس طرز پر لکھتے رہے ہیں۔ ان میں سے جن ادبا کی تحریروں میں بلا تکلف صنعت سجع آگئی ہے، وہ پسندیدہ رہے ہیں اور جن ادبا نے باتکلف اور قصداً مسجع عبارتیں لکھی ہیں اپنے زمانے میں وہ چاہے کسی وجہ سے مقبول رہے ہوں، لیکن بعد میں انہیں ناپسند کیا جانے لگا۔ اور ان کا رواج ختم ہو گیا۔

"نثر مرسل" کی بہترین مثال ابو حنبل قیس بن عفاف البرجمی کے وہ جملے ہیں جو اس نے حاتم طائی نے ذمہ ایک خون بہا لینے کے بعد کہے تھے۔

"یا فحملت ما رکنت نیہا علی مالی و اہلی، فاما مالی فقد سلمتہ واکنت مکرھا علی

فان تحملتها فکم من حق قضیت وھم کفیت وان حال دون ذٰلک حائل۔ لما ذم یومٔ ولم ایأس من غد ف۔

ترجمہ۔ میں نے پنے ذمہ یہ خون بہانے لیا ہے جس کو ادا کرنے کے لئے میں نے اپنے مال اور اپنی امید سے تولگا رکھی ہے۔ جہاں تک میرے مال کا تعلق ہے تو وہ میں پیش کر چکا۔ اب رہی امید سو وہ تم ہو۔ تو اگر تم اسے برداشت کر لو تو یہ تمھارے لئے کوئی بڑی بات یا کوئی نئی بات نہیں کیونکہ تم نے تو کتنے ہی حقوق پورے کئے ہیں اور کتنی ہی تکلیفیں دور کی ہیں۔ اور اگر اس راستہ میں کوئی رکاوٹ آجائے تو میں تمھارے آج کے دن کی برائی نہیں کروں گا اور نہ تمھارے آئندہ کل سے مایوس ہوں گا۔

کاہنوں کے سجع کی مثال

کاہنوں کے سجع کے نمونے کے طور پر کاہن ربیعہ سطیح بن مازن کے ان اقوال کو پیش کیا جاتا ہے جو اس نے یمن کے بادشاہ ربیعہ بن نصر اللخمی کے ایک خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے کہے تھے۔

" احلف بما بین الحرتین من حنش لیھبطن ارضکم الحبش۔ ولیملکن ما بین ابین الی الجرش "

ترجمہ۔ کالے پتھروں والی زمین کے درمیان جتنے سانپ ہیں یا انسان ہیں ان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمھارے ملک پر حبشی لوگ اتریں گے اور ابین اور جرش کے درمیان جو کچھ ہے اس پر قبضہ کر لیں گے (ابین اور جرش دو قصبے تھے۔

کاہن شق انمار نے جو کسری انوشیروان کے زمانہ میں گذرا ہے، اس نے بھی اس خواب کی تعبیر سجع میں دی۔ اس نے کہا۔

" احلف بما بین الحرتین من الانسان، لینزلن ارضکم السودان۔ ولیغلبن علی کل طفلۃ البنان و لیملکن الی ما بین ابین ونجران "

ترجمہ۔ دونوں کالے پتھروں والی زمینوں کے درمیان جتنے انسان رہتے ہیں ان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمھارے ملک پر سوڈانی لوگ اتریں گے اور ہر نرم انگلیوں والی پر غلبہ حاصل کر لیں گے اور ابین اور نجران کے درمیان جو کچھ ہے اس پر قبضہ کر لیں گے۔

کاہنوں کے علاوہ مخضرم شاعر لبید بن ابی ربیعہ[1] کی طرف بھی سجع میں ایک پودے کا نقشہ کھینچنا

1۔ اس سجع کا قصہ لبید کے حالات زندگی میں دیکھئے۔ ج ۲،

یوں بیان کیا گیا ہے۔اس پودے کو تربہ کہتے ہیں۔

* هذه التربة التي لا تذكي نارًا، ولا توصل دارًا، ولا تسر جارًا، عودها ضئيل وفرعها كليل وخيرها قليل بلدها شاسع، نبتها خاشع وآكلها جائع والمقيم عليها ضائع، اقصر البقول فرعًا واخشنها مرعى واشدها قلعًا فتعسًا لها وجدعا

ترجمہ۔ تربہ وہ پودا ہے جو نہ آگ جلا سکتا ہے اور نہ کسی گھر میں سبزی کے طور پر کام آسکتا ہے اور نہ کسی پڑوسی کو خوش کر سکتا ہے۔اس کا تنا کمزور،اس کی شاخ بے جان اور اس کا نفع بہت کم ہے۔اس کا ملک بہت دور اور اس کا پودا زمین سے لگا ہوا یعنی بہت چھوٹا ہوتا ہے۔اس کا کھانے والا بھوکا اور اس کے نیچے رہنے والا برباد ہو جاتا ہے۔سارے پودوں میں اس کی شاخ چرنے میں بدترین اور اکھاڑنے میں سخت ترین، خدا اسے برباد کرے اور کاٹ دے۔

یہاں پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ سجع کے معاملہ میں نقادوں کی مختلف رائیں ہیں ۔ بعض اس صنف کو اچھی سمجھتے ہیں اور بعض بُری۔

چنانچہ جو نقاد اسے بری اور معیوب سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ لکھنے یا بولنے کا یہ طریقہ فطری نہیں ہے، بلکہ اس میں لکھنے والے یا بولنے والے کو ذہن پر زور دے کر ایسی عبارت لکھنی پڑتی ہے کہ نفس موضوع کی طرف دھیان نہیں رہتا، اور موضوع کا تسلسل اور بیان کا ربط اور معنی و مفہوم کی وضاحت خبط ہو جاتی ہے۔جس کی وجہ سے موضوع تشنہ رہ جاتا ہے پھر بالتکلف لکھنے سے اس کا فطری حسن جاتا رہتا ہے۔اور بعض اوقات محض سجع کی وجہ سے معانی تشنہ اور مضمون مبہم ہو جاتا ہے۔کیونکہ وزن لانے کے لئے غریب الفاظ بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں۔اس کا مظاہرہ کاہنوں کے سجع میں بہت ملتا ہے۔ان کے یہاں بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں، جن کے معنی اب تک صاف نہیں اور اگر واضح ہیں تو معنی سیاق وسباق کی وجہ سے خود لفظ اپنے معنی واضح طور پر ظاہر نہیں کرتا۔

جو نقاد صنف سجع کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ درحقیقت کلام کا اعلیٰ درجہ اسی کو حاصل ہے کیونکہ وزن کی وجہ سے جملوں میں جو موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے وہ براہ راست دل پر اثر کرتی ہے اس کے علاوہ اس سے ادیب کی زبان پر قدرت الفاظ کے ذخیرہ اور ان کے برمحل استعمال کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان لوگوں کی دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن کریم جو عربی کی سب سے پہلی معجزہ نما کتاب ہے اس کی اکثر سورتیں پوری کی پوری مسجع ہیں۔ جیسے سورہ رحمن، سورہ القمر وغیرہ۔اس کے علاوہ اکثر سورتوں میں قرآن کریم نے سجع کا التزام رکھا ہے۔قرآن کے بعد فصاحت و بلاغت کا نمونہ آنحضرت تھے۔آپ کا بھی اکثر کلام مسجع ہے۔

جیسے "یاایہا الناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا باللیل والناس نیام" اور بعض جگہ تو آپ نے محض سجع کی خاطر نحوی اور صرفی قاعدوں کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ جیسے آپ کا اپنے نواسے کے بارے میں فرمانا "اعیذہ من الھامۃ وکل عین لامۃ" یہاں پر لامہ در حقیقت ملمہ ہے کیونکہ الم سے ملم ہی بنتا ہے۔ مگر آپ نے ہامہ اور سامہ کی نسبت سے لامہ فرمایا۔ رہ گئی یہ بات کہ آپ نے کاہنوں کے سجع پر ایمان ویقین رکھنے سے منع فرمایا ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرز بیان سے روکا ہے، بلکہ اس خرافی مضمون کی طرف توجہ دینے اور اس پر یقین رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ جو ان کی سجع میں ہوتا ہے۔ جیسے غیب کے بارے میں اٹکل پچو باتیں یا مبہم اور غیر مانوس اشارے۔

ان لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ دور جاہلیت میں جب کہ زبان و بیان میں فطری انداز غالب تھا۔ سجع ہی کو لوگ پسند کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں موسیقیت تھی۔ پھر اس سجع سے بعد میں شعر اور اس کا وزن اور قافیہ بھی نکلا ہے جس نے ادب کی ایک مستقل صنف اختیار کر لی۔

مگر ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ سجع کے بارے میں یہ رائیں قدما کی ہیں۔ عباسی دور کے آخری زمانہ سے سجع اور خاص طور سے باتکلف سجع کا رواج جس کی زندہ مثال حریری کے مقامات ہیں، بالکل ختم ہوگیا۔ جن ادبا نے سجع کو مستحسن سمجھا ہے، انھوں نے اس کے لئے چند شرائط عائد کی ہیں جو اگر پوری ہوں تو وہ سجع مستحسن اور مقبول ہے ورنہ ناپسندیدہ اور نامقبول۔[1]

موجودہ زمانے میں ادبا اور نقاد عام طور سے مسجع عبارت کو ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ البتہ بےساختہ آمد کے طور پر سجع عبارت میں اگر کہیں آجاتے اور معنی و موضوع کو گنجلک اور مبہم نہ بنا دے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔

۴۔ قصے کہانیاں

قوموں کی ادبی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب سے انھوں نے اجتماعی زندگی گزارنی شروع کی اس وقت سے کہانیاں ان کی زندگی کا لازمی جز بن گئیں۔ چنانچہ ہندوستانی، ایرانی، یونانی اور رومی سبھی قوموں کے ادب میں شہرۂ آفاق کہانیاں ملتی ہیں۔ ان میں بعض کہانیاں اتنی مقبول ہوئیں کہ ان کو ادب

۱۔ سجع سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے۔

المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر: ضیاء الدین ابن الاثیر۔ ۶۲۷ھ۔ صبح الاعشیٰ للقلقشندی۔

اسس النقد الادبی عند العرب: الدکتور احمد احمد بدوی: طبعۃ ثالثۃ، ۱۹۶۴ء

میں قومی حیثیت حاصل ہوگئی جو اب تک برقرار ہے۔ ان قوموں میں سے جو قوم ذہنی اور تخیلی اعتبار سے جتنی بلند تھی اسی لحاظ سے ان کے قصے کہانیاں بلند پراثر، دلچسپ اور فنی اعتبار سے معیاری ہیں۔

عرب قوم بھی دنیا کی قدیم قوموں میں سے ہے۔ جس نے زندگی کے مختلف نشیب و فراز دیکھے ہیں اور ان سے حاصل شدہ تجربات کو کبھی شعر میں اور کبھی نثر میں بیان کیا ہے۔ نثر میں بیان کردہ اصناف میں ایک قصہ بھی ہے جو عربوں کے یہاں بہت عام تھا۔ جاہلی زمانے میں لوگ دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہوکر "ندوات سمر" رات میں گپ شپ کے حلقے یا مجلسیں منعقد کرتے تھے۔ جن میں یہ لوگ اپنے اسلاف کے کارناموں، ان کی بہادری اور شجاعت کے قصوں کو بیان کرتے تھے: "قیل لبعض اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماکنتم تتحدثون بہ اذا خلوتم فی مجالسکم؟ قال: کنا نتناشد الشعر و نتحدث باخبار جاھلیتنا" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ سے پوچھا گیا کہ جب آپ لوگ اپنی بیٹھکوں میں جمع ہوتے تھے تو کیا باتیں کیا کرتے تھے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم ایک دوسرے کو شعر سناتے تھے اور زمانۂ جاہلیت کے اخبار (قصے) بیان کرتے تھے۔ اسی طرح کہانیاں سننے کا رواج اسلامی عہد میں بھی ایک زمانہ تک رہا۔ خود قرآن کریم نے بھی عبرت کے لیے گذشتہ قوموں کے قصوں کو مختلف جگہوں پر بیان کیا ہے[1] اور اس معجزہ نمائی کے ساتھ کہ بعض سورتیں عربی ادب کا شہ پارہ ہوگئی ہیں۔ رواۃ نے بیان کیا ہے کہ حضرت معاویہ کے پروگرام کا سب سے اہم حصہ رات کو گذشتہ قوموں کے اخبار اور تاریخ و وقائع کا سننا تھا۔

زمانۂ جاہلیت میں جن قصوں کا رواج تھا۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ان قصوں کی ہے جنہیں ہم لوک کتھا کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ عرب قوم بہادر اور جنگجو قوم تھی اور زندگی کا بیشتر حصہ جنگی سرگرمیوں یلغاروں

---

1 قرآن میں وارد قصوں کی تفصیل ان کی تقسیم اور غرض و غایت کے متعلق دیکھئے:
ا۔ القرآن والقصۃ الحدیثۃ : محمد کامل حسن المحامی
ب۔ التصویر الفنی فی القرآن : سید قطب
2۔ مضمون القصۃ فی القرآن الکریم: ڈاکٹر عبداللہ محمود شحاتہ مجلۃ العربی ماہ مارچ ۱۹۷۷ء ربیع الاول ۱۳۹۷ھ

میں گزرتا تھا۔اس لئے عام طور پر ان کہانیوں کا موضوع جنگ اور بہادروں کی شجاعت اور دلیری کے کارناموں کو بیان کرنا ہے۔اس قسم کی کہانیوں میں سب سے زیادہ مشہور عنترہ، الزیر سالم بن ہلال البطال، الامیرۃ ذات الہمہ، سیف بن یزن اور فیروز شاہ ہیں

ان کہانیوں میں عام طور سے جنگ اور جنگجو بہادروں کا ذکر ہے۔یوں تو ان کہانیوں میں سے بعض کی بنیاد تاریخی واقعات پر ہے، لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں اس قدر تغیر و تبدل ہوا کہ تاریخی بنیاد منہدم ہو کر صرف تخیلی عمارت رہ گئی۔ان کہانیوں میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول کہانی "عنترہ" کی ہے۔جسے قصصی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔اگر چہ تاریخی اور فنی اعتبار سے اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔یہ وہی عنترہ ہے جس کا معلقہ مشہور ہے۔اور جو اپنی بہادری کے کارناموں کی وجہ سے عرب قوم کا ہیرو بن گیا تھا۔

کہانی "عنترہ" صرف ایک جنگجو اور بہادر عرب ہی کی کہانی نہیں ہے بلکہ یہ عہد جاہلیت کے ایک غیور، بہادر، ہمت ور، شریف اور مخلص وفادار شخصیت کا پیکر ہے۔"عنترہ" اپنے قبیلہ کا سردار ہے۔ ہمت، بہادری، اخلاص وفاداری اور قربانی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔اس کے قبیلہ کی ایک دوسرے قبیلہ سے جنگ ہوتی ہے۔عنترہ بڑی ہمت وعزم سے اپنی فوج کی قیادت کرتا ہے۔گھمسان کا رن پڑا ہے وہ بڑی بے جگری اور عدیم المثال بہادری سے لڑتا ہے۔اتنے میں اس کے سینے میں دشمن کا زہر میں بجھا ہوا ایک تیر آ کر لگ جاتا ہے۔وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ زخم کاری ہے اور زہر نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ اب چند لمحوں کا مہمان ہے تو اس خیال سے کہ اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس کی فوج میں بد دلی نہ پھیل جائے اور وہ غنیم سے شکست کھا جائے، جلدی سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور اپنے نیزے پر ٹیک لگا لیتا ہے۔اور اس حالت میں اس کی روح نکل جاتی ہے۔جب دشمن دور سے اس طرح اسے گھوڑے پر سوار نیزے پر ٹیک لگائے دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور گھوڑے پر بیٹھا اپنی فوج کی کمان کر رہا ہے۔چنانچہ خوف و دہشت کے مارے اس کے قریب آنے کی جرأت نہیں کرتے ہیں [1]

تاریخی اعتبار سے اس میں بڑا سقم ہے پھر فنی اعتبار سے بھی اس میں خامیاں ہیں، نہ فقروں میں ربط ہے نہ کہانی کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔لیکن اس کے باوجود چونکہ ایک بدوی کی صحیح تصویر

---

[1] دراسات فی القصۃ والمسرح، محمود تیمور

ہے۔اس لئے عہد جاہلیت کی مقبول ترین کہانی سمجھی جاتی ہے۔ اور "عنترہ" کی ذات عربوں میں "ہیرو" کی طرح مانی جاتی ہے۔ تاریخی واقعات پر مبنی لیکن حقائق سے دور کہانیوں میں "الزبا" کی موت کا قصہ بھی ہے، جس کی روایت ہشام بن محمد الکلبی سے کی گئی ہے۔اس عربی کہانی میں اور ثقہ مورخین نے "زنوبیا" کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس میں بڑا اختلاف ہے۔اس کے پیش نظر عربی کہانی بالکل من گھڑت اور خیالی نظر آتی ہے۔ اور تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ بات اب تک نہیں معلوم ہو سکی کہ اس کو گھڑنے میں دور جاہلیت کے لوگوں کا ہاتھ ہے یا اسلامی دور میں اسے تخیلی جامہ پہنایا گیا[1]

جنگی کارناموں اور بہادری کے قصوں میں ان قصوں کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے جنھیں ہم عربی ادب میں ایام العرب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ ان جنگوں کی کہانیاں ہیں جو عرب قبیلوں میں باہم بہت معمولی باتوں پر چھڑ جاتی تھیں۔ جیسے داحس اور غبرا کی جنگ یا "یوم الفجار" اور "یوم ذی قار" جو بنو شیبان اور ایرانیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ان جنگوں میں داحس اور غبرا کی جنگ بہت مشہور اور عبرتناک ہے۔ اور جاہلی ذہنیت اور فطرت کی آئینہ دار[2]

جنگوں اور بہادروں کے کارناموں کے قصوں کے علاوہ عہد جاہلیت میں بعض قصے حسن و عشق کے بھی ملتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور "منخل الیشکری" مشہور غزل گو شاعر اور نعمان بن منذر کی بیوی متجردہ کا قصہ حسن و عشق ہے[3]

عہد جاہلیت کی کہانیوں کی دوسری قسم ان کہانیوں کی ہے جنھیں عربوں نے دوسری قوموں سے لیا ہے اور انھیں اپنے ذوق کے مطابق عربی زبان کا ایسا جامہ پہنایا ہے کہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ جیسے شریک نامی شخص کا واقعہ جو منذر کے ساتھ پیش آیا۔ اس واقعہ کی مختصر روداد یہ ہے کہ حنظلہ نامی ایک شخص منذر کے پاس آیا۔ منذر نے کسی وجہ سے اس کو قتل کرنے کی ٹھان لی۔ حنظلہ نے اس سے ایک سال کی

۱۔ فجر الاسلام، احمد امین ۱/۸۰ — الطبعۃ الثانیہ، جنوری ۳۴

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے اس کتاب کا صفحہ ۳۴ — اور عقد الفرید، ابن عبدربہ — مجمع الامثال للمیدانی — ایام العرب فی الجاہلیۃ، محمد ابو الفضل ابراہیم و علی محمد البجادی۔

۳۔ منخل کے لئے اس کتاب کے علاوہ دیکھئے، الاغانی جلد ۱۰۔ کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ، شعراء النصرانیہ الشیخو الیسوعی اور زوزنی شارح سبع معلقات نے "نابغہ" کے اس قصیدے کے ذکر میں جو اس نے متجردہ کے بارے میں کہا تھا۔ منخل اور متجردہ کے تعلقات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ص ۱۸۹، مطبوعہ مطبعہ السعادہ، مصر، ۱۹۲۵ء

مہلت مانگی۔منذر نے کہا کہ اپنا کوئی ضمانتی لاؤ۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تم ایک سال کے بعد قتل ہونے کے لئے آجاؤ گے۔ اس نے شریک بن عمرو کو اپنے ضمانتی کے طور پر پیش کیا۔ جب ایک سال گزر گیا تو المنذر اپنے دربار میں بیٹھ کر حنظلہ کا انتظار کرنے لگا، لیکن وقت گزرتا گیا اور وہ نہ آیا۔ تب اس نے شریک بن عمرو سے کہا کہ اب تم اس کے بدلے میں قتل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس نے گردن جھکا دی۔ جلاد تلوار لے کر اس کی گردن مارنے کے لئے تیار ہوا ہی تھا کہ دور سے دھول اڑتی دکھائی دی۔ غور سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ کوئی گھوڑ سوار سرپٹ چلا آرہا ہے۔ قریب آیا تو معلوم ہوا کہ حنظلہ ہے۔ اس نے آتے ہی تاخیر کی معافی چاہی اور جلاد کے آگے گردن کر دی۔ المنذر پر ان دونوں کی دوستی، وفاداری، شرافت اور پاس عہد کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے دونوں کو بخش دیا، اور ہمیشہ کے لئے اس طرح قتل کرنے کی رسم کو ختم کر دیا۔

یہ قصہ جاہلی لوک کتھاؤں میں بہت مقبول اور مشہور ہے اور اسے اس طرح عربی رنگ میں بیان کیا گیا ہے کہ شبہ بھی نہیں گزرتا ہے کہ یہ عربی لوک کتھا نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت ایک مشہور یونانی کہانی ہے جسے عربی جامہ پہنا کر معرب کر دیا گیا ہے۔

یا قبیلہ بنی ضبۃ کے ایک شخص کا مشہور قصہ، جس کے سات لڑکے تھے۔ ایک دن ساتوں لڑکے کتوں کو لے کر شکار کے لئے گئے۔ جنگل میں آرام کرنے کے لئے وہ ایک غار میں گھس گئے۔ اتفاقاً پہاڑی پر سے ایک چٹان ٹوٹ کر غار پر گری اور سب کے سب گھٹ کر مر گئے۔ باپ بیٹوں کا انتظار کرتے کرتے جب تنگ گیا تو تلاش کرنے کے لئے نکلا، اور ان کے پاؤں کے نشانات پر چلتا چلتا جب غار کے پاس پہنچا تو نقش پا یہاں آکر ختم ہو گئے۔ آگے بڑھ کر جب غار کا منظر دیکھا تو ان کا انجام سمجھ میں آگیا۔ اور الٹے پاؤں گھر کو واپس لوٹ آیا، اور اس سلسلے میں چند شعر کہے۔ یہ قصہ بھی اسلوب بیان اور ماحول اور کردار کے اعتبار سے بالکل عربی نژاد معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ مسیحی دور کے ابتدائی زمانہ کا ایک قصہ ہے جس کا عرب سرزمین سے کوئی تعلق نہیں!

اسی طرح عربوں میں بہت سے ایرانی قصے مشہور تھے، جن کے متعلق بہت کم لوگ جانتے تھے کہ دراصل یہ قصے سرزمین ایران سے عرب پہنچے۔ کیونکہ جس شکل میں انھیں سنایا جاتا تھا وہ بالکل عربی تھا۔ فارسیت کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اسلام کے آنے سے قبل تک یہ قصے کہانیاں دور جاہلیت کے دستور کے مطابق سینہ بہ سینہ منتقل

۱۔ فجر الاسلام، جلد اول، بحوالہ الاغانی، جلد ۱۹ اور الامالی للقالی، جلد ۱۔

ہوتی رہیں۔ لوگ اپنی بیٹھکوں، چوپالوں اور خاص مجلسوں میں مزے لے کر انھیں سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں بعض لوگ قصہ گوئی میں خاص شہرت پاچکے تھے، اور اسلامی زمانہ میں تو "قاص" قصہ گویوں کی ایک خاص صنف پیدا ہوگئی، جن کا کام ہی یہ تھا کہ وہ امراء، خلفاء اور اغنیاء کو دلیس بدلیس کے قصے کہانیاں ان کی تفنن طبع کے لئے یا عبرت وموعظت کے لئے سنایا کریں۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ عہد اموی میں خلفاء بعض قصہ گویوں کو صرف اس غرض سے مقرر کرتے تھے کہ وہ مسجدوں میں لوگوں کو انبیاء اور بادشاہوں کے حالات بغرض عبرت وموعظت سنایا کریں۔[1]

ان قصے کہانیوں اور کچھ ادھر ادھر سے لی ہوئی داستانوں سے اسلامی زمانہ میں قصے کہانیوں کی "الف لیلہ ولیلہ" جیسی ضخیم کتابیں وجود میں آئیں جو آج بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں اور جو کہانی کے فنی معیار پر چاہے نہ اترتی ہوں لیکن جہاں تک زبان واسلوب کا تعلق ہے ان میں ایسی روانی اور سلاست اور بے ساختگی اور سادگی کے ساتھ پرکاری ہے کہ زبان سے واہ نکل جاتی ہے۔

دور جاہلی کی نثر کی امتیازی خصوصیات

مذکورہ بالا صفحات میں نثر کی جن اصناف کا ہم نے مطالعہ کیا ہے ان کی روشنی میں جاہلی دور کی نثر کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ زمانۂ جاہلی کے فنکار الفاظ میں تناسب، توازن اور ان کے صوتی اثرات میں یکسانی اور یگانگی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے جس طرح کے مناسب الفاظ ان کی سمجھ میں آتے اور زبان سے بے ساختہ بر وقت نکل جاتے، استعمال کرلیتے تھے۔

۲۔ ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے مترادف اور ہم معنی جملے اور عبارتیں کم استعمال کرتے تھے۔

۳۔ اپنی عبارت کو دلکش، اسلوب بیان کو موثر اور سجع کو طلسماتی بنانے کے لئے کاہنوں اور جھگڑوں کے برخلاف سہ کر بانکلف جملے نہیں گڑھتے تھے۔

۴۔ جملے عام طور سے چھوٹے یا درمیانی ہوتے تھے۔ یہ بات خاص طور سے حکمت وفلسفہ، مقولوں، کہاوتوں اور وصیتوں میں ملحوظ رکھی جاتی تھی۔

۵۔ ایسی اختصار پسندی جس سے مفہوم خبط نہ ہو پسند کی جاتی تھی۔

۱۔ التوجیہ الادبی، طٰہٰ حسین، ص ۱۷، مطبع امیریہ، قاہرہ، ۱۹۴۰ء۔

۶۔ ایسی صراحت کے مقابلہ میں جس سے مفہوم میں پھیکا پن پیدا ہو جاتے، ایسے کنایہ کا زیادہ رواج تھا جس سے مفہوم کے سمجھنے میں دشواری بھی نہ ہو اور کنایہ کا لطف بھی بھرپور باقی رہے۔ چنانچہ اکثر ایسا کرتے تھے کہ جس چیز کی طرف اشارہ کرنا ہے عام طور سے صرف اس کی خاص امتیازی خصوصیات کا ذکر کر دیتے، کھل کر نام نہ لیتے۔ کہا کرتے تھے "الکنایۃ افضل من التصریح" کھل کر کسی شے کے بیان کرنے کے مقابلہ میں اس کی طرف بند لیکن واضح اشارہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔

۷۔ مشکل اور ادق نظریات و افکار یا پیچیدہ اور گہرے معنی پیدا کرنے کی طرف جن میں ذہن اور عقل پر زیادہ زور دینا پڑے، دور جاہلیت میں فنکاروں کا رجحان کم تھا۔

۸۔ بدوی اور فطری زندگی کی محدود ضروریات اور گنے چنے نظریات اور سطحی افکار و خیالات کو فطری طریقہ سے بے ساختہ اور سادہ اسلوب میں بیان کیا جاتا تھا۔

اسی لئے اس زمانہ میں گہرائی فکر، ندرت بیان اور دقیق معنی و مطالب نہیں ملتے۔ مگر جہاں تک الفاظ و ترکیب کا سوال ہے۔ اپنی جگہ گٹھے اور چست ہوتے تھے۔

۹۔ عبارتوں میں کبھی باموقعہ اور کبھی نسبتاً بے موقع بھی، کبھی ضرورتاً اور کبھی بے ضرورت بھی، کہاوت، ضرب المثل یا بانیوں کو استعمال کرتے تھے۔

تحریر یا کتابت دور جاہلی میں

رسم الخط کیا ہے؟

تحریر یا کتابت سے مراد رسائل (خطوط، نوٹس وغیرہ) یا کتابوں کا لکھنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ لکھائی کسی چیز پر کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے معین قسم کے نشانات یا نقوش بنانے کا نام ہے۔ ان معین نشانات یا مقررہ نقوش کا اصطلاحی نام رسم الخط ہے۔ طرز تحریر سب سے پہلے کیسے وجود میں آئی، کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کسی خاص نشان کو کیسے متعین کیا گیا اور پھر مختلف نقوش یا نشانات یکجا ہو کر پورے جملے کا مفہوم کس طرح دینے لگے۔ اس کی دلچسپ کہانی ہے۔ جسے بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ جرجی زیدان نے اپنی کتاب "فلسفۃ اللغۃ" میں رسم الخط کے ایجاد کے مختلف مراحل بیان کئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور سے رسم الخط چار مرحلوں سے گزر کر اپنی اصلی شکل و صورت یعنی حروف و الفاظ کے قالب میں ظاہر ہوا ہے۔ پہلا مرحلہ اپنی بات کو تصویر کے ذریعہ سمجھانے کا تھا۔ اشیاء کی یہی تصویریں ایک زمانے کے استعمال کے بعد رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہوئی حروف اور حروف سے الفاظ کا جامہ پہننے لگیں اور ہمارا موجودہ رسم الخط وجود

میں آگیا۔[1]

قوموں کو رسم الخط کے ایجاد کرنے کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب ان کے یہاں تہذیب و تمدن جنم لیتا ہے۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں ترقی ہوتی ہے۔ اور حکومت اور نظام حکومت کو ٹھوس بنیادوں پر مستحکم اور استوار کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ آج سے ہزاروں سال پہلے مصریوں نے جب تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور جہانبانی و حکمرانی میں ایسی ترقی کرلی کہ شاید ہم اب بھی اس درجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں تو انھوں نے دل کی بات بتانے اور انھیں لکھ کر ادا کرنے کے لئے نشانات یا مخصوص نقوش بنانے کا ایک خاص طریقہ ایجاد کیا جسے عرف عام میں رسم الخط "ھیرو غلیفی" یا قدیم مصری تحریر کہتے ہیں۔

اس قدیم مصری طرز تحریر سے ہمارے عربی رسم الخط کا سلسلہ جا ملتا ہے۔ وہ اس طرح کہ قدیم مصری رسم الخط سے خط فینیقی نکلا[2] اور اس سے خط آرامی[3] اور مسند نکلا، خط مسند کی جائے پیدائش یمن ہے۔ ڈاکٹر جواد علی نے "تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۷، ص ۵۵، پر یہ لکھا ہے کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ مسند کی اصل "کتاب سینا" پر ہے جس میں ایسے کتبے ملے ہیں جو جنوبی عربی کتبوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ تیسرا نظریہ خط کنعانی سے مسند کے نکلنے کا ہے۔ خط مسند کی پھر کئی اور مختلف قسمیں ہوگئیں۔ چنانچہ جزیرۂ عرب کے شمالی حصہ میں رسم خط صفوی، ثمودی اور لحیانی کا رواج رہا اور جنوبی حصہ میں یمیری کا۔

عربوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنا حجازی رسم خط، حیرہ اور انبار کے لوگوں سے لیا ہے۔ اور انھوں

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: فلسفۃ اللغۃ، جرجی زیدان Dr Chayne :- The Arabic Language فقہ اللغۃ۔ ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی، لجنۃ البیان العربی، القاہرہ۔

۳۔ علم اللغۃ، ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی، مکتبۃ النہضۃ مصر، القاہرہ۔

۲۔ "فینیقی، کنعان میں رہتے تھے۔ یہ علاقہ جبل لبنان سے ملا ہوا بحر روم کے ساحل پر واقع تھا۔ فینیقیا، دراصل یونانی لفظ ہے اسے سب سے پہلے یونانیوں نے ان کنعانیوں کے لئے استعمال کیا، جو "ارجوان" لال کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی کنعانیوں کی طرح مختلف علاقوں میں پھیل گئے ہیں" (محمد ادیب العامری) مجلہ الادیب، اکتوبر ۱۹۷۰ء تفصیل کے لئے ڈاکٹر فلپ کی کتاب HISTORY OF THE ARABS ملاحظہ کیجئے۔

۳۔ آرامی قدیم سامی قوموں کو کہتے ہیں۔ یہ لوگ فلسطین، شام اور عراق میں رہتے تھے

عربی رسم الخط کا شجرہ

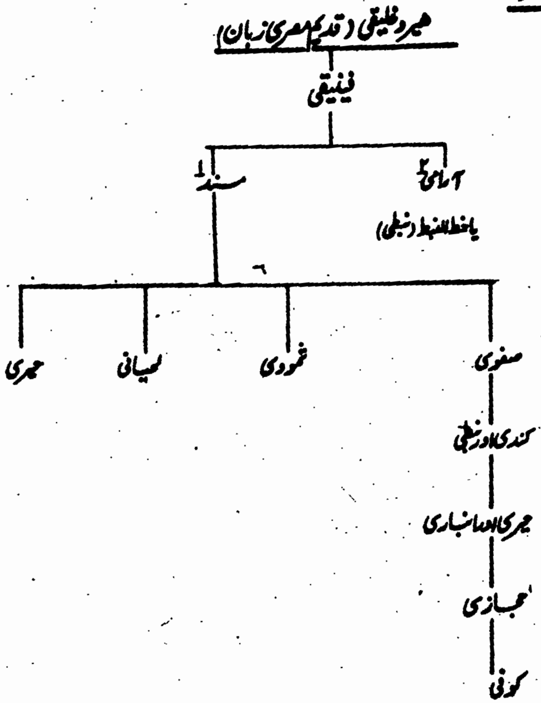

۱۔ خط مسند یمن میں پیدا ہوا، اور قبل میلاد سے پہلے جزیرہ نمائے عرب میں مستعمل تھا، اور یہ خط آرامی کے مقابلے میں زیادہ قدیم خط ہے، اور یہ فینیقی ابجد سے ایک ہزار سال قبل مسیح نکلا تھا۔ (جواد رج ۷، ص ۳۷)

۲۔ خط آرامی یا نبطی خط مسند سے متاخر ہے، لیکن یہودیوں اور نصرانیوں کے واسطے سے جو بنی ارم کے طرز تحریر پر لکھتے تھے جنوبی عربوں کو چھوڑ کر جاننا اور بقیہ جزیرہ کے عربوں میں یہ رسم خط آیا۔ اس خط نے خط مسند کو ختم کر دیا اور زمانۂ اسلام میں نبطی یا آرامی رسم خط پر لکھائی شروع ہو گئی (جواد: ج ۱، ص ۳۷)

نوٹ: رسم الخط العربی الشمالی (حجاز و مکہ وغیرہ) کو مرامر بن مرۃ، اسلم بن سدرۃ، اور عامر بن جدرۃ نے ایجاد کیا تھا۔

نے کندہ[1] اور نبط[2] سے اور ان لوگوں نے خط مسند سے۔ اس طرح عربی رسم الخط کا سلسلہ مسند سے جا ملتا ہے اور اسی خط مسند سے لحیانی اور خط ثمودی اور خط صفوی نکلے ہیں، کیونکہ مسند سب سے قدیم اور زیادہ رواج یافتہ رسم خط تھا۔ (ڈاکٹر جواد علی: ج ۱۲، ص ۵۴) اپنے دعوی کے ثبوت میں وہ کہتے ہیں کہ خط مسند کی بعض شاخیں نبطیوں کی سرزمین اور اس کے شمالی حصہ میں ملی تھیں۔ جیسے صفوی کہ یہ اپنی اصلی زبان فینیقی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس کے علاوہ حروف ردف جیسے ثخذ، ضظغ صرف خط مسند میں ملتے ہیں اور آرامی میں نہیں ملتے۔ علاوہ ازیں تمام عرب راویوں کا اتفاق ہے کہ عربی رسم خط، حیری اور انباری رسم خط سے لیا گیا ہے اور دونوں کو کندیوں اور نبطیوں نے مسند خط سے نکالا تھا۔ خط کوفی جس کو ایک الگ رسم خط سمجھ لیا گیا ہے درحقیقت حجازی ہی کی ایک شکل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حجازی سادہ طرز تحریر ہے اور کوفی میں جیومیٹری کے قاعدوں کے مطابق آرائش و زیبائش پیدا کر دی گئی ہے۔

بعض عرب قبائل جن میں لکھنے کا رواج تھا

تحریر یا کتابت کو اپنی محدود اور ابتدائی ضرورتوں میں استعمال کرنے کے بعد قومیں اس کے ذریعہ اپنی تاریخ، اپنا ادب، اپنی تہذیب و تمدن کی امتیازی خصوصیات اور دیگر علوم و فنون مرتب کرتی ہیں اور یہ منزل اس وقت آتی ہے جب قوموں میں تہذیب و تمدن، علم و فن، تجارت، حرفت اور مستحکم حکومت و نظام سلطنت قائم ہو چکتا ہے۔ چنانچہ عربوں کے جن قبیلوں میں جس حد تک یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں اس حد تک ان کے یہاں تحریر یا لکھائی کی کارفرمائی رہی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ اسلام سے پہلے جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں تبع قوم اور شمال میں غسانی اور منذری سارے عرب قبائل میں تہذیب

۱۔ ابن عباس سے جب عربی رسم الخط کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش نے عربی رسم خط حرب بن امیہ سے سیکھا اور اس نے عبداللہ بن جدعان یا بشر بن عبدالملک سے، جو دومۃ الجندل والی اکیدر کا بھائی تھا۔ بشر مکہ میں آیا اور حرب بن امیہ سے رشتہ قائم کیا اور قریش کی ایک جماعت کو لکھنا سکھایا اور ان دونوں نے حیرہ اور انبار کے لوگوں سے لکھنا سیکھا جہاں کندہ قبیلہ کا ایک آدمی یمن سے آ گیا تھا۔ اور یمنی بہت پہلے ہی سے لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

۲۔ نبطیوں کی سلطنت پہلی صدی قبل مسیح شمالی حجاز سے لے کر دمشق تک پھیلی ہوئی تھی اور مدین، صبح غضبہ، حجر، فلسطین اور حوران پر ان کا قبضہ تھا۔

وتمدن اور علم وفن کے اعتبار سے ترقی یافتہ تھے۔ تبع قوم میں مسند اور حیری، منذریوں اور غسانیوں کے یہاں انباری رسم خط کا رواج ایک عرصہ دراز سے چلا آرہا تھا۔ اس لئے گمان یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کارناموں اور علوم وفنون کو مدوّن کیا ہوگا۔ لیکن ان کے نمونے زمانے کی دست برد کی نذر ہوگئے اور ہم تک نہ پہنچ سکے۔ البتہ ان کی تحریر کے نمونے ان کی قبروں، ان کی رہنے کی جگہوں اور بستیوں سے کھدائی کے بعد نکلی ہیں۔ ماہرین نے ان کی بستیوں، گھروں اور رہن سہن کے طریقوں کا مطالعہ کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ انھوں نے اپنی ان تحریروں میں اپنا علمی سرمایہ بھی چھوڑا ہوگا۔ مگر وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ ممکن ہے آئندہ جو کھدائیاں ہوں، ان میں ان کی لکھی ہوئی چیزیں دستیاب ہو جائیں، جس طرح ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک کی دجلہ کے ساحلی علاقوں کی کھدائیوں میں تقریباً چار ہزار سال پرانی تحریریں تختیوں پر کندہ برآمد ہوئی ہیں، اور ان سے مسماری طرز تحریر کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو کیل کی طرح لکھی جاتی تھی۔ یا جزیرۂ عرب کے شمالی حصہ یعنی "مدائن صالح" میں جو کتبے اور تحریریں برآمد ہوئی ہیں، ان سے ۱۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۷۰۰ ق،م تک کی تحریروں کا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

عہد جاہلیت کے نثر نگار

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ دورِ جاہلی میں لکھنے والے ضرور رہے تھے۔ لیکن گردش زمانہ اور عربوں کے مخصوص حالات کی وجہ سے ان لکھنے والوں کے حالات اور ان کے نمونے ہم تک نہیں پہنچ سکے۔ البتہ دو آدمیوں کے ناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں ایک لقیط بن العمیر الایادی ہے اور دوسرا عدی بن زید العبادی[2] اور اس کا ایک لڑکا۔ ان تینوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسریٰ انوشیرواں کے دربار میں محرّر اور مترجم تھے۔

---

۱ حوالے اس کتاب کے ص پر ملاحظہ کیجئے۔ DRIVER: SEMITIC WRITING FROM PICTOGRAPH TO ALPHABETS LONDON

۲۔ جاحظ نے اس کے متعلق البیان والتبیین میں مختلف جگہ لکھا ہے۔ جلد ۲، ص ۲۲۳ میں اس کا شعر بھی نقل کیا ہے جس میں کہتا ہے:۔

وابیضاض السواد من نذر الموت وهل مثله لحی نذیر

نیز جاحظ نے ابو ایاس النصری سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا " کانوا یقولون اشعر العرب ابو دواد الایادی وعدی بن زید العبادی" ج اول، ص ۹۰

جزیرہ نمائے عرب کے شمال اور جنوب کے علاوہ باقی عرب جیسے مصر کے عام باشندے، قحطان کے قبیلے، اور وسطی جزیرہ کے بدو، تو یہ لوگ عام طور سے ان پڑھ تھے اور لکھنے پڑھنے سے نابلد۔ ان لوگوں کے یہاں لکھنے پڑھنے کا رواج جاہلی دور کے آخر زمانہ میں شروع ہوا ہے۔ چنانچہ عمرو بن معدی کرب کے بیان میں گزر چکا ہے کہ اس نے سب سے پہلے اپنے خطوط میں "باسمك اللهم" اے اللہ تیرے نام سے شروع کرتا ہوں، اور اما بعد، لکھنے کا رواج ڈالا[1] بعض لوگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ "من فلان إلى فلان" یعنی فلاں از فلاں کا رواج بھی جاہلی دور کے اسی اخیر زمانہ میں پڑا ہے۔ عربوں کے اس گروہ میں صحیح معنوں میں پڑھنے لکھنے کا رواج اسلام کے آنے کے بعد پڑا۔ اور پھر انھوں نے اس میں ایسی ترقی کی کہ سارے قبیلوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

۱۔ قریش بعثت نبوی سے پہلے ہی سے "باسمک اللهم" لکھا کرتے تھے اور اس کا ایک دلچسپ سبب اس واقعہ کو بھی بیان کیا جاتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ امیہ بن ابی الصلت قریش اور قبیلہ ثقیف کے ایک قافلہ کے ساتھ ملک شام تجارت کی غرض سے گیا تھا۔ واپسی میں ایک منزل پر ٹھہرے تو رات کو کھانا کے وقت ایک سانپ نکل آیا، جسے ان میں سے کسی نے ایک پتھر مارا، چنانچہ وہ بھاگ گیا۔ کھا پی کر چلے تو ایک بڑھیا دکھائی دی، اس نے ان سے کہا کہ تم نے رحیمہ کو کھانا کیوں نہیں کھلایا؟ لوگوں نے کہا کہ تو کون ہے؟ تو بولی کہ میں "ام العوام" ہوں۔ ایک مدت سے بیوہ ہو چکی ہوں۔ خدا کی قسم تم لوگ ادھر ادھر مارے مارے ہی پھرتے رہ ہوگے۔ اس کے بعد اس نے اپنا عصا زمین پر مارا اور سارے اونٹ بھاگ گئے۔ یہ بیچارے انھیں دن بھر ڈھونڈتے رہے، جب رات کو سب اونٹوں کو جمع کر کے چلنے کے لئے تیار ہوئے تو پھر وہی بڑھیا آگئی اور پھر اس نے وہی حرکت کی اور پھر سارے اونٹ بھاگ کر صحرا میں تتر بتر ہو گئے۔ انھوں نے پھر دن بھر انھیں ڈھونڈا اور رات کو جب چلنے کے لئے تیار ہوئے تو پھر بڑھیا آگئی اور اس نے پھر وہی حرکت کی۔ اب امیہ اس طرف گیا جہاں سے بڑھیا آئی تھی، وہاں اس نے ایک بزرگ نے کہا کہ اب کی مرتبہ جب بڑھیا یہ حرکت کرے تو تم کہنا "سبعًا من فوق وَ سبعًا من اسفل باسمك اللهم" چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، پھر بڑھیا کا جادو نہ چل سکا۔ یہاں سے جب مکہ پہنچے اور سب کو یہ قصہ بتایا تو قریش نے "باسمك اللهم" لکھنا شروع کیا۔

تفصیل کے لئے دیکھئے: الاغانی، للاصفہانی ——— مروج الذہب للمسعودی

صبح الاعشی، للقلقشندی ——— اور جمہرۃ رسائل العرب لاحمد صفوت۔

جیساکہ پہلے گذر چکا ہے، زمانہ جاہلیت میں جنوب کے عرب یعنی یمنی اور شمال کے عرب یعنی منذری اور غسانیوں نے تہذیب و تمدن، حکومت و سطوت میں خاص ترقی کر لی تھی۔ اس لئے ان کے یہاں طریقہ آبپاشی، فن تعمیر، حساب، طب، جانوروں کا علاج معالجہ اور کھیتی باڑی کے علوم خاص طور سے ترقی یافتہ تھے۔ یہ لوگ چونکہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ ان لوگوں نے ان علوم و فنون میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا۔ مگر جیساکہ پہلے بیان ہوا وہ زمانہ کے دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اس کے باوجود جن علوم کا سراغ ملا ہے، اس کی تفصیل پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

چوتھا باب

جاہلی زمانہ میں شعر و شاعری

گزشتہ صفحات میں ہم نے بیان کیا ہے کہ کلام کے دو حصے ہیں (ایک نثر اور دوسرا نظم یا شعر) جاہلی زمانہ میں نثر اور اس کی قسموں کا تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد اب ہم اس دور کے شعر و شاعری کا مطالعہ کریں گے اور سب سے پہلے یہ معلوم کریں گے کہ عربی زبان میں شعر کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں اور وہ کیا موضوعات ہیں جن سے دور جاہلی میں عرب شاعروں نے بحث کی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھیں گے کہ عربی زبان میں کن شعرا نے سب سے پہلے شعر کہے اور کن شعرا نے اسے بام عروج تک پہنچایا۔

دنیا کی قوموں میں شاید عرب وہ قوم ہے جسے شاعری کا ذوق فطری طور پر ملا ہے۔ یہ قوم بدوی زندگی گزارتی تھی۔ جس میں اس کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی نہ حاکم نہ حاکم کی عملداری۔ اس قوم کے افراد آغوش فطرت میں آنکھیں کھولتے تھے اور اسی آغوش میں پروان چڑھتے تھے۔ حد نگاہ تک پھیلا ہوا صحرا تیز اور جھلسا دینے والا سورج، تند اور تیز آندھیاں، چمکتا دمکتا چاند، ہنستے مسکراتے ستارے نشیلی صبحیں اور پر کیف شامیں، ان کا سرمایہ فکر و نظر تھیں اور یہ سرمایہ ایسا ہے جس کی نہ انتہا ہے اور نہ جسے زوال۔ چنانچہ عربی اپنی اس فطری زندگی اور فطری ماحول میں ڈوب کر اور ان سے متاثر ہو کر اپنے احساسات اور خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ زبان اتنی شیریں اور پر اثر ملی تھی کہ خیالات و افکار کی سادگی و روانی واقعیت الفاظ کی خوبصورتی، اثر اندازی اور موسیقیت سے جب ہمکنار ہوتی تھی تو جادو بن جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دور جاہلی کے شعر و شاعری کا جو سرمایہ ہم تک پہنچا ہے وہ بہت موثر، دقیع اور دلکش ہے۔

مگر قبل اس کے کہ ہم اس دور کے شعری سرمایہ کا مطالعہ کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ

دیکھیں کہ عربوں کے نزدیک شعر کا مفہوم کیا ہے۔

شعر کی تعریف

شاعری ان فنونِ لطیفہ میں سے ایک فن ہے جسے عربوں نے "ادب عالیہ" کا نام دیا ہے اور جس میں شعر کے علاوہ نقاشی، پینٹنگ اور موسیقی بھی آتی ہے۔ ماہرین عروض نے شعر کی تعریف یوں کی ہے کہ "شعر موزوں ومقفیٰ کلام کو کہتے ہیں۔" مگر یہ تعریف ناقص ہے کیونکہ اس طرح ہر قسم کا کلام جس میں "وزن اور قافیہ" ہو، وہ شعر ہو جائے گا حالانکہ ایسا نہیں۔ کیونکہ نقاد کہتے ہیں کہ اگر جغرافیہ کے مسائل یا صرف و نحو کے قواعد یا تاریخی واقعات یا اقتصادی مسائل کو وزن و قافیہ کے قالب میں ڈھال دیا جائے تو بھی ہم اسے شعر نہیں کہیں گے، وہ منظوم فن یا موضوع تو ہو سکتا ہے مگر اسے شعر کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے وہ ادب کا حصہ نہیں بن سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خیال یا حقیقت کو صرف نظم کر دینا شعر ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ اور خصوصیات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ خصوصیات کیا ہیں؟ وہ ہیں "اچھوتے خیالات وافکار، لطیف جذبات واحساسات" کی ایک خاص نہج سے تعبیر۔ چنانچہ یہ نقاد شعر کی یوں تعریف کرتے ہیں "شعر وہ فصیح وبلیغ کلام ہے جس میں وزن کے علاوہ نادر اور اچھوتے خیالات اور لطیف جذبات واحساسات کی عکاسی اس طرح کی گئی ہو کہ انسان کے دل ودماغ پر براہِ راست اس کا اثر پڑے۔

ان نقادوں کے نزدیک شعر کے اجزائے ترکیبی میں چونکہ ندرت خیال اور لطافت جذبات و احساسات اور وزن کے ساتھ اثر اندازی کو اولیّت حاصل ہے اس لئے اس میں سے بعض نے ہر اس کلام کو جس میں یہ صفات موجود ہوں شعر کا نام دیدیا ہے، چاہے وہ نثر ہی کیوں نہ ہو۔ اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں حضرت حسان کا وہ قول نقل کرتے ہیں، جس میں انھوں نے اپنے بیٹے کے نثر میں کہے گئے جملوں کو سن کر کہا تھا کہ "ربِ کعبہ کی قسم یہ تو شعر ہے"۔ [1]

۱۔ اس جملہ کے کہنے کی تقریب یہ ہے کہ حضرت حسان کے بیٹے کو کسی کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔ اس کا نام وہ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا نقشہ یوں کھینچا کہ "وہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ وہ حیرہ کی دو چادروں میں لپٹا ہوا" "کانہ ملتف فی بردی حبرۃ" حیرہ کی چادریں نقش ونگار اور خوبصورتی میں اس زمانے میں بہت مشہور تھیں۔ موقع ومحل کے لحاظ سے یہ انداز بیان اتنا خوبصورت اور دلنشین تھا کہ حضرت حسان بے ساختہ کہہ اٹھے کہ "شعر ورب الکعبہ"۔

مگر انسانی جذبات اور مشاعر میں اس وقت تک ہیجان یا بیداری پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ شاعر اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر خوبصورت اور چیدہ الفاظ اور وزن و قافیہ کے تانے بانے سے معانی میں ہم آہنگی پیدا کر کے سامع یا قاری کے دل کے تاروں کو جھنجھنا نہ دے۔ اسی وجہ سے اگر علوم و فنون کو نظم کر دیا جائے تب بھی انھیں شعر کا درجہ نہیں دیا جاتا، کیونکہ یہ نظم درحقیقت ایسے حقائق کا بیان ہو گا جس میں تخیل اور تاثر کا فقدان ہو گا، جو جذبات میں تغیر پیدا کرنے کے محرکات ہیں۔ پھر حقائق ثابتہ کے علم سے انسانی جذبات یا مشاعر میں کوئی ہیجان یا تغیر نہیں پیدا ہوتا کیونکہ یہ حقائق دلیل اور شواہد سے ثابت کئے جاتے ہیں اور ان کے لئے منطق و فلسفہ کی ضرورت ہے جو عقل کو قائل کر کے دعویٰ کو تسلیم کراتی ہے۔ اس کے برخلاف شعر میں منطق و فلسفہ سے استدلال نہیں کیا جاتا کہ اس کا مخاطب عقل نہیں بلکہ انسانی جذبات یا مشاعر ہیں جن کی آماجگاہ دل ہے۔ اور دل کی اندرونی کیفیات کو متاثر کرنے کے لئے دل ہی سے نکلی ہوئی چیز یعنی خیال اور اس کی رفعت اور ندرت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے شعر کی صحیح ترین اور مکمل ترین تعریف یہ ہو گی کہ "شعر وہ موزوں اور مقفیٰ کلام ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلے اور انسان کے جذبات اور احساسات کو بھڑکا دے" یعنی اس میں اتنا زور اور اتنا تاثر ہو کہ انسانی جذبات اور مشاعر میں ایک ہیجان سا برپا ہو جائے۔ اس اثر اور ہیجانی کیفیت کے پیدا کرنے میں خوبصورت اور چیدہ الفاظ وہی رول ادا کرتے ہیں جو ساز و گانے کے الفاظ ہیں۔ اسی لئے جب بلند خیال اور خوبصورت الفاظ کا حسین امتزاج، وزن کے قالب میں ڈھل جاتا ہے تو جادو کا سا اثر پیدا کر دیتا ہے۔ اور جب یہ مرقع انسانی زندگی کے کسی گوشہ کی عکاسی کرنے لگے تو پھر یہ سحر حلال بن جاتا ہے جو معراج فن اور حاصل شاعری ہے کہ "شعر کے معنی ہیں دل سے کسی بات کو محسوس کرنا"[1] اور اس طرح موزوں کئے ہوئے کلام کو اصطلاح میں "شعر فنی" کہتے ہیں۔

۱۔ شعر کی تعریف، اس کی ماہیت سے متعلق ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) نقد النثر اور نقد الشعر، لقدامہ بن جعفر (عرب نقادوں میں اسی نے سب سے پہلے شعر کی تعریف کی ہے)

(۲) عیار الشعر لابن طباطبا۔

(۳) الشعر والشعراء لابن قتیبہ

(۴) العمدۃ لابن رشیق القیروانی

(۵) اسس النقد الادبی عند العرب۔ دکتور احمد احمد بدوی، مطبوعہ مصر ۱۹۶۴ء

شعر فنی کے عناصر ترکیبی

شعر فنی کے اجزائے ترکیبی تین متعین کئے گئے ہیں:

۱۔ ایسے معانی اور مطالب کا پایا جانا جنھیں خیال نے جنم دیا ہو۔

۲۔ ایسے خوبصورت اور چیدہ الفاظ کا پایا جانا، جن سے شعر کے تخیل اور موسیقیت میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

۳۔ ان الفاظ کا ایک خاص سج دھج سے اس طرح ترتیب دینا کہ ان کے ذریعہ اثر اندازی کی شان دوبالا ہو جائے اور یہ صفت "وزن" کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔

یہاں پر ایک بات ذکر کر دینا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے وزن کو شعر کے لئے ضروری نہیں قرار دیا ہے۔ لیکن اکثر عرب اور مغربی نقادوں نے اس کو شعر کا لازمی عنصر قرار دیا ہے۔ کیونکہ بقول میتھو آرنولڈ "وزن فنی تکمیل کا ایک عنصر ہے" جب سے انسان نے انسان کی حیثیت سے زندگی شروع کی، اس نے اپنے قلبی احساسات کو مترنم انداز میں ادا کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ وزن اور قافیہ کے خلاف کوششوں کے باوجود دنیا کی زبانوں میں عام طور سے اور عربی زبان میں خاص طور سے وزن کی ضرورت اور اس کی ہمہ گیری بدستور قائم رہی اور آج بھی موزوں و مقفیٰ اشعار کا ہی بول بالا ہے۔ آزاد نظم کی تحریک پروان نہ چڑھ سکی۔

عربی زبان میں شعر کی ابتدا کیسے ہوئی؟

اس بات میں عام طور سے مورخین اور نقادوں میں اختلاف ہے۔ کہ عربی زبان میں شعر کی ابتدا کیسے ہوئی۔ بعض کہتے ہیں کہ عربوں نے سب سے پہلے نثر شروع کی اور اس کے ذریعہ اتفاق سے شعر تک پہنچ گئے۔[۱]

بعض کہتے ہیں کہ سجع کے بعد مقفیٰ و موزوں کلام کا دور آیا۔ بہرحال یہ بات متفقہ ہے کہ سب سے پہلی چیز جو شعر سے ملتی جلتی تھی وہ مسجع جملے تھے۔ جنہیں عام طور سے کاہن (پروہت یا سادھو قسم کے دینی پیشوا) اور دانشور لوگ کہا کرتے تھے۔ یہ مقفیٰ جملے ہوتے تھے، جنھیں منتروں کی طرح عبادت گاہوں میں دعا وغیرہ کے موقع پر کہا جاتا تھا۔ یا ان کے ذریعہ حکمت و فلسفہ کی باتوں کو زبانی

یاد کر لیا جاتا تھا۔ یا وہ علوم جن کو عرب یاد رکھنا چاہتے تھے، انھیں سجع اور مختصر جملوں میں زبانی یاد کر لیتے تھے۔[1] اس سجع میں رفتہ رفتہ وزن اور قافیہ کا اضافہ ہوا۔ وہ اس لئے کہ یہ مختصر اور جامع کلمات سننے میں کانوں کو بھلے لگتے تھے اور جب ان میں وزن اور ایک آواز پر آخری الفاظ ٹوٹنے سے ترنم سا پیدا ہو گیا تو شعر کی ابتدائی قدیم شکل یعنی وزن پیدا ہوا۔ جسے "رجز" کہتے ہیں۔ اس رجز کے ایجاد کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔

کہتے ہیں کہ مضر بن نزار اپنے اونٹ پر سے ایک دفعہ گر پڑا اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا، لوگ جب اسے اٹھا کر لے چلے تو شدت تکلیف سے اس نے چلا کر کہنا شروع کیا۔ "وا یداہ وا یداہ" یعنی ہائے میرا ہاتھ، ہائے میرا ہاتھ۔ آدمی خوش گلو تھا۔ چنانچہ جب اس کے منہ سے ایک خاص زیر و بم اور خاص وقفہ سے یہ الفاظ نکلنے لگے، جن میں تکلیف اور درد کی وجہ سے سوز بھی پیدا ہو گیا تھا۔ تو اونٹوں نے انھیں غور سے سنا اور آواز کے پیچھے تیز چلنے لگے۔ اس سے عربوں کو پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ اگر اس طرح کی آواز اس انداز سے نکالی جائے تو اونٹ تیز چلنے لگتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مضر کے جملے کے مطابق "ھا یدا ، ھا یدا" کی آواز منہ سے نکالی اور محسوس کیا کہ اونٹوں پر اچھا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا رواج پڑ گیا اور اس طرح آواز پیدا کر کے اونٹوں کو تیز چلانے کے لئے "حدی خوانی" کی اصطلاح بنی جو دراصل گانے کی ایک شکل تھی اور اسی گانے کو رجز کہتے ہیں۔ رجز کے لفظی معنی ہیں اونٹ کا چلنا اور اس کا ہلنا۔[2]

رجز کی ایجاد کے بعد اس میں اور ترقی ہوئی اور دوسرے اوزان اور بحریں پیدا ہوئیں۔

۱۔ سجع کی تعریف کے لئے دیکھئے اس کتاب کا صفحہ ۱۔ سجع دراصل فاختہ یا کبوتری کی آواز کو کہتے ہیں جو عام طور پر ایک ہی زیر و بم سے بولتی ہے اور بڑی پر سوز ہوتی ہے۔

۲۔ رجز کی مثال:۔ رجز کی یہ بحر اونٹ کی آہستہ چال سے ملتی جلتی ہے۔

راجز نے کہا ہے:۔

دع المطایا تنسم الجنوبا ان لها لنبا عجیبا	حنینها وما اشتکت لغوبا
یشهد ان قد فارقت حبیبا ما حملت الافتی کئیبا	یسوم ما اعلنت نصیبا
لو ترك الشوق لنا قلوبا اذن لآثرنا بهن النیبا	ان الغایب یسعد الغریبا

چنانچہ رزمیہ اور فخریہ موقعے کے لئے الگ وزن ایجاد ہوا۔ اور غزل وغیرہ کے لئے الگ اور اسی طرح رفتہ رفتہ عربی شاعری کی ساری بحریں پیدا ہوئیں، جن کی تعداد خلیل بن احمد کے نزدیک پندرہ ہے۔ مشہور نحوی اخفش نے ایک اور بحر کا اضافہ کیا جس کا نام اس نے متدارک رکھا۔

"سجع" اور اس کے بعد "رجز" دونوں میں باعث کشش وہ نغمگی یا موسیقیت ہے جو کلام کے کسی اور نمونے میں اس وقت تک نہیں ملی تھی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ گانے اور شعر کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان کی اس فطری خواہش کا کہ وہ اپنے لطیف جذبات کا اظہار خوبصورت اور دلکش آواز میں یعنی گا کر کرے شعر کہنے سے گہرا تعلق ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انسان نے سب سے پہلے گا کر اپنے دل کی بات اپنے معبودوں سے اور اس کے بعد اپنے بادشاہوں سے کہی۔ چنانچہ یونانیوں اور رومیوں کے یہاں کہتے تھے "شعر گایا" "شعر موزوں کیا" یا شعر کہا" نہیں کہتے تھے۔ اسی طرح عربی میں بھی "انشد الشعر" یعنی لحن کے ساتھ گا کر شعر پڑھا، ابھی تک استعمال ہوتا ہے۔

عربوں میں گا کر شعر پڑھنے کا رواج جاہلی زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ چنانچہ الاعشیٰ کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنا کلام گا کر سنایا کرتا تھا اور اسی لئے عربوں نے اس کا نام "صناجۃ العرب" یعنی عربوں کا جھانجھ" (باجا) رکھا تھا۔ بعد کے زمانوں میں بھی اشعار کو گا کر سنانے کا رواج قائم رہا۔ ہارون رشید کے متعلق مشہور ہے کہ وہ مدحیہ قصائد گوا کر سنا کرتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں رواج تھا کہ جس شاعر کی آواز اچھی نہیں ہوتی تھی وہ خوش گلو کمسن لڑکوں سے اپنا کلام پڑھواتا تھا۔

ایک زمانہ کے بعد شعر میں سے گانے کا عنصر ختم ہوگیا اور شعرا نے اس کی کوشش کی کہ مروجہ بحروں میں سے ان بحروں میں شعر کہیں، جن میں موسیقیت کا پہلو غالب ہو تاکہ عہد اول میں جس طرح رکیک کلام کو بھی نغمگی یا موسیقیت کے ذریعہ دلکش بنا دیا جاتا تھا، اس کی ضرورت نہ رہے اور شعر خود ہی اس قدر موسیقیت لئے ہوتے اور سامعہ نواز ہو کہ بغیر ساز و آہنگ کے بھی دلکش اور موثر رہے چنانچہ یہیں سے شعر فنی اور گانے کی راہیں جدا جدا ہوگئیں۔ اور دونوں قسموں کے لکھنے کے طریقے بھی الگ ہوگئے۔ یہی صورت حال آج تک قائم ہے[1]۔

۱۔ گانے اور شعر کے بارے میں ملاحظہ فرمائیے: (۱) الفن ومذاہبہ، ڈاکٹر شوقی ضیف اور "الشعر والغناء فی مکۃ والمدینۃ"۔

(۲) ترجمہ حسین نصار۔ H.G. FARMER HISTORY OF ARABIC MUSIC

(۳) المرشد الی فہم اشعار العرب، طہ حسین وغیرہ (۴) تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، جرجی زیدان، جلد ۱۔

شعر کی تقسیم

شعر کو مندرجہ ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مگر یہ تقسیم عربی ادب میں مغربی ادب سے لی گئی ہے ورنہ زمانہ جاہلیت میں یہ اصناف معروف نہ تھے اور نہ شعر سے متعلق اس زمانے میں ذہن اتنا واضح تھا۔ ہم نے اس تقسیم کو اس لئے اپنایا ہے کہ اس سے دورِ جاہلی کو سمجھنے اور پرکھنے میں مدد ملے گی اور یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ اس تقسیم کے مطابق جاہلی شعر و شاعری پوری اترتی ہے کہ نہیں اور یہ کہ ان اصناف میں سے کون سے اصناف دورِ جاہلی میں پائے جاتے تھے اور کون سے نہیں اور پھر اس کی وجہ کیا تھی!

۱۔ رزمیہ یا الشعر القصصی

۲۔ تمثیلیہ یا الشعر التمثیلی

۳۔ طربیہ یا الشعر الغنائی

۱۔ رزمیہ یا الشعر القصصی

رزمیہ یا الشعر القصصی اس نظم کو کہتے ہیں جس میں جنگ کے واقعات اور بہادری کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے یعنی ایسے اشعار جن میں ہیرو کے بہادری کے کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔ عام طور سے شعرا اپنے ہیرو کے کارناموں کا ذکر کرتے وقت مافوق الفطرت اوصاف کو بھی اس سے منسوب کر دیتے ہیں اور یہ مافوق الفطرت باتیں عام طور سے بے محل یا بُری نہیں لگتیں کیونکہ شاعر اس میں اپنی قوت متخیلہ کا سہارا لے کر انھیں اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس میں عظمت و شوکت کا پہلو دوبالا ہو جائے۔ کیونکہ رزمیہ شاعری میں عظمت اور شان و شوکت اصل چیز ہوتی ہے اور یہ بغیر قوت متخیلہ کا سہارا لئے پیدا نہیں ہو پاتی۔ اس قوت متخیلہ سے کام لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر بسا اوقات اپنے ہیرو کے کارنامے بیان کرنے میں، مبالغہ سے بھی کام لیتا ہے اور الفاظ اور اسلوب بیان کے ذریعہ ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے کہ ہیرو کے اوصاف یا اس سے متعلق کوئی خاص

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے:

جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العربیہ۔ جلد اول۔

الوسیط: احمد الاسکندری۔ جاحظ: البیان والتبیین۔

واقعہ پوری آن بان سے آنکھوں کے سامنے تصویر کی طرح پھر جائے۔ رزمیہ شاعری میں عام طور سے مکالمے بھی پائے جاتے ہیں اور ان سے بیان میں زور اور اثر میں زیادتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں مختلف کردار ہوتے ہیں اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے جو شاعر کی قوت متخیلہ کی جولان گاہ ہوتا ہے۔

رزمیہ شاعری تمام اصنافِ شعر میں سب سے قدیم سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا وجود شروع میں دینی اغراض کے لئے ہوا۔ اس لئے قدیم رزمیہ شاعری کے کردار عام طور سے دیوی اور دیوتا ہوتے تھے۔ رزمیہ شاعری کی مثال ہومر کی الیازہ، ہندوستان کی مہابھارت یا رامائن، عبرانی میں داؤد کے اسفار اور فارسی زبان میں فردوسی کا شاہنامہ ہے۔

جہاں تک عربی زبان میں رزمیہ شاعری کے وجود کا سوال ہے تو بعض مورخین جیسے جرجی زیدان اور عصر حاضر کے بعض ادبا اور نقاد جیسے ڈاکٹر طٰہٰ حسین وغیرہ کا خیال ہے کہ دورِ جاہلی میں رزمیہ یا الشعر القصصی کا وجود تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ "عربوں نے بھی عبرانیوں کی طرح دینی اشعار کہے ہوں گے، جنھیں وہ اپنے بتوں، لات، ہبل اور عزیٰ کے سامنے پڑھتے ہوں گے لیکن ان کے یہ اشعار زمانہ کی دست برد کے نذر ہو گئے کیونکہ نہ تو ان کو مدوّن کیا جا سکا اور نہ ہی ان کو زبانی یاد رکھا جا سکا۔ بعد میں جب عربوں کے درمیان اسلام سے پہلے آپس میں لڑائیوں اور جنگوں کا زور ہوا تو ان کی توجہ فخر و حماسہ کی طرف مبذول ہو گئی اور جب اسلام آیا تو راویوں نے اس صنفِ نظم کی نہ روایت کی اور نہ ہی اسے یاد رکھا کیونکہ اس میں بت پرستی کی عظمت تھی اور اسلام اسے حرام قرار دیتا ہے۔ اس لئے انھوں نے جاہلی شعرا کا صرف وہی کلام یاد رکھا جس کا تعلق فخر و حماسہ سے تھا مگر اس کے باوجود دینیات سے متعلق کچھ اشعار ہم تک پہنچے ہیں جن کا ذکر بعض شعرا کے تذکروں میں ضمناً آتا ہے۔ جیسے امیہ بن ابی الصلت کے تذکرہ میں ملتا ہے[1]۔ اور یہاں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ "ہمارے تذکرہ نگاروں اور عرب نقادوں نے اس صنفِ شاعری کی تلاش و جستجو کی طرف بھی شاید دھیان نہیں دیا ورنہ جس طرح "الیازہ" اور "اوڈیسی" نے یونانی رزمیہ شاعری کے جمال و جلال کو اجاگر کیا ہے اسی طرح ہماری قدیم شاعری نے بھی ہماری اجتماعی زندگی اور ہمارے ہیروؤں کی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہوگا۔

1۔ جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، جلد ۱۔

لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ ہم نے اپنے ادب کا اس نقطہ نظر سے کبھی مطالعہ نہیں کیا ورنہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی کہ ادب عربی رزمیہ شاعری میں کسی ادب سے کم نہیں ہے۔[1]

یہ بات اس مفروضہ پر کہی جاتی ہے کہ بعض مورخین کے خیال کے مطابق ہومر کے ایلیاڈ اور مہابھارت و رامائن وغیرہ کے مقابلہ میں جاہلی شعرا کا کلام کہیں زیادہ تھا۔ یہ لوگ دلیل میں یہ کہتے ہیں کہ ابوتمام مصنف حماسہ کو ۱۴ ہزار مختصر قصیدے یاد تھے۔ اور بڑے بڑے قصائد اور چھوٹی نظموں کے علاوہ تھے۔ حماد راویہ کو ۲۷ ہزار قصیدے یاد تھے۔ اس کے علاوہ حروف تہجی کے ہر حرف پر اسے ایک ہزار قصیدے یاد تھے۔ اسی طرح اصمعی کو ۱۶ ہزار مختصر قصیدے یاد تھے۔ ابوضمضم ایک سو شعرا کے اشعار کی روایت کرتا تھا اور ان میں سے ہر ایک کا نام عمرو تھا اور یہ بات یوں قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ عمرو بن العلا مشہور راوی اور نقاد نے کہا ہے کہ "ما انتهى اليكم مما قالت العرب الا اقله، ولو جاءكم وافرا لجاءكم علم وشعر كثير"[2]

لیکن ہمارا خیال ہے کہ دور جاہلی میں رزمیہ یا الشعر القصصی کا وجود نہیں ہے۔ کیونکہ رزمیہ شاعری کی بنیاد، شاعر کی قوت تخیل اور دیومالائی تصورات پر ہے اور عربوں میں ہمیشہ سے اور خاص طور سے دور جاہلی میں نازک خیالی یا دقیق قوت تخیل جس کی بنیاد ذہنی کاوش پر ہو، مفقود رہی ہے۔ پھر جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ اس صنف شاعری میں تحلیل و تدقیق کی ضرورت ہوتی ہے اور عرب ہمیشہ سے اس سے گریز پا رہے ہیں، اور یہ بات محقق ہے کہ عربوں کے یہاں "اساطیر" یعنی دیومالائی تصورات اور ان سے متعلق قصوں کا وجود نہیں تھا۔ اس لئے ان کے یہاں اس قسم کی شاعری کے وجود کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بہادری وغیرہ کے جن قصوں کا ذکر کیا جاتا ہے جیسے ابوزید عنترہ کے قصے تو ان میں زبان و اسلوب کی چاشنی ضرور ہے لیکن رزمیہ شاعری کے دوسرے عناصر مفقود ہیں۔ پھر خود ڈاکٹر طہ حسین وغیرہ نے ان کی صحت پر شک وشبہہ کا اظہار کیا ہے۔ رہا جرجی زیدان کا یہ کہنا کہ مسلمان راویوں نے بت پرستی کے مضامین کی وجہ سے ایسے اشعار کو یاد نہیں کیا کیونکہ اسلام میں بت پرستی حرام ہے تو اس میں کوئی جان نہیں۔ آخر انھیں مسلمان راویوں نے تو امرؤالقیس اور عمرو بن کلثوم کی معاملہ بندی کی داستانوں اور النابغۃ الذبیانی کا وہ مشہور قصیدہ نقل کیا ہے۔ جس میں متجردہ (نعمان کی بیوی)

۱- ڈاکٹر طہ حسین: من حدیث الشعر والنثر

۲- المزهر للسیوطی

کا ایسا وصف ہے جس میں اس کا انگ انگ اس طرح جھلکتا ہے جیسے صاف ستھرے پانی میں کسی بلوریں مجسمہ کا عکس دکھائی دے۔ ان کے علاوہ کئی دیگر شعرا کی محبوباؤں کے سراپا کے اشعار نقل کئے ہیں، جو انتہائی عریاں اور فحش ہیں۔ حالانکہ اسلام نے اس عریانی اور فحاشی سے بھی منع کیا ہے۔ پھر انھیں مسلمان راویوں نے بشار بن برد، ابو نواس، مسلم بن الولید اور الضحاک جیسے اباحی اور عریاں گو شعرا کے کلام کو محفوظ رکھا اور اسے مدوّن کر کے عمر جاوداں بخشی۔ حالانکہ یہ اشعار اتنے عریاں، مخرب اخلاق، غارت گر دین وایمان تھے کہ اس کی سزا میں بعض شعرا کو کوڑے مارے گئے اور بعض کو قتل تک کر دیا گیا۔[1] اس لئے اس قول میں کوئی جان نہیں۔ یہ محض اپنی زبان کی عصبیت اور احساس برتری کا نتیجہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دور جاہلی میں رزمیہ شاعری کا وجود نہیں اور نہ حالات اور نہ عربوں کی بیک گراؤنڈ ایسی تھی کہ اس میں رزمیہ شاعری پیدا ہو سکتی۔ البتہ ان کے یہاں رزمیہ جیسی شاعری کی ایک دوسری قسم "رجزیہ" ملتی ہے جس کا رواج زمانہ جاہلی سے چلا آرہا تھا۔ تفصیل کتاب کی دوسری جلد میں آئے گی۔

۲۔ تمثیلیہ یا الشعر التمثیلی

تمثیلی نظم درحقیقت "منظوم مکالمہ" کا دوسرا نام ہے اور یہیں سے تمثیلی نظم کا تعلق ڈرامہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جب شاعر یہ دیکھتا ہے کہ کلام کو محض شعر کے قالب میں ڈھال دینے سے اثر اندازی میں وہ زور پیدا نہیں ہوتا، جسے وہ پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے خیالات وافکار اور محسوسات کو وہ واقعات کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ اور انھیں کرداروں کی زبان سے اس طرح ادا کراتا ہے کہ واقعات کی ہوبہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی لئے تمثیلیہ میں کرداروں کے ساتھ عام طور سے مناظر بھی پیش کئے جاتے ہیں اور انھیں اس طرح مربوط کیا جاتا ہے کہ اسٹیج پر بھی دکھانا ممکن ہو سکے۔

شعرا عام طور سے اس صنف شاعری کے ذریعہ اخلاقی فضائل اور انسانی خوبیوں یا حکمت وفلسفہ کی عکاسی کرتے ہیں خواہ انھیں اسٹیج پر دکھانا ممکن نہ ہو۔ اس لئے دنیا کی تمام ترقی

۱۔ اس زمانے کی شاعری کی عریانی وغیرہ کا اندازہ مالک بن دینار کے اس جملے سے بخوبی ہوتا ہے، جو انھوں نے بشار کے بارے میں کہا تھا۔ "ماشئ ادعی لاھل ھذہ المدینۃ الی الفسق من اشعار ھذا الاعمی الملعون" مخضرم شعرا میں الاغلب العجلی کے عریاں وفحش قصیدہ کے لیے دیکھیے طبقات فحول الشعراء جمحی ص۳۲۔

یافتہ زبانوں میں منظوم ڈرامے بکثرت ملتے ہیں۔

رزمیہ شاعری کی طرح تمثیلیہ بھی دورِ جاہلی میں نہیں ملتا اور اس کے بھی وہی اسباب ہیں، جن کا ذکر رزمیہ شاعری کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ جہاں تک حاتم طائی کی سخاوت کے قصوں یا سموأل بن عادیا کی وفاداری کی داستانوں کا تعلق ہے تو یہ سب محض زیب داستان کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ ان کے اندازِ بیان اور سیاق و سباق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اسلامی دور کی پیداوار ہیں۔[1] رواۃ نے انھیں لوگوں کو فضائل اور اخلاقِ جمیلہ پر ابھارنے کے لئے وضع کیا تھا مشہور منظوم ڈرامہ نگار عزیز اباظہ نے کھلے لفظوں میں اور افسوس کے ساتھ عربوں کے اسی تقصیر کا اعتراف کیا ہے۔ (۴)

۳۔ طربیہ یا الشعر الغنائی

طربیہ شاعری کا مفہوم شروع میں یہ رہا کہ یہ شاعری کی وہ قسم ہے جسے گا کر پڑھا جاسکے۔ ان گانوں کا تعلق عام طور سے حسن و عشق اور قلبی واردات سے ہوتا تھا۔ اس میں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں بھی جھلکتا تھا۔ اور پھر یہ غمِ دوراں بڑھ کر خود شاعر کا اپنا غم بھی بن جاتا تھا۔ رزمیہ شاعری کے برخلاف طربیہ میں شان و شکوہ اور جلال نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مواد ہلکا پھلکا لیکن نشیلا اور رسیلا ہوتا ہے طربیہ میں شاعر حسن و عشق کے جان فزا نغمے بھی گاتا ہے اور حب الوطنی کے سرمدی اور لاہوتی راگ بھی۔ یہاں شاعر اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ اپنے دل کی دھڑکنیں سناتا ہے اور انھیں کے ذریعہ دوسروں کے دل کی دھڑکنیں سن کر ان کا غم اپنا غم بنا لیتا ہے کیونکہ شاعر یہاں اپنی شخصیت میں کائنات کے درد و غم اور اس کی ابدی مسرتوں کو سمو لیتا ہے اور زندگی کے تجربات کو بڑی خوبصورتی سے اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتا ہے اور پھر طربیہ کے ذریعہ اس کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ اس لئے طربیہ میں صرف مسرت اور حسن و عشق اور حکایت دیدہ و دل کے دل فریب

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے:

(۱) جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ۔ جلد ۱۔

(۲) محمود تیمور: دراسات فی القصۃ والمسرح۔

(۳) احمد امین: فجر الاسلام، الفصل الخامس

(۴) محمد عبدالغنی حسن کی کتاب "الشعر العربی فی المہجر" پر ان کا مقدمہ مطبوعہ دارالعلم الکویت

نغموں کو ہی شامل نہیں کیا جاتا بلکہ اس میں مدح، ہجو، حماسہ، فخر اور مرثیہ وغیرہ کو بھی شامل کیا جاتا ہے اور چونکہ طربیہ میں انسانی زندگی اور اس کے تجربات کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ صنف غالباً اسی وقت شروع ہو چکی تھی جب کہ انسان نے لکھنا پڑھنا نہیں شروع کیا تھا۔

دور جاہلی کی شاعری میں طربیہ کے تمام اصناف اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ خاص طور سے غزل فخر وحماسہ اور مرثیہ میں جاہلی شعرا نے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کی مثال بعد میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض اصناف میں تو بعد میں آنے والوں نے جاہلی دور کے شعراء ہی کی خوشہ چینی کی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ عربوں کی زندگی اور ان کے مخصوص حالات میں طربیہ کے تمام دواعی اور بواعث موجود تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس میں اپنے دل ودماغ اور فکر ونظر کی تمام توانائیاں صرف کر دی ہیں۔ جس کا اندازہ آگے ان کے کلام کے مطالعہ سے ہوگا۔

جاہلی زمانہ میں شعر اور شعرا کی اہمیت

جاہلی زمانہ میں شعراء اور ان کے کلام کی بڑی اہمیت تھی۔ لوگ ان کی بات کو دھیان سے سنتے اور اس کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے۔ عرب قبائل کی صورت میں رہتے تھے۔ اپنے ہتھیاروں اور لوگوں کی تعداد کے علاوہ انھیں اپنے قبیلہ کے مفاخر کو گنانے، اپنی خوبیوں اور بھلائیوں کا ذکر کرنے، دوسرے قبائل کے شعراء اگر ہجو کہیں تو ان کا جواب دینے کے لئے اور فخر و مباہات کے موقع پر مقابلہ میں آنے کے لئے انھیں شعرا کی ضرورت پڑتی تھی۔ انھیں ضروریات اور اہمیت کے پیش نظر جب کسی قبیلہ میں کوئی شاعر پیدا ہو جاتا تو سارا قبیلہ خوشی کے شادیانے بجاتا، جشن کرتا اور شادی بیاہ سے بڑھ دھوم دھام کرتا۔ ابن رشیق نے لکھا ہے کہ "جب کسی عربی قبیلہ میں کوئی شاعر پیدا ہو جاتا تو دوسرے قبیلے اس کے پاس آتے اور اسے مبارکباد دیتے اور پکوان پکاتے، عورتیں آتیں اور "مزہر" یعنی عود بجاتیں، جس طرح شادی بیاہ کے موقعوں پر کرتی ہیں اور چھوٹے بڑے سب خوشیاں مناتے۔ اس لئے کہ یہ (شاعر) ان کی عزتوں کو بچاتا، ان کی حمایت کرتا، ان کے مفاخر اور کارناموں کو دوام بخشتا اور ان کی تعریف میں قصیدے کہہ کر دوسروں کے مقابلہ میں ان کو رفعت و بلندی عطا کرتا تھا۔ اس لئے عربوں کا دستور تھا کہ وہ صرف تین موقعوں پر مبارکباد دیتے تھے۔ ایک تو اس وقت جب کسی کے یہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا یا کوئی شاعر ابھرتا، یا کوئی (اصیل) گھوڑی بچہ دیتی۔[1]"

۱۔ العمدۃ، لابن رشیق القیروانی۔

جاہلی سماج میں شاعر کی یہ حیثیت بلا وجہ نہ تھی۔ اس معاشرہ میں شاعر کی اتنی اہمیت اور سماج میں اتنا اثر تھا کہ محض ایک شعر کے کہہ دینے سے عزتیں بگڑ جاتیں اور بگڑی عزتیں بن جاتی تھیں۔ سر کو اونچا کر کے، اکڑ کر چلنے والے افراد گردنیں جھکائے نظریں بچائے چلتے، اور جو لوگ ذلیل و خوار سمجھے جاتے، وہ کسی شاعر کے صرف ایک شعر کے کہہ دینے سے گردنیں اونچی کر کے چلتے اور اپنا نام اور قبیلہ کا نام بتاتے وقت غرور سے سر اونچا کر کے نام لیتے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ جب کسی شاعر نے کوئی قصیدہ یا شعر کہا تو فوراً زبان زد خاص و عام ہو کر سارے قبائل میں پھیل جاتا تھا۔ اس کا تذکرہ ان کی بیٹھکوں اور محفلوں میں ہوتا، اور اس کے اثرات سارے قبائل پر پڑتے۔ اغانی نے روایت کی ہے کہ شاعر کے اس اثر کے پیش نظر جب معلقات کا مشہور شاعر اعشیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر آپ کی شان میں مدحیہ قصیدہ پڑھنا چاہا، اور اس کی خبر ابو سفیان کو ہوتی ہے تو انھوں نے قریش کے ممتاز افراد کو جمع کر کے کہا کہ "خدا کی قسم اگر یہ محمد کے پاس چلا گیا اور آپ کی پیروی کر لی تو اپنے اشعار کے ذریعہ سارے عرب کی آگ تمہارے خلاف بھڑکا دیگا۔ اس لئے اس کے لئے سو اونٹ جمع کرو۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور اعشیٰ نے وہ اونٹ لے لئے اور اپنے شہر کو چلا گیا"۔ شاعر کے کلام کے اثر اور خاص طور سے اس اعشیٰ کے کلام کے اثر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ محض اس کے ایک شعر کہہ دینے سے آٹھ مایوس لڑکیوں کی شادیاں آناً فاناً ہو گئیں۔

کہتے ہیں کہ قبیلہ کلاب کے ایک شخص محلق نامی کی آٹھ لڑکیاں تھیں جن کی شادی اس وجہ سے نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ غریب تھا۔ اتفاق سے انھیں دنوں اعشیٰ مکہ جاتے ہوتے ادھر سے گزرا۔ محلق کی بیوی کو جب اس کا علم ہوا، تو اس نے اپنے شوہر کو بھیج کر سب سے پہلے اس کو اپنے یہاں مدعو کر لیا۔ محلق نے اس کے لئے ایک اونٹنی ذبح کی اور اس کی بیوی نے بڑے عزت و احترام سے اس کی خاطر و مدارات کی اور خوب کھلایا پلایا۔ چنانچہ رات بھیگے جب شراب کا نشہ چڑھا تو اعشیٰ نے محلق سے اس کے بال بچوں کے متعلق پوچھ لیا۔ محلق نے اپنی لڑکیوں کی بپتا سنا دی۔ شاعر کے دل میں اس کی بات اتر گئی۔ چنانچہ جب وہ عکاظ کے میلے میں پہنچا تو اس نے اپنا مشہور قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے:

أرقت وما هذا السهاد المؤرق ۔۔۔۔ وما بي من سقم وما بي معشق

یعنی میں رات بھر نہ سو سکا۔ اس کی وجہ بیماری یا عشق نہ تھا۔

اس کے بعد گریز کر کے محلق اور اس کی سخاوت و مہمانداری کی تعریف بڑے بلیغ انداز

میں کی۔ کہتا ہے:

لعمری لقد لاحت عیون کثیرۃ ۔۔۔ الی ضوء نار فی الیفاع تحرق

تشب لمقرورین یصطلیانها ۔۔۔ وبات علی النار الندی والمحلق

رضیعی لبان ثدی ام تقاسما ۔۔۔ باسحم داج عوض لا نتفرق

یعنی میری جان کی قسم بہت سے لوگوں نے یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ایک میدان میں آگ جل رہی ہے، جسے دو سخت سردی کھائے ہوئے اشخاص تاپ رہے ہیں، ان میں سے ایک تو سخاوت تھی اور دوسرا محلق تھا جنھوں نے پوری رات ساتھ گزاری، ان دونوں نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے، اور قسم کھائی ہے کہ زندگی میں کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ جونہی اعشیٰ نے محلق کی شان میں یہ مدحیہ قصیدہ ختم کیا، چاروں طرف سے امراء، شرفاء اور بڑے لوگوں نے اس کی لڑکیوں کے پیام دینا شروع کر دیا، اور ایک ہفتہ کے اندر ہی اس کی آٹھوں لڑکیوں کی شادیاں رئیسوں کے گھرانوں میں ہو گئیں۔

شعر اور شاعر کے اثرات کے واقعات تاریخ کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں[1] جن سے

ا۔ اس طرح کی ایک مثال حضرت حسان کا واقعہ ہے جو بنی عبد المدان کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت حسان نے ان کی ہجو ان اشعار سے کی تھی۔ لا باس بالقوم من طول ومن غلظ ـــ جسم البغال واحلام العصافیر

یعنی اگر یہ لوگ قدآور اور تنومند ہیں تو کوئی خاص بات نہیں ہے، کیونکہ ان کے یہ جسم خچروں کے سے اور عقلیں چڑیوں کی ہیں۔ چنانچہ بنی عبد المدان کے لوگوں نے ان سے کہا کہ خدا کی قسم اے ابو الولید آپ نے تو ایسا کر دیا ہے کہ اب ہم کو اپنے جسموں کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ حالانکہ ایک زمانہ میں ہم اپنی تنومندی پر فخر کیا کرتے تھے۔ اس پر حسان نے فرمایا کہ خیر کوئی بات نہیں ہے، میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کی شان میں مندرجہ ذیل شعر کہے، جن سے ان کی عزت پھر بحال ہو گئی:۔

وقد کنا نقول اذا رأینا ۔۔۔ لذی جسم یعد وذی بیان

کأنک أیها المعطی لسانا ۔۔۔ وجسما من بنی عبد المدان

یعنی جب ہم کسی ایسے آدمی کو دیکھتے تھے، جو خوش اندام اور خوش بیان ہوتا، تو کہتے تھے کہ اے وہ شخص جسے اتنی اچھی زبان اور ایسا جسم عطا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تو بنی عبد المدان کا فرد ہے۔" چنانچہ اس مدح کے بعد پھر عبد المدان کے لوگ اپنے سینے پھلا کر اور سر اونچے کر کے چلا کرتے تھے۔

اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی جاہلی معاشرہ میں شاعر کو وہ حیثیت حاصل تھی جو کسی بادشاہ کو بھی میسّر نہ تھی۔ وہ اپنی زبان سے وہ کر دیتا، جو بڑے بڑے جابر یا صاحب عزّ و جاہ اپنی طاقت اور سطوت کے باوجود نہ کر پاتے تھے۔

عرب شعر کیسے کہتے تھے

عرب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، فطرتاً شعری ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ دورِ جاہلی میں عام طور سے شعراء فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ جب طبیعت جولانی میں آتی تو زبان سے بغیر کد و کاوش کے اشعار نکلنے لگتے اور اس طرح کہ نہ الفاظ کے حسن و خوبصورتی اور موزونیت میں کمی ہوتی اور نہ معانی و مطالب میں نقص اور نہ اسلوب بیان میں جھول، جیسے حارث بن حلزہ (الیشکری) اور عمرو بن کلثوم کہ ان کو شعر کہنے کے لئے سوچنے یا طبیعت پر زور دینے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مگر جن شعراء نے شاعری کو پیشہ بنا رکھا تھا اور اس کے ذریعہ مال و دولت اور انعام و اکرام حاصل کرتے تھے اور اپنے اشعار کو بڑی محفلوں اور بڑے موقعوں پر پڑھتے تھے، ان کا معاملہ دوسرا تھا۔ یہ لوگ ذہن و دماغ پر زور دے کر بتکلف شعر کہتے۔ پھر ان اشعار پر نظر ثانی کرتے، الفاظ و اسلوب بیان، معانی و مطالب پر دوبارہ غور کرتے اور ان میں کتر بیونت کر کے اچھے اشعار چھانٹ کر اور ان کی نوک پلک ٹھیک کر کے قصیدہ کو آخری شکل دیتے۔ ظاہر ہے اس طرح سے جب شعر کہے جائیں گے تو وہ فن کا اعلیٰ اور بے مثال نمونہ ہوں گے۔ چنانچہ جن شعراء نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ ان کا کلام جاہلی شاعری کا اعلیٰ اور بے مثال نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کے شعراء میں خاص طور سے زہیر بن ابی سلمیٰ اور نابغہ الذبیانی کا نام آتا ہے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ تو ایک قصیدہ کی سال بھر تک اصلاح اور نظر ثانی کیا کرتا تھا۔ اس لئے اس کے قصائد کو حولیات (جن پر ایک سال گزر چکا) کہتے ہیں۔ نابغہ الذبیانی کے معذرت کے اشعار اس طریقہ کے بہترین مثال سمجھے جاتے ہیں۔

عام جاہلی شعراء کے کلام میں اس زمانہ کے اعتبار سے اعلیٰ اخلاقی تعلیمات، شریف اور پاکیزہ معانی اور بلند پایہ اغراض و مقاصد ملتے ہیں۔ ان کے یہاں انعام و اکرام کی لالچ سے کسی امیر یا بڑے آدمی کی مدح یا کسی قبیلہ کی خواہ مخواہ اور بلا سبب ہجو نہیں ملتی مگر کچھ شعراء ایسے بھی گزرے ہیں، جنھوں نے شعر کو مال و دولت، انعام و اکرام حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ چنانچہ یہ شعراء اس زمانے

۱۔ حارث نے ایک پورا قصیدہ برجستہ کہا جو فخر و حماسہ میں مثال ہے۔ تفصیل اس کے حالات زندگی میں ملاحظہ کیجئے۔

کے بادشاہ، روٗسار اور امراء کی شان میں مدحیہ قصیدے کہتے تھے اور انھیں پیش کرنے کے لئے سفر کرکے ان کے درباروں میں جاتے اور اپنا کلام سنا کر ان کے انعام واکرام سے مالا مال ہوکر اپنے گھروں کو واپس آتے تھے۔ اس زمرہ میں خاص طور سے النابغہ الذیبانی اور حسان بن ثابت کا نام لیا جاتا ہے۔ جو النعمان بن المنذر اور غستانی بادشاہوں کی تعریف میں مدحیہ قصیدے کہتے تھے اور زہیر بن ابی سلمٰی کا نام بھی ہے جو ہرم بن سنان کی شان میں اور امیہ بن ابی الصلت کا جو عبد اللہ بن جدعان کی شان میں اور اعشیٰ قیس کا جو نہ صرف بادشاہوں بلکہ عوام اور بازاری لوگوں کی شان میں بھی مدحیہ قصیدے کہتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے کہ وہ عجمیوں کے درباروں میں بھی مدحیہ قصیدے لکھ کر لے جاتا اور ان سے بھی انعام واکرام لینے میں شرم وحجاب نہ محسوس کرتا۔ اس کی وجہ سے آخر میں اس پیشہ کو اشراف حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے اور شعر وشاعری کرنے کے مقابلہ میں خطابت کو ترجیح دیتے تھے

جاہلی زمانہ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات

گزشتہ صفحات میں ہم نے شعر، اس کی حقیقت، اس کی نشو ونما اور ترقی کے مدارج کا قدرے تفصیل سے مطالعہ کیا۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ دورِ جاہلی میں شعرا نے کن اصنافِ سخن اور اغراض پر طبع آزمائی کی ہے اور اس عہد کی شاعری اور شعرا کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ آسانی کے لئے ہم اس حصہ کو حسبِ ذیل عنوانوں پر تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ جاہلی دور میں شاعری کے اصناف واغراض

۲۔ جاہلی دور میں شاعری کے معانی اور مطالب

۳۔ جاہلی دور میں شاعری کا اسلوبِ بیان اور الفاظ کی سج دھج

۴۔ جاہلی دور میں شاعری کا وزن اور قافیہ

جاہلی دور میں شاعری کے اصناف واغراض

یوں تو جاہلی دور کے شعرا نے اپنی ذہنیت، اپنی عقلی وفکری نشو ونما، اپنے ماحول اور اپنی سماجی اور شخصی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اس زمانہ کے مخصوص حالات کی وجہ سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے شاید بہت سے نمونے ہم تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ البتہ جن اغراض واصناف کے نمونے ہم تک پہنچے ہیں، ان میں سے مشہور اور مروج اصنافِ سخن جن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ حسبِ ذیل ہیں؛

غزل: اسے "نسیب اور تشبیب" بھی کہتے ہیں

جاہلی دور کے اصناف سخن میں سب سے اہم اور ممتاز صنف غزل ہے اور اس غزل کا موضوع اور محور عورت تھی کیونکہ غزل کے معنی ہیں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی آپس کی بات چیت اور عورتوں سے لطف اندوزی اور ان سے حسن و محبت کی باتیں کرنا[1]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب قبائل اور خاص طور سے جزیرۂ عرب کے شمال کے عرب بدوی زندگی گزارتے تھے اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، چارہ اور پانی کی تلاش میں ادھر ادھر آیا جایا کرتے تھے۔ اس طرز زندگی میں مختلف قبائل اور ان کے افراد، لڑکے لڑکیوں، بڑے بوڑھوں کو آپس میں ملنے جلنے کے مواقع بھی ملتے تھے۔ زندگی فطری تھی اور فراغت کے اوقات بہت زیادہ اور جذبات کی فراوانی۔ اس لئے حسن و عشق کے قصوں کے پروان چڑھنے کے خاصے مواقع حاصل تھے۔ چنانچہ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس معاشرہ میں بھی دلوں کی دنیائیں آباد ہوئیں اور اس کا مرکز و محور عورت ہوتی، جو فطری بات تھی۔ کیونکہ عورت اس معاشرہ میں صرف دل کی دنیا ہی نہیں آباد کرتی تھی، بلکہ وہ مردوں کے دوش بدوش کارگاہِ حیات میں شریک اور ساتھی بھی تھی، اور اس وجہ سے صحیح معنوں میں زندگی کی النصف الجمیل تھی۔ جب تک یہ "خوبصورت نصف زندگی" نہ مل جاتی، زندگی نامکمل، سونی اور ویران تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی ادب میں جانِ غزل، شانِ غزل اور مرکز غزل ہمیشہ سے ہی عورت رہی ہے۔

امرؤ القیس سے لے کر عمر بن أبي ربیعہ اور جمیل سے لے کر قیس اور اس کے ہم مشرب شاعروں کی دنیائے دل کی ملکہ، ان کی شاعری کا سرچشمہ یہی عورت تھی۔ اس لئے اس کی خاطر سب کچھ لٹا دینے سے شاعر دریغ نہیں کرتا تھا۔ امرؤ القیس، جسے الملک الضلیل کے نام سے پکارا جاتا ہے، اپنی صحرا نوردیوں کے بعد جب ایک دفعہ اپنی محبوبہ عنیزہ کے پاس رات کی تاریکی میں آیا تو اس نے کہا کہ:

۱۔ لغوی اعتبار سے غزل، نسیب، تشبیب میں بہت تھوڑا فرق ہے اور ان سب الفاظ کے معنی ہیں: "حدیث الفتیان و الفتیات واللہو مع النساء ومغازلتھن"۔ لسان العرب، جلد ۴۔ ابن سلام الجمحی نے طبقات الشعراء میں کہا ہے کہ: "یعتبر الغزل والنسیب والتشبیب کلمات مترادفة" یعنی غزل، نسیب اور تشبیب ہم معنی الفاظ ہیں۔

مگر بعض علماء نے غزل اور نسیب میں تھوڑا سا فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ "غزل جس کے الفاظ، معنی و مطالب پاک صاف ہوں، جس میں شاعر اپنی محبوبہ کا نام نہ لے اور صرف اظہار شوق کرے وہ نسیب" کہلاتا ہے۔

سبالک اللہ انک فاضحی　　　الست تری السمار والناس احوالی

یعنی اللہ تجھ غارت کرے تو نے تو مجھے رسوا کر ڈالا۔ کیا تجھے دکھائی نہیں دیتا ہے کہ لوگ میرے آس پاس ابھی تک جاگ رہے ہیں اور گپ شب میں لگے ہوئے ہیں۔ تو اس نے برجستہ کہا کہ:

یمین اللہ ابرح قاعداً　　　ولو قطعوا رأسی لدیک واوصالی

یعنی خدا کی قسم میں یہاں سے نہیں اٹھوں گا چاہے لوگ میرا سر اور ہاتھ پاؤں تیرے پاس کاٹ کر رکھ دیں۔

یہ اس لئے کہ بدوی شاعر کے نزدیک "عورت زمین پر چلنے والی ہر شے سے زیادہ مکمل اور جاذب نظر ہے"۔ نابغہ ذبیانی کہتا ہے کہ:

غراء أکمل من یمشی علی قدم　　　حسنا وأملح من حاورته کلما

اعشیٰ نے پیرانہ سالی کے باوجود عورت کو مسیحا بتایا ہے۔ کہتا ہے:

لو اسندت میتاً الی نحرھا　　　عاش ولو ینقل الی قابر

یعنی اگر اس کی گردن سے کسی مردہ کو بھی چھوا دو تو وہ زندہ ہو جائے گا اور پھر اسے قبرستان لے جانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اعشیٰ کو اپنی مبالغہ بیانی کا احساس تھا۔ خود ہی کہتا ہے کہ:

حتی یقول الناس مما رأوا　　　عجباً للمیت الناشر

یعنی لوگ فرط حیرت میں بول پڑیں گے کہ دیکھو تو کتنی تعجب کی بات ہے کہ مردہ زندہ ہو گیا۔

عنترہ جیسا سخت کوش، تند خو اور جنگ جویانہ طبیعت کا مالک شاعر بھی جو ہر ظالم و جابر سے لڑنے مرنے کو تیار رہے، خود فراق محبوب میں مرا جا رہا ہے۔ کہتا ہے:

اقاتل کل جبار عنید　　　وتقتلنی الفراق بلا قتال

میں ہر سرکش و سخت ظالم آدمی سے برسرپیکار ہو جاتا ہوں، لیکن فراق مجھے بغیر لڑائی کے مارے ڈالتا ہے۔

عورت کی اس حیثیت اور اس سے اس قسم کے تعلق کی بنا پر جاہلی شاعری میں غزل کا موضوع عورت بن گئی جو اموی دور کے آخر تک حسن و عشق کے تخت زریں پر ملکۂ غزل و تشبیب بنی رہی یہاں تک کہ عباسی دور کے شروع میں بھی شعراء نے اسے اس کے تخت زریں سے اتارنے کی کوشش کی لیکن روایت پسند شعرا اور سماج کے صحت مند عناصر نے اس رجحان کے خلاف زبان و قلم سے جنگ کر کے

اس بدعت کا استیصال کر دیا۔ اور پھر سے عورت دنیائے غزل کی ملکہ بن گئی۔[1]

جاہلی شاعر اپنی غزل اپنی محبوبہ کے محاسن بیان کرنے سے شروع کرتا تھا جس میں اس کے گورے اور عطر بیز بدن، لمبی گردن، گلاب جیسے رخسار اور اس سے بڑھ کر اس کے اچھے اخلاق و عادات کی تعریف کرتا تھا، جیسے کہ نابغہ نے کہا تھا۔

بیضاً کالشمس وافت یوم أسعدھا   لم تؤذ أھلاً ولم تفحش علیٰ جار

والطیب یزداد طیباً ان یکون بھا   فی جید واضحۃ الخدین معطار

وہ سورج کی شعاعوں کی طرح گوری چٹی ہے ـــــــ۔ اپنے مرادوں کے دنوں کو پہنچ چکی ہے یعنی جوان ہو گئی ہے۔ نہ تو اس نے اپنے گھر والوں میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی اور نہ ہی کسی پڑوسی کے ساتھ بدکلامی کی۔ اور عطر کی خوشبو اس کی گردن سے لگ کر دوبالا ہو جاتی ہے جس میں دو گلگوں اور عطر بیز رخسار جڑے ہیں۔

اس کے بعد اپنی محبوبہ کے قیام اور پھر وہاں سے رخصتی کی داستان سناتا ہے۔ جیسے بقول زہیر بن ابی سلمیٰ :-

تبصر خلیلی ھل تری من ظعائن   تحملن بالعلیا من فوق جرثم

علون بانماط عتاق وکلۃ   وراد حواشیھا مشابھۃ الدم

اے میرے دوست ذرا نظر تو ڈالنا، کیا تجھے اس اونچی زمین پر جرثم تالاب کے اوپر کچھ عورتیں ہودوں میں بیٹھی ہوئی جاتی نظر آرہی ہیں (بیس سال گزرنے کے بعد شاعر اس جگہ سے گزر رہا ہے جہاں اس کی محبوبہ اس تالاب کے کنارے ٹھہری تھی اور جب اس کے قبیلے نے کوچ کیا تھا تو اس تالاب کے اوپر سے ہوتی ہوئی وہ گئی تھی۔ آج شاعر جب اس جگہ پہنچا تو اپنی گزشتہ محبت کے دنوں میں ایسا کھویا کہ اسے ہوش بھی نہ رہا کہ بیس سال گزرنے کے بعد بھلا کوچ کا وہ منظر اب تک کیسے قائم رہ سکتا ہے)۔ ان عورتوں نے اپنے ہودوں میں خوبصورت اور عمدہ فرش بچھا رکھے ہیں جن سے باریک اور حسین پردے لٹک رہے ہیں، جن کے کنارے خون جیسے سرخ ہیں۔

پھر محبوبہ کے کوچ کر جانے کے بعد اس کی نگری اور اسکے گھر کا ذکر کرتا ہے۔ اور ماؤنٹ کی اور فاختاؤں یا کبوتروں کی آواز سن کر یا بجلی کی چمک دیکھ کر یا آگ کی روشنی کو پا کر یا بادِ نسیم کی

۱۔ تفصیل کتاب کی تیسری جلد میں ملاحظہ ہو۔

سرسراہٹ سن کر محبوبہ سے ملنے کی شدید خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ پھر ان چشموں یا تالابوں کا ذکر کرتا ہے جہاں محبوبہ ٹھہری تھی، ان مرغزاروں کو یاد کرتا ہے جہاں اس نے چہل قدمی کی تھی۔ اس کے بعد اس کی ٹھہرنے کی جگہوں اور آس پاس جو خوبصورت اور خوشبودار پودے اور پھول ہیں، ان کا بڑے والہانہ انداز سے ذکر کرتا ہے[1]

اب رہا یہ سوال کہ جاہلی شاعروں میں سب سے پہلے غزل کس نے کہی، تو اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس جاہلی شاعری کا جو ذخیرہ ہے اس سے اس کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے، یعنی سلسلہ وار تاریخی اعتبار سے صحیح کوئی چیز ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے امرؤالقیس نے غزل کہی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں غزل کہنے کا سہرا نابغہ الذبیانی اور الاعشیٰ کے سر ہے۔ بہرحال اس میں سب کا اتفاق ہے کہ دور جاہلی میں عورت سے اظہارِ عشق اور اس کے اوصاف بیان کرنے میں امرؤالقیس کے مقابلہ میں کسی کو سبقت نہیں ہے اور نہ ہی اس سے بڑھ کر اس صنف میں کوئی پرگو گزرا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جاہلی شعرا کے غزلیہ کلام میں عورت سے اظہارِ عشق کرتے ہوئے کن جذبات

1۔ عنترہ نے محبوبہ کی نگری کے بارے میں کہا ہے۔

حییت من طلل تقادم عہدہ ۔۔۔ اقوی واقفر بعد ام الہیثم

زہیر نے محبوبہ کے ٹھہرنے کی جگہ پر بیس سال گزرنے کے بعد پہنچنے کا ذکر یوں کیا ہے۔

وقفت بہا من بعد عشرین حجۃ ۔۔۔ فلأیا عرفت الدار بعد توہم

محبوبہ کے جانے کے بعد جو چیزیں اور نشانیاں اس کی یاد دلانے کے لئے رہ گئیں تھیں، ان کا ذکر یوں کیا ہے۔

اثافی سفعا فی معرس مرجل ۔۔۔ ونؤیا کجذم الحوض لم یتثلم

کبوتر کی آواز سن کر محبوبہ کی یاد آنے کے بارے میں نابغہ نے کہا ہے۔

اتنسی حمام الورق ہیجنی ۔۔۔ وان تغربت عنا ام عمار

محبوبہ کے قافلے کے قیام کرنے کی جگہوں کا ذکر زہیر کے یہاں یوں ہے:۔

بکرن بکورا واستحرن بسحرۃ ۔۔۔ فہن ووادی الرس کالید للفم

فلما وردن الماء زرقا جمامہ ۔۔۔ وضعن عصی الحاضر المتخیم

کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا خیال ہے کہ جاہلی شعرا اپنی غزلیہ شاعری میں لطیف احساسات اور پاکیزہ جذبات کی عکاسی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انکی غزل ایک طرح سے "عورت کا سراپا" ہے۔ ان کے یہاں حکایت دیدہ و دل کی لطیف بیانی اور نازک خیالی نہیں ملتی۔ وہ عورت کا تذکرہ بھی اس طرح کرتے تھے جس طرح اپنے اونٹ کا اور کہیں جذبات اور احساسات کا ذکر ہے تو وہ محض سخن گسترانہ بات تھی جو بہت جلد ختم ہو جاتی تھی اور اس کی بنیاد بھی جنسی جذبات پر ہوتی تھی۔ کیونکہ انکے جذبات اور احساسات کا سرچشمہ جنسیت اور لذتیت تھی۔ اسی لئے امرؤالقیس اور نابغہ کے یہاں عورت کا یہ مادی وصف نمایاں ملتا ہے، جس میں عورت کے اعضا اور محاسن کا ذکر تو بہت تفصیل سے ہے مگر پاکبازی اور عفت کا پہلو بہت کمزور ہے۔[1]

مگر ہمارے خیال میں یہ بات پوری طرح صحیح نہیں کیونکہ ہمیں جاہلی غزل گو شعرا میں بعض ایسے شاعر بھی ملتے ہیں، جن کے کلام میں پاکیزہ جذبات اور احساسات کا وصف بہت ہے۔ بلکہ پاکیزہ جذبات کے ساتھ رفعت خیال اور ندرت بیان بھی ہے۔ جیسے المرقش الاکبر اور الشنفری کا غزلیہ کلام۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور ان کے ہم نفس اس قسم کے اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کا نمونہ اپنی جگہ پر آئے گا۔ (۲)

فخر و حماسہ

یہ صنف بھی جاہلی شاعری کے محبوب اصناف میں سے ہے۔ اس صنف میں شاعر اپنی، اپنے آباؤ اجداد کی اچھائیاں، ان کے نیک کام، ان کی بہادری اور شجاعت، ان کی تعداد اور حسب و نسب میں برتری کے قصے سناکر دوسرے قبائل کے مقابلہ میں فخر کرتا ہے اور جنگ و جدل کے موقعوں پر انھیں فضائل کو گناکر جوش پیدا کرتا ہے۔ فخر و حماسہ عربی کی اتنی ممتاز اور نمایاں صنف ہے کہ ابوتمام اور بحتری نے حماسہ کے نام سے جاہلی دور کی فخریہ اور جوشیلی شاعری کے مجموعے مرتب کئے ہیں جو بہت مقبول اور اب تک رائج ہیں خاص طور سے حماسہ ابوتمام کہ اس کو کئی جگہ نصاب تعلیم میں داخل کیا گیا ہے۔

۱۔ حدیث الاربعاء، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، جلد اول۔

۲۔ نمونہ مرقش کے کلام میں ص ۱۹۴ پر ملاحظہ کیجیے۔

مدح

مدح سے مراد کسی باحیثیت آدمی یا کسی بادشاہ، وزیر یا سپہ سالار کے اخلاق فاضلہ کی تعریف توصیف ہے۔ یہ اخلاق حمیدہ جاہلی شاعر کے نزدیک سخاوت وکرم، مہمانداری، بہادری، پاکدامنی وپاکبازی اور عدل وانصاف اور صلح وصفائی تھے۔ چنانچہ جن لوگوں میں یہ صفات پائی جاتی تھیں، جاہلی شعرا انکی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ ان کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ ان کی بدولت ہمیں بعض بادشاہوں، امراء اور رؤساء کے اخلاق وعادات، طرز زندگی اور بود وباش کا اندازہ ہوتا ہے اور اس طرح اس زمانے کے کلچر کی ایک جھلک بھی سامنے آجاتی ہے، جو اور کہیں نہیں ملتی۔ اور چونکہ اس کے ذریعہ محاسن ومفاخر اور اخلاق حمیدہ کا ایک طرف چرچا ہوتا تھا تو دوسری طرف یہ خوبیاں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی تھیں۔ اس لئے ممدوحین دل کھول کر اس کا صلہ بھی دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں بقول یزید الحارثی "اگر ان خوبیوں پر تعریف وتوصیف نہ کی گئی تو گویا آدمی پیدا ہی نہیں ہوا ——— إذا الفتی لاقی الحمام رأیته

لولا الثناء، کأنه لم یولد

مدحیہ قصائد کا عروج جاہلی شاعری میں اس وقت ہوا جب کہ بعض شعرا نے اسے حصول مال وجاہ کا ذریعہ بنا لیا اور ممدوحین نے اس کے صلہ میں خوب انعام واکرام دینا شروع کیا۔ جاہلی شعراء میں مدحیہ قصائد کہنے میں زہیر بن ابی سلمٰی، نابغہ الذبیانی اور الاعشیٰ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

مرثیہ

مرثیہ کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کے اوصاف واخلاق کا ذکر کر کے اس کے مرنے پر رنج وغم کا اظہار کیا جائے اور اس کے بچھڑ جانے سے گھر اور خاندان پر جو مصیبت پڑی ہے اس کا ذکر کیا جائے۔ ابن رشیق نے اپنی کتاب العمدہ میں لکھا ہے کہ جاہلی زمانہ میں جب کوئی کسی کے مرنے پر مرثیہ کہتا تھا تو " بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہوں کی موت، بڑے بڑے ملکوں کی تباہی، عظیم الشان قوموں کی فنا کی مثالیں دیتا اور ان کے مقابلہ میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے تنومند پہاڑی بکروں اور جھاڑیوں میں چھپے رہنے والے شیروں اور چٹیل میدانوں میں پھرنے والے زبروں، گدھوں، عقابوں اور سانپوں کی قوت ودرازیٔ عمر کی طرف توجہ دلاتا۔ مطلب یہ تھا کہ بڑے اور شریف لوگوں کی عمریں تھوڑی ہوتی ہیں اور جنگلی جانور، چرند وپرند بہت دنوں تک جیا کرتے ہیں۔ گویا کہ موت

بڑائی کی نشانی ہے اور طول عمر بے مصرف ذلت کی زندگی۔

ہجو

ہجو کا مطلب یہ تھا کہ کسی آدمی یا کسی قبیلہ کی برائیاں، اچھالی جائیں۔ اور اچھائیاں چھپائی جائیں۔ ابتدا میں عربوں کا قاعدہ تھا کہ ہجو میں بیہودہ گوئی یا فحش باتیں نہیں کہتے تھے، بلکہ جس کی ہجو کرتے تھے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور سماج و معاشرہ میں اس کی جو حیثیت تھی اسے گرانے کی کوشش کرتے، اس کی ظاہری سج دھج اور ٹیپ ٹاپ کا خاکہ اڑاتے مگر بعد میں جب شعر و شاعری پیشہ بن گئی اور روزی کمانے کا ذریعہ، تو ہجو میں فحش گوئی اور ابتذال شامل ہو گیا۔ جیسے زہیر بن ابی سلمی کا قول ؛

وما أدري ولست اخال أدري　　　أقوم آل حصن أم نساء

یعنی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قبیلہ حصن کے لوگ مرد ہیں یا عورتیں ہیں۔

معذرت

معذرت جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے کسی سے اپنی غلطی کے لئے اظہار افسوس کرکے یا اگر کوئی تہمت لگائی گئی ہے تو اسے صاف کر کے، جس شخص سے معذرت کی جارہی ہے، اس کے دل سے اس اثر کو مٹانے کو کہتے ہیں۔ جاہلی شعرا میں النابغہ الذبیانی کو اس فن میں کمال حاصل تھا۔

سراپا یا وصف

وصف یا منظر کشی یا سراپا بھی جاہلی شاعری کے اصناف میں سے ایک اہم اور مشہور صنف ہے۔ سراپا یا وصف یہ ہے کہ شعر میں کسی چیز کی ایسی ہو بہو تصویر کھینچ دی جائے، جیسی کہ وہ خارج میں ہے۔ تاکہ اس کا نقشہ سامع کے ذہن میں اتنا واضح اور صاف آجائے گویا کہ وہ اپنی آنکھوں اس چیز کو دیکھ رہا ہے یا محسوس کر رہا ہے۔ دور جاہلی میں عام طور سے وصف حقیقت پر مبنی ہوتا تھا۔ لیکن بعض شعرا نے اس غرض سے کہ موصوف کی عظمت کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر دکھائیں یا اس کی صورت کو بہت زیادہ بگاڑ دیں، وصف میں مبالغہ سے بھی کام لیا ہے، اس لئے عربی زبان میں وصف دونوں طرح کا ملتا ہے یعنی بلند اور معیاری اور بعض گھٹیا اور ناپسندیدہ۔ عربوں نے وصف کے اتنے طریقے ایجاد کئے ہیں اور ان کے موصوف میں اتنا تنوع ہے کہ ان کا شمار مشکل ہے، کیونکہ جن چیزوں کا بھی تعلق ان کی زندگی یا ان کے ماحول سے رہا ہے، انھوں نے ان سب کا نقشہ کھینچا ہے اور اس میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ اونٹ کا جو ان کی ریڑھ کی ہڈی تھا، نقشہ کھینچنے میں انھوں نے اپنی پوری ذہانت و فطانت صرف کر دی ہے اور ایسے انداز سے اس کا وصف بیان کیا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ان

کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جاہلی شعرا میں طرفہ بن العبد کو اونٹ کی وصف نگاری میں کمال حاصل تھا۔ اسی طرح اس نے گھوڑے کی بھی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ اور ہر زاویہ اور ہر نقطۂ نظر سے تصویر کھینچی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں جانور ان کی زندگی کا لازمی حصہ اور سفر و حضر کے بہترین ساتھی تھے۔ امرؤ القیس سے ابو دؤاد اور علقمہ کو بھی جاہلی شعرا میں فن وصف میں امتیاز حاصل ہے۔ اسی طرح سے جاہلی شعرا نے درندوں اور جنگلی جانوروں، خطرناک چڑیوں، رینگنے والے زہریلے جانوروں کا بھی نقشہ کھینچا ہے یہی نہیں بلکہ نباتات و جمادات، چاند سورج، ستارے، بادل بجلی بارش، اونچے ریت کے ٹیلے، اپنی محبوبہ کے ڈیرے اور ان کے نشانات اور ان پر ہواؤں اور بارشوں کا جو اثر ہوتا ہے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ غرضکہ ان تمام چیزوں کی وصف میں کچھ نہ کچھ کہا ہے جن سے ان کا زندگی میں سابقہ رہا۔[1]

ان چیزوں کے علاوہ جاہلی شعرا نے انسان کا سراپا کھینچنے میں اس کے اخلاق و عادات، اس کے مختلف حالات مثلاً سفر و حضر، صلح و جنگ، لڑائی جھگڑا کا نقشہ بھی بہت ہی دل آویز اور موثر انداز سے کھینچا ہے جسے پڑھ کر ان کی قادر الکلامی اور ہر چیز کے واضح تصور رکھنے کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

---

(۱) عنترہ نے اونٹنی کے وصف میں کہا ہے؛

هل تبلغني دارها شدنية | لعنت بمحروم الشراب مصرم
خطارة غب السرى زيافة | تطس الإكام بوخد خف ميثم

امرؤ القیس نے جنگلی جانوروں کے بارے میں کہا ہے؛

فعنّ لنا سرب كأن نعاجه | عذارى دوار في ملاء مذيل
فأدبرن كالجزع المفصل بينه | بجيد معم في العشيرة مخول

جنگلی چڑیوں کے بارے میں کہا ہے؛

كأن مكاكي الجواء غدية | صبحن سلافا من رحيق مفلفل

ایک جاہلی شاعر نے سانپ کا وصف اس طرح بیان کیا ہے؛

يدير عينا للوقوع كأنها | سراة طاحت من نقيض برير
وكان شدقيه إذا استعرضته | شدقا عجوز مضمضت لطهور

امرؤ القیس نے پہاڑ کا نقشہ یوں کھینچا ہے؛

(باقی ص ۱۴۸ پر)

عورت کے سراپا کھینچنے میں بھی جاہلی شعرا نے بڑی دقت نظری، باریک بینی اور جزرسی کا ثبوت دیا ہے۔ امرؤالقیس نے اپنی محبوبہ کے محاسن اور مفاتن کا جس انداز سے ذکر کیا ہے، بڑا جذبات انگیز ہے۔ "دارۃ جلجل" تالاب پر اس نے جو رنگ رلیاں منائیں، یا دوران سفر اس نے جو خوش چینیاں کی ہیں، وہ غزل اور وصف نگاری میں جنسیت کو شامل کر کے پرکیف بنا دینے کی بہترین مثال ہے۔

اسی طرح نابغہ ذبیانی نے متجردہ کے انگ انگ کا جس خوبصورتی سے سراپا کھینچا ہے۔ اس کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے جو بڑی دلکش، بڑی جاذب نظر اور بڑی جذبات انگیز ہے۔

حکمت و فلسفہ اور ضرب الامثال

گزشتہ صفحات میں حکمت و فلسفہ اور عقلمندی کی باتوں کے متعلق تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ جاہلی شعرا کے کلام میں حکیمانہ مقولے، عقلمندی کی باتیں، زندگی کے تجربات کے بعد آتی ہیں۔ اس لئے جب انھوں نے ایسی باتیں اپنے کلام میں کہی ہیں تو وہ ضرب الامثال بن گئی ہیں۔ حکمت و فلسفہ اور عقلمندی کی باتیں کہنے والے اس دور جہالت میں خال خال تھے، اس لئے جب کسی شاعر کے منہ سے ایسی باتیں نکلتی تھیں تو ان کا اثر بہت ہوتا تھا۔ اس صنف میں زہیر بن ابی سلمی نے دور جاہلی میں نام پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد نابغۃ الذبیانی کا نام آتا ہے۔

جاہلی دور میں اشعار کے معانی و موضوع

مذکورہ بالا اصناف سخن سے متعلق جو خیالات و احساسات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں انھیں وہ الفاظ کا جامہ پہنا کر اشعار کے روپ میں پیش کرتا ہے، اور اسی روپ کو معانی یا موضوع کہتے ہیں۔ اشعار میں جس قدر معانی یا موضوع صاف واضح اور موثر اور حقیقت سے قریب ہوں گے۔

(بقیہ ص ۱۴۶ کا)

کأن ثبیرا فی عرانین وبلہ   کبیر اناس فی بجاد مزمل

طرفہ نے اپنی محبوبہ کے دیار کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

لخولۃ أطلال ببرقۃ ثہمد   تلوح کباقی الوشم فی ظاہر الید

محبوبہ کے دیار کا نقشہ ایک مدت گزرنے کے بعد امرؤالقیس کی زبانی:

قفا نبک من ذکری حبیب وعرفان   ورسم عفت آیاتہ منذ أزمان

أتت حجج بعدی علیہا فأصبحت   کخط زبور فی مصاحف رہبان

اسی اعتبار سے کلام کو اچھا اور معیاری سمجھا جاتے گا۔ اس معیار کے مطابق جاہلی شاعری میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ جاہلی شاعری کے معانی و موضوع بہت واضح، صاف اور حقیقت و واقعیت سے بہت قریب اور بعض حالات میں بالکل مطابق ہیں۔

۲۔ جاہلی شاعری میں اتنا مبالغہ اور غلو نہیں ہے کہ اس کے معانی و مطالب انسانی فطرت اور اور روزمرہ کی زندگی اور واقعات سے مطابقت نہ کھائیں۔

۳۔ جاہلی شاعری میں مشکل اور ایسے موضوع جن کے سمجھنے میں ذہن و فکر پر بہت زور دینا پڑے، بہت کم ہیں۔ اسی طرح حقیقت سے دور تشبیہیں، دور از کار استعارے، بہت گہرے اور دقیق مضامین، حسن تعلیل اور دوسرے اصناف بلاغت جن کو سمجھنے کے لئے بہت غور و فکر اور کد کاوش کی ضرورت پڑے، نہ ہونے کے برابر ہیں۔

۴۔ جاہلی شعرا کے کلام میں موضوع اور فکر میں ہم آہنگی اور ترتیب کا بڑی حد تک فقدان ہے۔ چنانچہ جو خیال اور موضوع جس طرح ان کی سمجھ میں آیا، اپنے اشعار میں باندھ دیتے تھے۔ یہ خیال نہیں رکھتے تھے کہ ان کے افکار و خیالات میں کوئی ترتیب اور ہم آہنگی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر ایک چیز کے بارے میں بیان کر رہا ہے مگر بغیر کسی مناسبت کے دوسرے معنی اور موضوع کی طرف منتقل ہو گیا، جس کا تعلق پہلے مضمون یا خیال سے بالکل نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر پہلے موضوع کی طرف لوٹ آیا، اور ابھی ختم نہیں ہوا کہ تیسرا مضمون شروع کر دیا۔ اس کی وجہ ہے کہ عرب اس دور میں عام طور سے فی البدیہہ اور بغیر ذہن و فکر پر بہت زور ڈالے، شعر کہتے تھے۔ چنانچہ جو موضوع اور جو خیال جس ترتیب سے ان کے ذہن میں آتا گیا، اسے بیان کرتے گئے۔ اسی لئے بعض پیشہ ور شاعر پورے پورے قصیدے کہنے کے بعد ان پر نظر ثانی کر کے ان میں کتر بیونت اور کاٹ چھانٹ کرتے تھے تاکہ معانی و مطالب اور افکار و خیالات مسلسل، مرتب اور مربوط ہو جائیں اور ایک دوسرے میں ہم آہنگی اور موافقت پیدا ہو جائے۔

جاہلی شاعری کے الفاظ اور اسالیب بیان

چونکہ عرب بدوی قوم تھی اور شاعری کا ملکہ اس کے اندر فطری تھا۔ اس لئے بغیر تکلف اور ذہن و فکر پر زور ڈالے شعر کہتی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے اشعار جیسا کہ پہلے گزرا، صاف

اور واضح ہوتے تھے جن میں نہ تکلف ہوتا تھا اور نہ مبالغہ اور نہ جزرسی اور دقت پسندی جس کی وجہ سے موضوع اور خیال کھل کر سامنے آجاتا تھا۔ یہ صفت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب موضوع کو بیان کرنے کے لئے مناسب الفاظ انتخاب کر کے شعر کہے جائیں۔ چنانچہ الفاظ اور اسلوب بیان کے اعتبار سے جاہلی شاعری میں حسب ذیل خصوصیات ملتی ہیں۔

۱۔ جاہلی شعرا معانی اور موضوع کے لحاظ سے مناسب ترین اور خوبصورت ترین الفاظ استعمال کرتے تھے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ الفاظ کے صحیح معنی اور استعمال کے صحیح موقع و محل کو خوب سمجھتے تھے۔

۲۔ عام طور سے جاہلی شعرا بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ استعمال کرتے تھے۔

۳۔ عام طور سے جاہلی شعرا ان الفاظ کو استعمال کرتے تھے جنھیں بعد میں آنے والے شعرا محدثین (عہد عباسی کے نوجوان شعرا) نے اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ ان کے زمانے میں ان کے معنی بدل گئے تھے یا پورے معنی نہیں دیتے تھے۔ یا اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ انھوں نے ان کی جگہ نسبتاً اور عام فہم الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیا۔

۴۔ جاہلی شعرا کے کلام میں مجاز کا استعمال بقدر ضرورت سے زیادہ نہیں ملتا۔

۵۔ جاہلی شعرا "عجمی" یعنی غیر عربی الفاظ کے استعمال کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ اس قسم کے الفاظ اگر کہیں ملتے ہیں تو صرف بطور خوش مذاقی، دلچسپی اور سخن گسترانہ بات کے طور پر جیسے کہ اعشیٰ کے اشعار میں بعض فارسی الفاظ، مثلاً "گل" "یاسمین" وغیرہ ملتے ہیں۔[1]

۶۔ علم بدیع کے اصناف مثلاً "الجناس" "المقابلہ" اور "المطابقہ" وغیرہ کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔

۷۔ اپنے کلام میں ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتے تھے جس کے ذریعے معانی اور اغراض بہت جلد اور خوبصورتی سے ذہن میں منتقل ہو جائیں۔ اور شعر کی لذت اور اثر دوبالا ہو جاتے۔ اس کے لئے وہ کبھی "تجاہل عارفانہ" کا انداز اختیار کرتے اور کبھی محبوبہ کے اجڑے دیار اور ان کی نشانی ٹیلوں کو اپنا مخاطب بناتے اور ان سے اپنا دکھ درد کہتے یا گزشتہ حسین دنوں کا ذکر کر کے

۱۔ جیسا اس کا قول "شاهدنا الجل والیاسمین" والسمعات بقصابها۔ ج کا تلفظ عرب لوگ "گ" کرتے ہیں۔

ہجر و فراق کی موجودہ تکلیف دہ زندگی کا تذکرہ کرتے۔

۸۔ ایجاز یعنی اختصار کو "اسہاب" یعنی تفصیل پر ترجیح دیتے تھے۔

جاہلی شاعری میں وزن اور قافیہ

عربوں میں موزونیِ طبع فطرتاً پائی جاتی تھی، اور وہ ہمیشہ سے شاعری کرتے رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے عروض و قوافی کی تعلیم نہ تو حاصل کی اور نہ اس کی طرف کوئی توجہ کی۔ وہ شعر کہتے تھے، انھیں گاتے تھے، لوگوں کو محفلوں اور مشاعروں میں سناتے تھے، اور اپنے اونٹوں کو سنا کر تیز چلاتے تھے۔ یہ اشعار مختلف بحروں یعنی اوزان میں ہوتے تھے۔ اور جہاں تک قافیہ کا سوال ہے وہ بھی ضرور ہوتا تھا لیکن عربوں کو اس کا واضح علم نہیں تھا اور نہ ہی اس کا شاید احساس کہ وہ اپنے اشعار ایک خاص نغمگی اور وزن کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ موسیقیت اور تاثر پیدا ہو رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کا کوئی شعر وزن اور عروض کے حدود سے باہر نہیں ہے۔ مشہور نحوی عالم خلیل بن احمد نے جاہلی شعرا کے کلام کا مطالعہ اور چھان بین کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ عربی شاعری کے تمام نمونے ایک خاص وزن اور لحن پر کہے گئے ہیں اور انھیں کو اصطلاح میں بحر (METRE) کہتے ہیں، عربی شاعری میں یہ بحریں ۱۵ ہیں۔ جن کے نام اس نے متعین کئے اور جن پر آج تک عمل ہے۔ بعد میں ایک دوسرے نحوی اخفش نے ایک وزن اور بڑھایا جس کا نام متدارک رکھا۔

یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ بعض شعرا صرف ایک ہی بحر یا ایک ہی وزن میں شعر کہتے تھے۔ دیگر اوزان اور بحریں ان کے یہاں نہیں ملتیں۔ اسی طرح سے عرب اپنے تمام اشعار میں ایک ہی قافیہ کی پابندی کرتے تھے۔

دَورِ جاہلی میں مختلف اصنافِ شعر کے نمونے

اب ہم ذیل میں جاہلی دور کی شاعری کے نمونے مع ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

غزل یا نسیب

الصمہ بن عبداللہ القشیری

یہ حماسہ کا شاعر ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے اپنی چچا زاد بہن "ریا" سے محبت تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے چچا سے "ریا" کا رشتہ مانگا۔ چچا نے کہا کہ اگر ایک سو اونٹ دو تو شادی کر دوں گا۔ الصمۃ نے اپنے باپ سے چچا کی بات بتائی۔ چنانچہ الصمۃ کا باپ اونٹ لے کر اپنے بھائی کے پاس گیا، اور کہا کہ یہ لو اونٹ، اور اپنی بیٹی ریا کی شادی میرے بیٹے سے کر دو۔ جب ریا کے باپ نے اونٹ گنے تو ایک کم نکلا۔ اس پر اس نے کہا کہ میں تو پورے سو لوں گا، تب شادی کرونگا۔ الصمۃ کا باپ بخیل آدمی تھا اس نے کہا کہ خدا کی قسم اس سے زیادہ ہرگز نہ دوں گا۔ اس پر بات بگڑ گئی اور ریا کے باپ نے الصمۃ سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ الصمۃ نے جب دیکھا کہ وصال کی اب کوئی شکل نہیں ہے تو وہ اپنے اونٹ پر بیٹھا اور قبیلہ چھوڑ کر باہر چلا گیا اور وہیں تنہائی کی زندگی گزار کر مر گیا۔ مندرجہ ذیل غزل اس نے اپنی محبوبہ ریا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑتے وقت کہی تھی۔

حننت الی ریا و نفسک باعدت　　　مزارک من ریا و شعبا کما معا

ترجمہ۔ تیرے دل میں ریا سے ملنے کا شدید اشتیاق پیدا ہوا مگر خود تمہارے دل نے ہی تمہارے اور ریا کے درمیان جدائی و فراق پیدا کر دیا۔ حالانکہ تم دونوں کے قبیلے ایک ساتھ ہی رہ رہے تھے۔

فما حسن ان تاتی الامر طائعا　　وتجزع إن داعی الصبابۃ أسمعا

ترجمہ: یہ تو کچھ اچھی بات نہیں ہے کہ تم دنیائے شوق میں تو راضی خوشی آؤ۔ مگر جب رسول محبت تم کو بلائے تو رونے دھونے لگو۔

قفا ودعا نجدا ومن حل بالحمٰی　　وقل لنجد عندنا أن تودعا

ترجمہ۔ اے میرے دونوں دوستو! ذرا ٹھہرو اور نجد اور وہاں کے باسیوں کو رخصت تو کر لو اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے تو نجد کو بہت ہی کم الوداع کیا ہے کیونکہ وہ محبوبہ کی نگری ہے۔

بنفسی، تلک الارض ما أطیب الرُّبیٰ　　وما أحسن المصطاف والمتربعا

ترجمہ۔ میری جان کی قسم اس کی سرزمین کے ٹیلے کتنے حسین ہیں اور یہ سرزمین فصل بہار اور گرمی گزارنے کے لئے کتنی پیاری اور جان فزا ہے۔

فلیست عشیات الحمٰی برواجع　　الیک ولکن خل عینیک تدمعا

ترجمہ۔ اب تو تمہارے پاس اس نگری کی شامیں دوبارہ لوٹ کر نہیں آسکتیں۔ اس لئے اب اپنی آنکھوں کو آنسوؤں کی لڑیاں پرونے دو۔

تلفت نحو الحیٔ حتی وجدتنی　　وجعت من الاصغاء لیتا وأخدعا

ترجمہ۔ میں محبوبہ کی نگری کی طرف پلٹ پلٹ کر اتنی دیر تک دیکھتا رہا کہ میری گردن کی "لیتا" اور "اخدع" رگ میں سخت درد ہونے لگا۔

وأذکر أیام الحمٰی ثم انثنی　　علی کبدی من خشیۃ أن تصدعا

ترجمہ۔ میں جب محبوبہ کے دیار میں اس کے ساتھ گزشتہ دنوں کو یاد کرتا ہوں تو ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیتا ہوں کہ کہیں پھٹ نہ جائے۔

الحسین بن مطیر الاسدی

(اس غزل میں جاہلی شاعر کا ذوق جمال اور عورت کے صفات بھی ظاہر ہوتے ہیں)

لقد کنت جلدا قبل أن توقد النوی　　علی کبدی جمرا بطیئا خمودھا

وقد کنت أرجو أن تموت صبابتی　　إذا قدمت أیامھا وعھودھا

فجعلت فی حبۃ القلب والحشا　　عھاد الھوی تولیٰ بشوق یعیدھا

بسود نواصیھا وحمر أکفھا　　وصفر تراقیھا وبیض خدودھا

مخصرۃ الأوساط زانت عقودھا　　بأحسن مما زینتھا عقودھا

ترجمہ:

(۱) ہجر و فراق کے میرے دل پر ایسے انگارے جلانے سے پہلے، جو بڑی دیر میں بجھتے ہیں، میں بڑا کٹھور اور دلیر تھا۔

(۲) مجھے امید تھی کہ محبوبہ کے عہد و پیمان پر جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا میری محبت خود بخود مرجائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوسکا کیونکہ:

(۳) مگر اس محبت نے تو ایسا کر دیا ہے کہ میرے دل و دماغ پر ہر وقت دکھ درد کی گھٹا چھائی رہتی ہے۔ جیسے شوق فراواں بار بار ستاتا رہتا ہے۔

(۴) اور یہ ہوا ہے کالی گھنیری زلفوں والی، مہندی رچے سرخ ہتھیلیوں والی زیوروں سے جھلملاتے سینوں والی اور گورے گورے رخساروں والی نازنینوں کی (محبت) کی وجہ سے؛

(۵) میری محبوبہ کی کمر پتلی ہے اور اس نے اپنے ہار کو اس سے کہیں زیادہ حسن بخشا ہے جتنا کہ ہار نے اسے بخشا ہے۔

فخر و حماسہ

المرقش الاکبر

ان تبتدر غاية يوماً لمكرمة — تلق السوابق منا والمصلينا

وليس يهلك منا سيد أبداً — الا افتلينا غلاما سيداً فينا

إنا لنرخص يوم الروع أنفسنا — ولو نسام بها في الأمن أغلينا

شعث مقادمنا نهبى مراجلنا — نأسو بأموالنا آثار أيدينا

إني لمن معشر أفنى أوائلهم — قول الكماة ألا اين المحامونا

لو كان في الالف منا واحد فدعو — من فارس خالهم إياه يعنونا

إذا الكماة تنحوا ان يصيبهم — حد الظبات وصلناها بأيدينا

ولا تراهم وان جلت مصيبتهم — مع البكاة على من مات يبكونا

ترجمہ:

(۱) اگر کسی روز بھلائی کے کسی نقطہ مقصود تک پہنچنے میں پہل کرنے کا موقع آتا ہے تو ہم ہی میں سب سے پہلے پہنچنے والا اور اس کے بعد پہنچنے والے پاؤ گے۔ یعنی اول و دوم ہمارے ہی

آدمی ہوں گے)

(۲) جب کبھی ہمارا کوئی سردار ہلاک ہو جاتا ہے، تو اس کی جگہ پر ہم اپنے کسی نوجوان کو سردار بنا لیتے ہیں۔

(۳) ہم جنگ کے دن اپنی جانوں کو سستی کر دیتے ہیں، اور اگر ان جانوں کا سودا امن کے زمانے میں کیا جاتے تو ہم بہت مہنگے پڑتے ہیں۔

(۴) ہماری پیشانیاں (میدان جنگ کے گرد و غبار کی وجہ سے) گرد آلود ہیں اور ہماری ہتھیلیاں لوٹی کھسوٹی پڑی ہیں (یعنی مہمان نوازی کرتے کرتے ہماری ہتھیلیاں ہر وقت خالی رہتی ہیں) اور اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کا علاج ہم اپنے مال سے کرتے ہیں یعنی قتل کرنے کے بعد ہم خون بہا دیدیتے ہیں۔

(۵) میں ایسے لوگوں کا فرد ہوں کہ ان کے پرکھوں کو بہادروں کے اس قول نے ختم کر دیا کہ ہمیں بچانے والے کہاں ہیں؟۔ یعنی ہمارے آباؤ اجداد اتنے بہادر تھے کہ بڑے بڑے بہادر بھی انہیں مدد کے لئے پکارتے تھے۔

(۶) ایک ہزار آدمیوں میں بھی اگر ایک آدمی ہمارا ہوتا ہے اور لوگ آواز لگائیں کہ ہے کوئی شہسوار تو یہ سمجھتا ہے کہ لوگ اسی کو بلا رہے ہیں۔

(۷) جب بہادر لوگ اس خطرہ سے آنا کانی کرنے لگیں کہ کہیں تلوار کی دھار ان پر نہ پڑ جائے۔ تو ہم اپنے ہاتھوں سے ان دھاروں سے ملتے ہیں۔

(۸) وہ لوگ (میرے ہم قبیلہ) اتنے صابر اور جری دل ہیں کہ مصیبت چاہے کتنی بڑی ہی کیوں نہ ہو، رونے والوں کے ساتھ روتے نہیں، یا مصیبت ان پر آن پڑے پھر بھی تم ان کو رونے والوں کے ساتھ روتا ہوا نہ دیکھو گے۔

عمرو بن کلثوم

وقد علم القبائل من معد	اذا قبب بابطحها بنینا
بانا المطعمون اذا قدرنا	وانا المهلكون إذا ابتلینا
وإنا المانعون لما أردنا	وانا النازلون بحیث شینا
وإنا التاركون اذا سخطنا	وإنا الآخذون إذا رضینا
وإنا العاصمون إذا اطعنا	وإنا العازمون إذا عصینا

ونشرب إن وردنا الماء صفوا   ويشرب غيرنا كدرا وطينا
إذا ما الملك سام الناس خسفا   أبينا أن نقر الذل فينا
ملأنا البر حتى ضاق عنا   وملوا البحر نملؤه سفينا
إذا بلغ الفطام لنا صبي   تخر له الجبابر ساجدينا

ترجمہ:۔

(۱) معد کے قبیلوں کو یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب ہم نے اپنے گھران کی زمینوں میں بناتے کر:۔

(۲) جب ہمیں قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو ہم خوب کھلاتے پلاتے ہیں اور جب ہماری آزمائش کی جاتی ہے تو ہم ہلاک کر دیتے ہیں۔

(۳) ہم جس چیز کو چاہتے ہیں، روک دیتے ہیں اور جہاں ہمارا جی چاہتا ہے ہم اتر پڑتے ہیں۔

(۴) اور جب ہم غصہ ہوتے ہیں تو بالکل ترک تعلق کر لیتے ہیں اور جب خوش ہوتے ہیں تو دستگیری کرتے ہیں (بعض شارحین نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ جب ہم غصہ ہو جاتے ہیں تو ہدیہ وغیرہ نہیں لیتے اور جب خوش ہوتے ہیں تو تحفے تحائف لے لیتے ہیں) [1]

(۵) اور جب ہماری اطاعت کی جاتی ہے تو ہم پشت پناہی کرتے ہیں اور جب ہماری نافرمانی کی جاتی ہے تو ہم بدلہ لینے کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں۔

(۶) اور جب ہم گھاٹ پر پانی پینے کے لئے آتے ہیں تو صاف ستھرا پانی پیتے ہیں اور ہمارے علاوہ دوسرے لوگ گدلا اور مٹی ملا پانی پیتے ہیں۔

(۷) جب بادشاہ لوگوں کو اپنے سامنے ذلیل وخوار ہونے کے لئے مجبور کرنے لگیں، تو ہم اپنے اندر ذلت کو برداشت کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

(۸) ہم نے خشکی کو اپنے آدمیوں سے اتنا بھر دیا ہے کہ وہ تنگ ہو گئی ہے اور سمندر کے پانی کو اپنی کشتیوں سے بھر دیا ہے۔

(۹) جب ہمارا کوئی بچہ دودھ چھوٹنے کی عمر کو آتا ہے، تو اسی وقت سے اس کے سامنے بڑے بڑے جابر لوگ سجدہ کرنے لگتے ہیں۔

۱۔ نعذنی۔

عنترہ بن شداد العبسی

لما رأیت القوم أقبل جمعهم ـــ یتذامرون کررت غیر مذمم
یدعون عنتر والرماح کأنها ـــ أشطان بئر فی لبان الأدهم
ما زلت ارمیهم بثغرة نحره ـــ ولبانه حتی تسربل بالدم
فازور من وقع القنا بلبانه ـــ وشکا إلیّ بعبرة وتحمحم
لو کان یدری ما المحاورة اشتکی ـــ ولکان لو علم الکلام مکلمی
ولقد شفیٰ نفسی وأذهب سقمها ـــ قیل الفوارس ویک عنتر اقدم
والخیل تقتحم الخبار عوابسا ـــ من بین شیظمة واٰخر شیظم

ترجمہ۔

(۱) جب میں نے دیکھا کہ مخالف قوم کا گروہ ایک دوسرے کو جنگ پر ابھارتے ہوتے آیا ہے تو میں نے بہت ہی قابل تعریف حملہ کیا۔

(۲) لوگ مجھے عنترہ کہہ کر پکار رہے تھے اور نیزے اس تیزی سے میرے گھوڑے کے سینے پر پڑ رہے تھے کہ جیسے کہ بٹی ہوئی موٹی رسیاں کنویں میں پڑتی ہیں۔

(۳) میں اپنے گھوڑے کی گردن کی ہڈی اور سینہ پر سے برابر نیزہ بازی کئے گیا، یہاں تک کہ گھوڑا خون میں شرابور ہوگیا۔

(۴) تو گھوڑے نے اپنے سینے پر نیزوں کے مستقل پڑنے کی وجہ سے منہ پھیر لیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور ہنہناہٹ سے اپنی تکلیف مجھ سے بیان کی۔

(۵) اگر اسے گفتگو کرنی آتی ہوتی، اور بات کرنا جانتا ہوتا تو یقیناً وہ مجھ سے اپنا دکھ درد زبان سے بیان کرتا۔

(۶) میرے دل کو بڑی تسلی ہوئی اور اس کی تکلیف شہسواروں کے اس کہنے سے بالکل جاتی رہی کہ عنترہ بھلا کرے خدا تمھارا، بڑھے رہنا۔

(۷) اور حالت یہ تھی کہ گھوڑے منہ بسورے ہوتے میدان جنگ کی نرم زمین میں گھسے جا رہے تھے۔ ان میں بڑے ڈیل ڈول کے گھوڑے اور گھوڑیاں دونوں تھیں۔

مدح

زہیر بن ابی سلمیٰ

ہرم بن سنان کی تعریف کرتے ہوئے

وأبیض فیاض یداہ غمامۃ　　علی معتفیہ ما تغب فواضلہ

اخی ثقۃ لا یہلک الخمر مالہ　　ولکنہ قد یہلک المال نائلہ

تراہ إذا ما جئتہ متہللاً　　کأنک تعطیہ الذی أنت سائلہ

(۱) زہیر بن ابی سلمیٰ نے ہرم بن سنان کی تعریف میں کہا ہے کہ میرا ممدوح پاکباز و سرخرو اور بڑا سخی داتا ہے۔ اس کے ہاتھ بارش کی طرح ہیں اور جو لوگ اس کی طرف دست سوال دراز کرتے ہیں ان سے ان کی داد و دہش کبھی ختم نہیں ہوتی۔

(۲) وہ بھروسے کے لائق ہے اور شراب اس کے مال کو ختم نہیں کر پاتی لیکن اس کی سخاوت البتہ اس کے مال کو ختم کر سکتی ہے:

(۳) جب تم اس سے مانگنے کی غرض سے اس کے پاس آتے ہو تو اسے دیکھو گے کہ وہ اتنا خوش ہوتا ہے کہ جیسے تم ہی اسے وہ چیز دے رہے ہو جو تم اس سے مانگ رہے ہو۔

الاعشیٰ

محلق کی تعریف میں

لعمری لقد لاحت عیون کثیرۃ　　الی ضوء نار بالیفاع تحرق

تشب لمقرورین یصطلیانہا　　وبات علی النار الندی والمحلق

رضیعی لبان ثدی ام تقاسما　　بأسحم داج عوض لا نتفرق

تری الجود یجری ظاہرا فوق وجہہ　　کما زان متن الہندوانی رونق

یداہ یدا صدق فکف مبیدۃ　　وکف اذا ما ضنّ بالمال تنفق

(۱) میری جان کی قسم بہت سی آنکھیں اس آگ کی روشنی کی طرف اٹھ گئیں جو ایک ویرانے میں جلائی جا رہی تھی۔

(۲) یہ آگ دو سردی کھائے ہوئے آدمیوں کے لئے جلائی جا رہی تھی جو اسے تاپ رہے تھے اور وہ سخاوت اور محلق تھے جنھوں نے اپنی ساری رات اس آگ کے پاس گزار دی۔

(۳) دونوں نے ایک ہی ماں کی چھاتیوں کا دودھ پیا ہے اور انھوں نے ایک گھنگھور تاریک

رات میں قسم کھائی تھی کہ کبھی بھی ایک دوسرے علیحدہ نہ ہوں گے۔

(۴) تم اس کے چہرے کی طرف دیکھو، تو تمھیں اس پر سخاوت کی آن بان جھلکتی نظر آئے گی۔ جس طرح ہندوستان کی بنی تلوار کی دھار کو آب وتاب نکھار دیتی ہے۔

(۵) اس کے دونوں ہاتھ در حقیقت جود وسخا کے ہاتھ ہیں، تو ایک ہتھیلی مال کو ٹھکانے لگاتی ہے اور دوسری جب لوگ مال خرچ کرنے میں بخل کرنے لگیں تو خرچ کرتی ہے۔ یعنی جب خشک سالی ہوتی ہے اور لوگ بچا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ خرچ کرتا ہے۔

ھجو

قریط بن انیف

نے اپنی قوم کی ہجو ملیح کرتے ہوتے اور انھیں بزدلی پر عار دلاتے ہوئے کہا۔

لو کنت من مازن لم تستبح ابلی	بنو اللقیطة من ذھل بن شیبانا
لکن قومی وان کانوا ذوی عدد	لیسوا من الشر فی شیء وإن ھانا
یجزون من ظلم أھل الظلم مغفرة	ومن إساءة أھل السوء احسانا
کأن ربك لم یخلق لخشیته	سواھم من جمیع الناس انسانا
فلیت لی بھم قوما اذا رکبوا	شدوا الاغارة فرسانا ورکبانا

(۱) اگر میں خاندان مازن کا فرد ہوتا تو ذہل بن شیبان کے بہیتو لڑکی کی اولاد میرے اونٹوں کو آسانی سے یوں مفت میں نہ لے جا سکتے تھے۔

(۲) لیکن میری قوم چاہے کتنی بڑی تعداد میں کیوں نہ ہو، برائی میں چاہے کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، نہیں پڑتی۔

(۳) میرے آدمی ظلم کرنے والوں کے ظلم کا بدلہ معافی سے اور بدکیش لوگوں کی برائیوں کا حسن سلوک سے دیتے ہیں۔

(۴) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے رب نے اپنے سے ڈرنے کے لئے تمام لوگوں میں سے صرف انھیں کو پیدا کیا ہے۔

(۵) کاش مجھے ان کے بدلے میں ایسی قوم ملتی کہ جو گھوڑے پر اور اونٹ پر بیٹھ کر سخت حملہ کرتی۔

معذرت خواہی

النابغہ الذبیانی

نعمان بن المنذر سے معذرت کرتے ہوئے

حلفت فلم اترک لنفسك ریبۃ — ولیس وراء اللہ للمرء مذھب
لئن کنت قد بلغت عنی خیانۃ — لمبلغك الواشی أغش وأکذب
ولکننی کنت امرءا لی جانب — من الارض فیہ مستراد ومذھب
ملوك واخوان إذا ما أتیتھم — أحکم فی أموالھم وأقرب
کفعلك فی قوم أراك اصطنعتھم — فلم ترھم فی شکر ذلك اذنبوا
فلا تترکنی بالوعید کأننی — إلی الناس مطلی بہ القار أجرب
ألم تر أن اللہ أعطاك سورۃ — تری کل ملك دونھا یتذبذب
بأنك شمس والملوك کواکب — إذا طلعت لم یبد منھن کوکب
ولست بمستبق أخا لا تلمہ — علی شعث أی الرجال المھذب

ترجمہ:-

(۱) میں نے ایسی قسم کھائی ہے جس کے بعد (میری صداقت میں) کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی، کیونکہ اللہ کے بعد آدمی کے لئے اور کوئی جائے پناہ نہیں رہ جاتی۔

(۲) اگر آپ کو میری طرف سے کسی خیانت کی اطلاع دی گئی ہے تو (یقین کیجئے کہ) آپ کو یہ خبر دینے والا چغلخور، دھوکہ باز اور جھوٹا ہے۔

(۳) میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ زمین پر میرے لئے ایسا حصّہ ہے جہاں میں آجا سکتا ہوں۔

(۴) یہ چند بادشاہ اور بھائی ہیں، جب میں ان کے پاس پہنچ جاتا ہوں تو ان کے مال کا حکم بنا لیا جاتا ہوں، اور قریب کر لیا جاتا ہوں۔

(۵) بالکل آپ کے اسی عمل کی طرح کہ جب آپ کسی قوم کے ساتھ حسن سلوک اور بھلائی کرتے ہیں تو وہ حسن سلوک اور بھلائی پر شکریہ ادا کر کے گنہگار نہیں ہو جاتے ہیں۔

(۶) آپ مجھے دھمکی دے کر یوں نہ چھوڑ دیں کہ میں لوگوں کے درمیان ایسا دکھائی دوں جیسا تارکول ملا ہوا خارشتی اونٹ۔

(۷) کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ نے آپ کو ایسا رعب و دبدبہ دیا ہے کہ آپ کے سامنے سارے بادشاہ کانپتے رہتے ہیں۔

(۸) وہ یوں کہ آپ سورج ہیں اور دوسرے تمام بادشاہ ستارے ہیں اور جب سورج طلوع ہو جاتا ہے تو ستارے غائب ہو جاتے ہیں۔

(۹) آپ کوئی ایسا بھائی نہ رکھ پائیں گے جسے اس کی لغزش پر آپ کو سرزنش کرنے کی نوبت نہ آئے۔ پورے مہذب لوگ کہاں ملتے ہیں؟

مرثیہ

قس بن ساعدہ الأیادی

نے اپنے دو بھائیوں کی قبر پر کھڑے ہو کر مرثیہ کے یہ اشعار پڑھے

خلیلی هبا طالما قد رقدتما — اجدکما لا تقضیان کراکما
ألم تعلما أنّي بسمعان مفرد — ومالی فیه من حبیب سواکما
اقیم علی قبریکما لست بارحا — طوال اللیالی أو یجیب صداکما
جری الموت مجری اللحم والعظم منکما — کأن الذی یسقی العقار سقاکما
فلو جعلت نفس لنفس وقایة — لجدت بنفسی ان تکون فداکما
سابکیکما طول اللیالی وما الذی — یرد علی ذی عولة إن بکاکما

(۱) میرے دونوں دوستو! اب اٹھ بھی جاؤ، بڑی دیر تک سو لئے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم اپنی نیند پوری نہیں کر پاؤ گے۔

(۲) کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں دیر سمعان میں اکیلا رہ گیا ہوں، حالانکہ اس میں تم دونوں کے سوا میرا اپنا کوئی دوست نہیں ہے۔

(۳) میں تم دونوں کی قبروں پر پوری پوری راتیں پڑا رہوں گا اور وہاں سے کہیں نہ جاؤں گا یا تمہاری روح میری بات کا جواب دے۔

(۴) موت تمہارے گوشت اور ہڈیوں تک میں سرایت کر چکی ہے، ایسا لگتا ہے کہ تیز قسم کی شراب پلانے والے نے تمہیں بھی وہ شراب پلا دی ہے۔

(۵) اگر کوئی جان کسی جان کے بدلے میں، بچانے کے لئے دی جا سکتی تو میں اپنی جان تم دونوں پر بلا خوف و خطر نچھاور کر دیتا۔

(۶) میں پوری باتیں تم کو رونے میں بتا دوں گا، اور مصیبت زدہ اگر تم دونوں کو رو دے تو اسے بھلا کوئی چیز اس سے روک سکتی ہے۔

وصف : سَراپا، منظر کشی

امرؤالقیس اپنی محبوبہ کا سراپا کھینچتے ہوئے۔ باقی تمام شعرا جاہلی نے کم وبیش اس صنف میں اس کی تقلید کی ہے۔

مهفهفة بيضاء غير مفاضة　　ترائبها مصقولة كالسجنجل

وجيد كجيد الريم ليس بفاحش　　اذا هي نصته ولا بمعطل

وفرع يزين المتن أسود فاحم　　اثيث كقنو النخلة المتعثكل

غدائره مستشزرات الى العلا　　وتضل المدارى فى مثنى ومرسل

وكشح لطيف كالجديل مخصر　　وساق كانبوب السقى المذلل

ترجمہ:۔

(۱) میری محبوبہ گوری، چٹی اور پتلی کمر والی ہے۔ اس کا پیٹ ڈھلکا ہوا (بدنما) نہیں ہے۔ اس کا سینہ آئینہ کی طرح چکنا اور شفاف ہے۔

(۲) اور اس کی گردن سفید، ہرنی کی گردن جیسی (موزوں) ہے۔ جب وہ اپنی گردن کو اٹھاتی ہے تو اس کی لمبائی بدنما نہیں معلوم ہوتی اور نہ ہی (زیورات نہ ہونے کی وجہ سے) سونی دکھائی دیتی ہے۔

(۳) اور میری محبوبہ کی گندھی ہوئی چوٹی کے بال اتنے کالے اور گھنیرے ہیں کہ پشت کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور اتنے گھنے ہیں کہ جیسے خوشوں سے لدی ہوئی کھجور کے درخت کا خوشہ ہوں۔

(۴) اس کی زلفیں اوپر کو اس طرح اٹھی ہوئی ہیں کہ گندھے ہوئے بال بٹے ہوئے اور لٹکے ہوئے بالوں میں بوجہ کثرت کے کھوئے سے جاتے ہیں۔

(۵) اور اس کی کمر اتنی پتلی اور لچکدار ہے، جیسے کہ اونٹنی کی مہار ہو، اور اس کی پنڈلی ایسی صاف ستھری کہ جیسے سرسبز وشاداب بردی کا پودا ہے جو بہت زیادہ سینچائی کی وجہ سے اتنا نرم و نازک ہو گیا ہے کہ جھکا پڑتا ہے۔

گھوڑے کا سراپا کھینچتے ہوئے :۔

وقد اغتدی والطیر فی وکناتها بمنجرد قید الأوابد هیکل

مکر مفر مقبل مدبر معا کجلمود صخر حطه السیل من عل

له أیطلا ظبی وساقا نعامة وإرخاء سرحان وتقریب تتفل

(۱) میں صبح تڑکے جب کہ چڑیاں اپنے گھونسلوں میں بسیرا لئے ہوئے ہوتی ہیں، ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل کھڑا ہوتا ہوں جس کے بال کم ہیں اور جو اتنا برق رفتار ہے کہ جنگلی جانوروں کو دوڑ کر پکڑ لیتا ہے اور خوب لمبا چوڑا ہے۔

(۲) (جس کی خوبی یہ ہے کہ) وہ ایک ہی وقت میں جب موقع ہو جھپٹ پڑتا ہے، بھاگ کھڑا ہوتا ہے، آگے بڑھ جاتا ہے اور پیچھے ہٹ آتا ہے۔ اور اتنا سبک رو اور تیز رفتار ہے کہ جیسے وہ سخت پہاڑی کی چٹان ہو، جسے تیز سیلاب کے دھارے نے نیچے کو اوپر سے پھینک دیا ہو۔

(۳) اس کی کمر کے دونوں پہلو ہرن کے پہلوؤں کی طرح باریک ہیں اور اس کی پنڈلیاں شتر مرغ کی پنڈلیوں کی طرح لمبی ہیں اور سبک رفتاری ایسی ہے جیسے بھیڑیے کی دوڑ اور دلکی ایسی جیسے لومڑی کے بچے کی سرپٹ۔

رات کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے :۔

ولیل کموج البحر ارخی سدوله علی بأنواع الهموم لیبتلی

فقلت له لما تمطی بصلبه وأردف أعجازا وناء بکلکل

ألا أیها اللیل الطویل ألا انجلی بصبح وما الإصباح منك بأمثل

فیالك من لیل کأن نجومه بکل مغار الفتل شدت بیذبل

(۱) اور اس رات نے جو سمندر کی موج کی طرح ہیبت ناک اور تاریک تھی جب مجھے آزمانے کے لئے مختلف قسم کی پریشانیوں اور مصیبتوں کی جھولیں میرے اوپر ڈال دیں۔

(۲) اور جب اس نے اپنی پیٹھ کو لمبا کیا اور اپنے پچھلے حصہ کو پیہم لاتی رہی اور اپنے سینہ کو دراز کیا (یعنی دھیرے دھیرے رات طویل ہونے لگی۔ تشبیہ اونٹ کے بڑی دیر میں اطمینان سے بیٹھنے سے دی گئی ہے) تو میں نے کہا کہ

(۳) اے لمبی رات کیا تو صبح کے جلوہ میں درخشاں نہیں ہو سکتی، مگر وہ صبح بھی تو تجھ سے زیادہ خوش آئند نہیں ہے (کیونکہ میں دن میں بھی اسی طرح پریشان خاطر اور رنجور رہتا ہوں جس طرح

رات میں بے چین اور بے کل رہتا ہوں۔

(۴) تو بھی کیا خوب رات ہے، مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے کہ تیرے ستارے یذبل پہاڑ (جو نجد میں ہے) سے مضبوط بٹی ہوئی رسیوں سے کس کر باندھ دیئے گئے ہوں۔

حکمت و فلسفہ

زہیر بن ابی سلمیٰ

ومن لم یصانع فی امور کثیرۃ　　یضرس بأنیاب ویوطأ بمنسم

ومن یجعل المعروف من دون عرضہ　　یفرہ ومن لایتق الشتم یشتم

ومن یک ذا فضل فیبخل بفضلہ　　علی قومہ یستغن عنہ ویذمم

ومن یوف لایذمم ومن یھد قلبہ　　إلی مطمئن البر لایتجمجم

ومن ھاب أسباب المنایا ینلنہ　　وان یرق أسباب السماء بسلم

ومن یجعل المعروف فی غیر أھلہ　　یکن حمدہ ذما علیہ ویندم

ومھما تکن عند إمری من خلیقۃ　　وان خالھا تخفی علی الناس تعلم

وکائن تری من صامت لک معجب　　زیادتہ أو نقصہ فی التکلم

لسان الفتی نصف ونصف فؤادہ　　فلم یبق إلا صورۃ اللحم والدم

(۱) اور جو شخص اکثر معاملات میں نرمی اور مدارات سے کام نہیں لیتا، وہ دانتوں سے کاٹ لیا جاتا ہے اور پاؤں سے روند دیا جاتا ہے۔

(۲) اور جو شخص اپنی عزت و آبرو کو نیکی اور بھلائی کے ذریعہ محفوظ رکھتا ہے تو گویا وہ اسے بڑھاتا رہتا ہے، اور جو شخص لوگوں کو گالی گلوچ دینے سے نہیں بچتا، اسے بھی گالی دی جاتی ہے۔

(۳) اور جو شخص اپنی ضرورت سے زیادہ مال و دولت ہونے کے باوجود بھی اپنی قوم کے ساتھ بخل کرتا ہے تو اس سے بے پروائی برتی جاتی ہے اور اس کی برائی کی جاتی ہے۔

(۴) اور جو شخص اپنا عہد و پیمان پورا کرتا ہے، اس کی برائی نہیں کی جاتی اور جس کا دل ایسی بھلائی کی طرف رہنمائی کرے جس سے دل کو سکون و چین نصیب ہو تو ایسا آدمی اس میں پس و پیش نہیں کرتا۔

(۵) اور جو شخص اسباب موت سے ڈرا تو پھر موت اسے پا لیتی ہے چاہے وہ زینہ لگا کر آسمان کے

کناروں پر کیوں نہ چڑھ جاتے۔

(۶) اور جو شخص ایسے آدمی کے ساتھ بھلائی کرتا ہے، جو بھلائی کئے جانے کے لائق نہیں ہے تو اس بھلائی کے بدلے تعریف کی جگہ اسے برائی ملتی ہے اور اسے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ یعنی

نکوئی با بداں کردن چنانست ۔۔ کہ بدکردن بجائے نیک مرداں

(۷) اگر کوئی شخص کسی بُری عادت میں مبتلا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ وہ لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی تو یہ غلط ہے، کیونکہ ایک نہ ایک دن وہ طشت از بام ہو کر رہے گی یعنی بُرائی کو لاکھ چھپاؤ ایک نہ ایک دن وہ ظاہر ہو کر رہے گی۔

(۸) بسا اوقات ایک چپ اور خاموش انسان تمھیں بہت بھلا لگتا ہے، لیکن اس کی کمی اور زیادتی (یعنی برائی اور بھلائی) بولنے میں ہوتی ہے یعنی جب وہ منہ کھولتا ہے تو اسکی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

(۹) زبان نوجوان کا نصف حصہ ہے اور اس کا دل اس کا دوسرا نصف حصہ۔ اب سوائے گوشت اور خون کی شکل کے اور کچھ اس میں بچ نہ رہا یعنی درحقیقت انسان زبان اور عقل سے عبارت ہے گوشت پوست یعنی شکل وصورت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

ضرب الامثال

طرفہ بن العبد

کل خلیل کنت خاللتہ ۔۔ لا ترک اللہ لہ واضحہ

کلھم أروغ من ثعلب ۔۔ ما اشبہ اللیلۃ بالبارحہ

ترجمہ :-

(۱) ہر دوست جس سے میں نے دوستی کی ، خدا نے اس کے دانت نہ چھوڑے یعنی جس سے بھی میں نے دوستی کی اس نے خندہ پیشانی اور ہنسی خوشی سے نہیں نبایا۔

سب کے سب لومڑی سے بھی زیادہ چالباز تھے۔ آج کی رات کل گزشتہ (کل کی رات) سے کتنی مشابہ ہے۔

زمانہ جاہلی کے مشہور شعراء

جیساکہ اوپر گزر چکا ہے کہ عربوں نے زمانہ جاہلی میں شعر کے اکثر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان اصناف میں شعر کہنے والوں کی تعداد بھی زیادہ رہی ہوگی چنانچہ مشہور ادیب اور ناقد عمرو بن العلا کہا کرتے تھے کہ "ما انتھیٰ الیکم مما قالت العرب الا اقلہ، ولو جاءکم وافرا لجاءکم علم وشعر کثیر" یعنی تم تک عربوں کے کلام میں سے جو کچھ پہنچ سکا ہے وہ بہت تھوڑا ہے اگر تمھارے پاس کافی تعداد میں ان کا کلام آیا ہوتا تو تمھارے پاس علم وشعر کا بہت سا ذخیرہ آگیا ہوتا لیکن اس بیان سے ہم کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے کہ عربوں نے جن جن اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، وہ اصناف کیا تھے۔ اسی طرح اس کے بارے میں بھی کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی کہ ان جاہلی قصیدوں یا کلام کے نمونے کی تعداد کیا تھی۔ البتہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کی تعداد ایک سو سے بھی زیادہ تھی۔ اسی طرح بعض کا کہنا ہے کہ دور جاہلی کے شعرا نے ہزاروں اراجیز (رزمیہ کلام) اور سینکڑوں لمبے قصیدے کہے تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عربوں نے اپنی زندگی سے متعلق تمام مسائل پر طبع آزمائی کی تھی۔ اسی لئے اس دور کی شاعری کو "دیوان العرب"[1] کہتے ہیں۔ اور جب ان کی شاعری ان کی زندگی کا رجسٹر ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں اس کے تمام پہلوؤں کی عکاسی رہی ہوگی۔ اور زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کرنے کے لئے سینکڑوں کیا ہزاروں قصیدے بھی ناکافی

۱- چنانچہ عام مقولہ ہے کہ "الشعر دیوان العرب" یعنی شعر عربوں کی زندگی کا رجسٹر ہے جس میں ان کی زندگی اور اس کے مظاہر کے تمام پہلو آگئے ہیں۔ اس کو سب سے پہلے عبداللہ بن عباس نے کہا تھا، ابن الانباری نے اتقان سے نقل کیا ہے کہ "ابن عباس قال یوما: الشعر دیوان العرب، فاذا خفی علینا الحرف من القرآن... رجعنا الی دیوانہا فالتمسنا معرفتہ (الاتقان للسیوطی)

ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ سب راویوں شعر کے یاد کرنے والوں، عالموں اور ادیبوں کے اسلامی جنگوں میں شرکت اور ان میں شہادت کی وجہ سے ضائع ہو گئے۔ اس کے باوجود اسلامی دور میں جب ان کی تدوین اور جمع کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ابو تمام صاحب حماسہ، شعر و ادب کا مشہور راوی وعالم حمّاد الراویہ، مشہور ماہر لغت اور نقاد الاصمعی اور ابو ضمضم وغیرہ کو زمانہ جاہلی کے ہزاروں قصیدے، رجزیہ کلام اور چھوٹے بڑے لاتعداد قصیدے یاد تھے۔

جاہلی شعرا میں سے بعض ممتاز شعرا نے بڑے لمبے قصیدے کہے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف ان کو بلکہ ان کے قصیدوں کو بھی شہرت دوام حاصل ہو گئی۔ اس نقطۂ نظر سے ان شعرا کو سات طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر طبقہ میں تقریباً سات ہی نامور شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔

۱۔ اصحاب المُعَلّقات
۲۔ اصحاب المُجَمْہرات
۳۔ اصحاب المُنْتقیات
۴۔ اصحاب المُذَہّبات یا المُذہبات
۵۔ اصحاب المراثی
۶۔ اصحاب المَشُوبات
۷۔ اصحاب المُلحَمات

مذکورہ بالا تقسیم میں بعض شعرا عہد اسلامی کے بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں طبقہ کے شعرا میں نامی اور قادر الکلام شعرا وہ ہیں جن کو شہرت اور ناموری اسلامی عہد کے اول زمانہ میں حاصل ہوئی۔

شروع کے چار طبقوں میں اکثر جاہلی شعرا آجاتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور شعرا وہ ہیں جنھوں نے معلقات کہے ہیں[1]

معلقات کی حقیقت :۔

مورخین ادب میں اس بات میں خاصا اختلاف رہا ہے کہ معلقات کن قصیدوں کو کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ وہ لمبے قصیدے ہیں جنھیں عربوں نے اتنا پسند کیا کہ انھیں سونے کے پانی

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: جرجی زیدان جلد اوّل ص ۹۷، اور طبقات الشعرا، عبد السلام ندوی

سے لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا تھا۔ لیکن بعض اس خیال کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لٹکائے نہیں گئے تھے بلکہ حماد راویہ نے جب یہ دیکھا کہ لوگوں کو شعر و شاعری سے دلچسپی کم ہونے لگی ہے تو اس نے یہ قصیدے جمع کئے اور لوگوں کو سنایا اور کہا کہ یہی جاہلی زمانہ کے مشہور قصیدے ہیں۔ اس لئے ان کا نام مشہور قصیدے رکھا گیا۔ لیکن اکثر مورخین، نقاد اور راویوں کا اتفاق ہے کہ یہ قصیدے خانہ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے۔ اسی لئے انھیں معلقات یعنی "لٹکائے ہوئے" قصیدے کہتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں ابن عبد ربہ نے العقد الفرید میں اور ابن رشیق نے کتاب العمدۃ میں اور ابن خلدون نے اپنی کتاب میں تفصیل سے لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "عربوں کو شعر و شاعری کا اتنا ذوق تھا کہ انھوں نے جاہلی دور کے سرمایۂ شعر و شاعری میں سے سات بہترین قصیدوں کو چھانٹ کر انھیں سونے کے پانی سے قباطی[1] پر لکھوا کر خانہ کعبہ کے پردے سے لٹکا دیا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ" مذہبہ" یعنی سونے کے پانی سے لکھے ہوئے قصیدے لگ گیا ہے۔ چنانچہ کہتے تھے "مذہبۃ امرئ القیس، مذہبۃ زہیر" یہ مذہبات سات ہیں۔ اور انھیں کو معلقات بھی کہتے ہیں:" ان معلقات کو مذہبات اس لئے کہتے تھے کہ بہترین قصیدے کو سونے کے پانی سے پہلے قباطی پر لکھا جاتا پھر خانہ کعبہ پر لٹکایا جاتا۔ اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔ کیونکہ عربوں کے یہاں دستور تھا کہ اس قسم کے عوامی فیصلوں کو کسی نہ کسی نہج سے خانہ کعبہ سے متعلق ضرور کرتے تھے۔ چنانچہ لڑائی جھگڑے میں اپنے فیصلے، ثالثی یا وساطت کے سارے کام خانہ کعبہ میں بیٹھ کر کرتے تاکہ ہر فریق خانہ کعبہ کے تقدس کی وجہ سے ان کا پابند رہے۔ بنی ہاشم کا قریش نے جب مقاطعہ کیا ہے تو اس فیصلے کو بھی لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا تاکہ سند رہے[2]۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عربوں نے اپنے شعری سرمایہ کا بہترین حصہ خانہ کعبہ میں لٹکا دیا ہو۔ ان میں سے اکثر قصیدے سوق عکاظ کے ہیں۔

اصحاب معلقات کی تعداد پر بھی علما میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ ان کی تعداد سات ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کی تعداد دس ہے۔ مگر متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ وہ شعرا جن کے قصیدے خانہ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے، ان کی تعداد سات ہے۔ ویسے سب لمبے اور مشہور قصیدے کہنے والوں کو شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد دس ہو جاتی ہے۔ جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ القباطی ـــ کتان کا کپڑا۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے:۔ سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، خبر الصحیفہ، اور سیرت کی دوسری کتابیں۔

۱۔ اِمرؤُالقَیس
۲۔ النَّابغۃُالذُّبیانی
۳۔ زُہیرُبن أَبی سُلمٰی
۴۔ الأعشیٰ قَیس
۵۔ عَنتَرۃُبن شَدّادالعَبسیُ
۶۔ طَرَفۃُبن العَبد
۷۔ عَمرُوبن کُلثوم
۸۔ الحارث بن حِلّزہ الیشکُری
۹۔ لَبِیدبن رَبیعہ [1]
۱۰۔ عُروۃُبن الوَرد

بعض لوگوں نے دُرَیدُبن الصِّمَّہ اور مُرَقّش الأکبر اور اُمَیّہ بن أبی الصَّلت کو بھی اصحاب معلّقات میں شامل کیا ہے۔

ان شعرا کو پھر ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے :۔

پہلا طبقہ : امرؤالقیس، زہیر بن ابی سلمٰی اور النابغہ الذبیانی

دوسرا طبقہ : الاعشیٰ قیس، لبید بن ربیعہ اور طرفہ بن العبد

تیسرا طبقہ : عنترہ بن شداد العبسی، عروۃ بن الورد، درید بن الصمہ اور مرقش الاکبر۔

جاہلی شعرا کی طبقات میں یہ تقسیم تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ادب کی تاریخ کی ساری کتابوں میں اسی طرح آتی ہے، لیکن محمد بن سلام الجُمَحِی نے اپنی کتاب "طَبَقات فُحول الشعراء" میں دس طبقے قائم کئے ہیں اور ہر طبقہ میں چار شعرا شامل کئے ہیں، لیکن اس کی یہ تقسیم عام ہے۔ اس میں تمام اصناف سخن میں کہنے والے شعرا آگئے ہیں۔

---

[1] لبید بن ربیعہ کو اکثر تذکرہ نگاروں نے دورِ جاہلی کے شعرا میں اس وجہ سے شمار کیا ہے کہ اس نے مسلمان ہونے کے بعد شعروشاعری بالکل ترک کر دی تھی، لیکن جدید تحقیق کے مطابق اسے مخضرمین میں شمار کیا جاتا ہے، اسی لئے ہم نے اس کا ذکر دورِ جاہلی میں نہیں کیا ہے۔ اس کے متعلق ملاحظہ کیجئے، جلد دوم

پھر نقادوں میں اس بات میں اختلاف ہے کہ اصحاب المعلقات میں کون سب سے بہتر شاعر ہے۔ خود اسلامی دور کے مشہور شعرا کی بھی اس معاملہ میں بالکل جداگانہ رائیں ہیں۔ چنانچہ اس دور کے چوٹی کے شعرا مثلاً فرزدق، جریر اور اخطل وغیرہ سے جب ان کی رائے پوچھی گئی تو ہر ایک نے ایک دوسرے سے بالکل مختلف رائے دی۔ مگر عام طور سے نقادوں میں اس پر اتفاق ہے کہ جاہلی شعرا میں سے ہر ایک کسی نہ کسی فن میں امتیازی شان رکھتا ہے اور اس اعتبار سے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ کسی نے غزل میں امتیاز پیدا کیا ہے، کسی نے فخر میں، کسی نے مدح میں تو کسی نے وصف میں۔ اس اعتبار سے جاہلی شعرا میں سے حسب ذیل کو مندرجہ ذیل اصناف میں ممتاز اور اشعر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ "أشعر الشعراء أربعة ـــــ زهير إذا رغب، والنابغة إذا رهب، والأعشى إذا طرب، وعنترة إذا غضب، وامرؤ القيس إذا ركب ـــــ یعنی تمام جاہلی شعرا میں حسب ذیل شعرا امتیازی شان رکھتے ہیں۔ زہیر جب اسے کچھ ملنے کی امید ہو یعنی مدح اور حکمت و فلسفہ میں، نابغہ ذبیانی جب ڈرا ہوا ہو یعنی معذرت خواہی میں، اعشیٰ جب مست ہو یعنی مدح یا ہجو میں، اور امرؤ القیس جب سواری پر ہو یعنی گھوڑے اور اونٹنی کی تعریف میں۔

آگے ہم اصحاب المعلقات میں سے ۸ شعرا کے حالات زندگی اور ان کے کلام کا تفصیلی مطالعہ کریں گے اور باقی ماندہ جاہلی شعرا میں سے چند کا سرسری جائزہ لیں گے۔

نوٹ، شجرہ نسب شعرائے معلقات کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمایئے۔

اصحاب المعلقات

۱۔ امرؤالقیس

(۵۰۰ء — ۵۴۰ء)

امرؤالقیس کا پورا نام "ابوالحارث حندج بن حُجر الکندی تھا[1] یہ نسلاً قحطانی یمنی تھا اور تمام جاہلی شعراء میں سب سے زیادہ ممتاز، نامور، پرگو اور امام فن سمجھا جاتا ہے۔ اس نے شاعری میں بعض ایسے اصناف ایجاد کئے اور ایسے مضامین باندھے کہ جنھیں اس سے پہلے کسی جاہلی شاعر نے نہیں باندھا تھا اور نہ ان پر طبع آزمائی کی تھی۔

اسے 'الملک الضلیل' یعنی گمراہ بادشاہ اور 'ذوالقروح' زخموں والا[2] بھی کہتے ہیں۔ اس کی کنیت ابو وہب تھی اور لقب امرؤالقیس تھا۔ امرؤالقیس، ماں اور باپ دونوں طرف سے بادشاہوں کے خاندان کا نہ صرف فرد تھا، بلکہ شہزادہ بھی تھا کیونکہ اس کا باپ حُجر بنو اسد کا آخری بادشاہ تھا اور اس کے آبا و اجداد قبیلہ کندہ کے شریف ترین اور نامور بزرگ تھے۔ اس کی ماں فاطمہ ربیعہ سردار کی لڑکی اور قبیلہ تغلب کے نامور شاعر اور شہسوار مہلہل اور کلیب کی بہن تھی۔

امرؤالقیس نے اپنے باپ کی عملداری نجد میں جو بنو اسد کا مسکن تھا، پرورش پائی اور رئیسوں کے لڑکوں کی طرح بہت ناز و نعم میں پروان چڑھا۔ جب جوان ہوا تو شہزادوں کی طرح سیر و شکار، کھیل کود، شراب نوشی اور شاہد بازی میں پڑ گیا۔ لڑکیوں سے عشق بازی اور عورتوں سے

۱۔ پورا سلسلۂ نسب یوں ہے: امرؤالقیس بن حجر بن الحارث بن عمرو بن حجر آکل المرار بن عمرو بن معاویہ بن الحارث بن یعرب بن ثور بن مرتع بن معاویہ بن کندہ (طبقات فحول الشعراء ابن سلام۔ سلسلۂ نسب میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ دیکھئے جمہرۃ اشعار العرب: ابوزید القرشی۔ ۲۔ کہتے ہیں کہ اس لقب کا سبب یہ شعر تھا: وبدلت قرحا داميا بعد صحة — لعل منايانا تحولن ابؤسا

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے فی الادب الجاہلی میں 'الملک الضلیل' کی یہ تشریح کی ہے کہ وہ بادشاہ جس کے حالات ہمیں معلوم نہیں، یعنی مجہول الاسم اور مجہول الحال، جیسے ضل بن ضل۔

معاملہ بندی کے واقعات کو بصراحت نظم کرنا اور ان سے فحاشی کی حد تک اظہار تغزل کرنا رات دن کا مشغلہ ہو گیا۔ رعیت اور حکومت کے کاموں سے نہ دلچسپی لیتا اور نہ اپنی حرکات و سکنات میں اس وقار اور تمکنت کو ملحوظ رکھتا جو ایک شہزادہ اور بڑے گھرانے کے نوجوان کے شایان شان تھی۔ چنانچہ اس کی ان نازیبا حرکات کی وجہ سے باپ اس سے خفا رہتا تھا۔ اس نے کئی دفعہ اسے سمجھا بجھا کر ان حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر ڈانٹ ڈپٹ اور سختی سے بھی بگڑا نوجوان راہ راست پر نہ آسکا، تو اسے گھر سے نکال دیا۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ جب گھر بار، خاندان اور اس کے وقار کے بندھنوں سے آزادی مل گئی، تو یہ نوجوان اور کھل کھیلا۔ اس کے ارد گرد اس زمانے کے بگڑے دل نوجوان، چور اچکے قسم کے بدمعاش اور آوارہ لڑکے جمع ہو گئے اور دن رات تالاب اور جھرنوں کے کنارے پڑاؤ ڈالے، داد عیش و عشرت دیتے، شراب پیتے، عیاشی کرتے اور لونڈیوں کے ناچ گانے کا لطف اٹھاتے۔ جب ایک تالاب کا پانی خشک ہو جاتا اور ارد گرد کی گھاس ختم ہو جاتی، تو دوسرے تالاب پر پہنچ جاتے اور وہاں داد عیش دیتے، اور اس طرح یہ لوگ رات دن عیش کوشی و مستی میں گزار رہے تھے کہ ایک دن جبکہ بے فکروں اور متوالوں کا یہ قافلہ حضر موت کے قریب ایک گاؤں 'دمون' میں تھا کہ اس کے باپ کے قتل ہونے کی خبر ملی۔ اس کے باپ حجر کی سختیوں اور ٹیکس وصول کرنے میں اس کی زیادتیوں کی وجہ سے بنو اسد کے لوگ اس سے تنگ آگئے تھے اور اس کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یورش کر کے اسے قتل کر ڈالا تھا۔ عین محفل شراب میں جب کہ ساغر و مینا کھنک رہے تھے، امرؤ القیس کو باپ کے مرنے کی خبر ملی تو اس کے دل پر سخت چوٹ لگی، لیکن اس نے اس خیال سے کہ محفل کے رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے، اپنے دوستوں سے اس خبر کو چھپائے رکھا اور کہا تو صرف اتنا کہا: "ضَیَّعنی صغیرا، وحَمّلنی دمَہ کبیرا، لا صَحْوَ الیوم ولا سُکرَ غدًا، الیوم خمرٌ وغدًا أمرٌ" یعنی بچپنے میں میرے باپ نے مجھے گنوا دیا اور جوانی میں اپنا خون میرے سر منڈھ دیا۔ آج ہوشمندی نہیں ہوگی، اور کل بدمستی نہیں ہوگی، آج شراب لنڈھے گی اور کل کام کی بات ہوگی۔[1]

چنانچہ دوسرے دن اس نے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی اور قبائل عرب میں پھر کر

1۔ اغانی نے بروایت ابن کلبی لکھا ہے لیکن اس میں ایک دوسری روایت بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ امرؤ القیس باپ کے قتل کے وقت موجود تھا۔ ڈاکٹر شوقی ضیف نے بھی اس کو زیادہ صحیح بتایا ہے۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، جرجی زیدان، ۱/۸۰ مطبوعہ دار الکتب العربیۃ۔ لیکن اکثر مورخین اور تذکرہ نگاروں نے یہی لکھا ہے کہ امرؤ القیس باپ کے قتل کے وقت موجود نہ تھا۔

اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لئے مدد مانگتا رہا۔ بعض قبیلے اس کا ساتھ دیتے اور بعض قبیلے معذرت کر لیتے تھے چنانچہ اپنے ساتھی براقی اور قبیلہ بکر و تغلب کے اپنے رشتہ داروں کو لے کر اس نے بنو اسد سے جنگ کی اور ان میں سے بہتوں کو قتل کر ڈالا۔ پھر بھی دل کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی کیونکہ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک وہ ایک سو آدمیوں کو موت کے گھاٹ نہ اتار دے گا اور سو آدمیوں کی پیشانیوں کو چکنا چور نہ کر دے گا،(۱) اس وقت تک نہ گوشت کھائے گا نہ شراب پیئے گا چنانچہ وہ مزید فوج جمع کرنے کے خیال سے قبائل میں مدد کے لئے گشت کرنے لگا۔ اسی درمیان میں منذر نے جو حیرہ کا بادشاہ تھا اور جس کی امرؤالقیس کے خاندان سے پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی بعض عرب قبائل کو جن میں ایاد، بہراء اور تنوخ شامل تھے، امرؤالقیس کے خلاف اکسا دیا، پھر کسریٰ انوشیروان بن قباذ نے بھی جو اس وقت منذر کے خاندان سے خوش تھا ایک بھاری فوج مخالف قبائل کی مدد اور امرؤالقیس سے برد آزمائی کے لئے بھیج دی۔ ظاہر ہے کہ امرؤالقیس اور اس کے آدمیوں میں اتنا دم کہاں تھا کہ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتے۔ چنانچہ اس کے ساتھی ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے اور آخر میں امرؤالقیس تنہا رہ گیا۔ اب اس نے پھر سے قبائل عرب میں گشت کرنا شروع کیا کہ مقابلہ کے لئے پھر سے اپنی فوج ترتیب دے۔ لیکن اس میں اس کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ گھومتے پھرتے وہ سموأل بن عادیا کے پاس پہنچا اور اس سے پناہ مانگی۔ اور اپنی زرہیں اور اپنے ہتھیار اور اپنی بیٹی کو اس کی امانت میں رکھا اور اس سے کہا کہ شام کے بادشاہ حارث بن شمر الغسانی کو ایک تعارفی خط لکھ دو کہ وہ مجھے قیصر روم کے پاس پہنچا دے۔ اور مدد کرنے کی سفارش کر دے۔ چنانچہ حارث نے امرؤالقیس کو قیصر روم کے پاس پہنچا دیا اور امرؤالقیس نے اس کی شان میں زوردار مدحیہ قصیدہ پڑھا اور اپنے دشمنوں کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ قیصر روم منذر اور اس کے ساتھیوں سے اس لئے جلتا تھا کہ وہ لوگ ایرانیوں کے ماتحت تھے، جو رومیوں کے دشمن تھے۔ چنانچہ قیصر نے ایک بڑی فوج اس کے ساتھ کر دی لیکن اس فوج کو لے کر ابھی امرؤالقیس تھوڑی دور بھی نہیں گیا تھا کہ قیصر نے اسے مع اپنی فوج کے واپس بلا بھیجا، کیونکہ اس درمیان میں بنو اسد کے ایک شخص الطماح الاسدی نے قیصر سے یہ

(۱) بعض نقادوں نے اسی قسم کا انکار کیا ہے۔

(۲) اس قصہ کے لیے امرؤالقیس کے اس شعر سے استدلال کیا جاتا ہے۔ لقد طمح الطماح من نحو أرضه ليلبسني من دائه ما تلبسا۔ اس قصہ کی پوری تفصیل مع حوالہ جات شرح المعلقات السبع للزوزنی مدینہ، تحقیق محمد علی حمالیہ، المکتبۃ الاموية دمشق میں ہے۔

شکایت کردی تھی کہ امرؤالقیس تو تمھیں گالیاں دیتا پھرتا تھا۔ بعض راویوں کا کہنا ہے کہ خود امرؤالقیس کے ساتھیوں میں سے بعض نے قیصر "یوستنیانوس" سے کہا کہ امرؤالقیس نے اپنی قوم سے کہا ہے کہ وہ قیصر کی لڑکی سے خط و کتابت کرتا ہے۔ اس پر قیصر کو غصہ آیا اور بلطائف الحیل اسے ختم کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اس نے امرؤالقیس کو انعام کے طور پر ایک خلعت عطا کی جو زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ جب امرؤالقیس اسے پہن کر چلا تو اس کے سارے جسم میں چھالے پڑ گئے اور کھال اتر گئی۔ اسی وجہ سے اسے ذوالقروح ،زخموں والا کہتے ہیں۔ اور قسطنطنیہ سے واپس ہوتے ہوئے انقرہ کے پاس مرگیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس کی وفات ہجرت سے ایک صدی قبل یعنی ۵۴۰ء میں ہوئی۔ لیکن یہ کوئی یقینی بات نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی نہ کوئی تحریری سند ہے اور نہ کسی مستند اور ثقہ راوی کی روایت۔[1]

کلام کی امتیازی خصوصیات

جاہلی شعرا میں امرؤالقیس سب سے مشہور اور پرگو شاعر گزرا ہے۔ اس لئے اسے عصر جاہلی کے شعرا میں طبقہ اوّل میں شامل کیا جاتا ہے۔ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ اگرچہ اس سے پہلے ابودُؤَاد الأیادِی اور امرؤالقیس کا ماموں مہلہل بن ربیعہ نے شعروشاعری کی ابتدا کردی تھی۔ لیکن امرؤالقیس کو کثرت اشعار، تنوع مضامین، حسن وصف، منظرکشی ، دقت معانی، حسن بیان اور سجاری بھرکم الفاظ استعمال کرنے میں سارے جاہلی شعرا پر تفوق حاصل ہے پھر اس کا کلام اس کی زندگی کا پورا آئینہ دار ہے۔ یونس بن حبیب کہتے ہیں کہ بصرہ کے علماء امرؤالقیس کو تمام شعرا پر فوقیت دیتے تھے۔ فرزدق سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ تو اس نے کہا کہ ذوالقروح یعنی امرؤالقیس۔ اسی طرح لبید سے پوچھا گیا کہ تمھارے خیال میں سب سے بڑا شاعر کون ہے، تو اس نے جواب دیا کہ الملک الضلیل یعنی گمراہ بادشاہ۔

امرؤالقیس جاہلی زمانہ کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے سب سے پہلے دوستوں سے محبوبہ کے اجڑے دیار پر ٹھہرنے اور تھوڑی دیر یاد میں رونے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس نے سب سے

۱۔ امرؤالقیس کی تاریخ وفات میں بہت اختلاف ہے۔ ۵۳۰ء سے لے کر ۵۶۵ء تک کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔

پہلے عورتوں کو ہرنیوں، نیل گایوں سے اور گودے رنگ کو شتر مرغ کے انڈے کے رنگ سے تشبیہ دی۔ گھوڑے کا وصف بیان کرتے وقت اسے جنگلی جانوروں کو قید کرنے والا سے تشبیہ دی۔ (یعنی اس کا گھوڑا اتنا تیز رفتار ہے کہ جنگلی جانوروں کو دوڑ کر پکڑ لیتا ہے) اسی طرح غزل میں نزاکت خیالی اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے، جس کے معانی و مطالب فوراً ذہن میں آجائیں۔ اس کے علاوہ اس نے استعارہ اور تشبیہ کے برمحل اور پر تاثیر استعمال میں بھی سارے جاہلی شعرا کے مقابلہ میں خاص امتیازی شان پیدا کی ہے۔ اور وصف میں تو اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ اس نے محبوبہ کا، گھوڑے کا، رات کا اور بادوباراں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا جواب بھی پوری جاہلی شاعری میں نہیں ملتا۔ زمانے کا شکوہ اور دوستوں، یاروں کا ساتھ چھوڑنے سے متعلق جو اشعار اس نے کہے ہیں وہ بھی بہت پر تاثیر اور اچھوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے شعرا نے بہت سے مضامین میں اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی لیکن اس کے مقام کو نہ پاسکے۔

امرؤالقیس کے کلام میں ان خوبیوں کے ساتھ پوری بدوی شان بھی نمایاں ہے۔ خیالات میں بدویت کے علاوہ بہت ثقیل اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتا ہے۔ کہیں کہیں پیرایۂ بیان خاصا گنجلک اور مشکل بھی ملتا ہے۔ عورتوں سے گفتگو اور معاملہ بندی کے وقت عریانی اور فحاشی تک پر اتر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے اپنی چچازاد بہن عنیزہ سے عشق تھا۔ اس سے ملاقات اور سفر میں ساتھ ہونے کے جو نقشے اس نے کھینچے ہیں وہ انتہائی عریاں، جنسیت سے بھرپور اور معاملہ بندی کی آخری حد ہیں۔ مگر انداز بہت دل آویز ہے۔ اور چونکہ وہ شہزادہ تھا اس نے کلام میں بڑی شان و شکوہ اور بلند خیالی بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جب اس نے ایک تالاب کے کنارے لڑکیوں کے لئے اپنی اونٹنی ذبح کردی تو اس کے گوشت کو لڑکیوں نے ایک دوسرے پر جس طرح پھینکنا شروع کیا، اس کا نقشہ بڑی شان سے کھینچتا ہے[1]

فظل العذاری یرتمین بلحمہا　　　وشحم کہداب الدمقس المفتل

یعنی ناکتخدا لڑکیاں اس اونٹنی کا گوشت اور بٹے ہوئے ریشم جیسے چربی کو ایک دوسرے پر پھینک کر اٹھکیلیاں کرنے لگیں۔

جنگلوں، بیابانوں میں مارے مارے پھرنے کے باوجود عزائم بہت بلند اور نگاہ بہت اونچی

1۔ اس معلقہ کا مکمل ترجمہ آگے آئےگا۔

رکھتا تھا۔ حقیر اور کمتر چیز پر نظر نہیں جمتی تھی۔ کہتا ہے۔

فلو أنّ ما أسعیٰ لأدنیٰ معیشۃ　　　کفانی ولم اطلب قلیلا من المال

ولکنّما أسعیٰ لمجد مؤثل　　　وقد یدرک المجد المؤثل أمثالی

یعنی اگر میری کوششیں محض گھٹیا قسم کی زندگی کے لئے ہوتیں تو جو کچھ میرے پاس ہے، وہی میرے لئے کافی ہوتا اور میں تھوڑے سے مال کے لیے تگ و دو نہ کرتا۔

لیکن میں تو خاندانی عز و جاہ کی تگ و دو میں لگا ہوا ہوں اور اس قسم کی عزت میرے ہی جیسے لوگ حاصل کر پاتے ہیں۔

سراپا (وصف) اور منظر نگاری میں امرؤ القیس نے جاہلی شعرا کے درمیان کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنی محبوبہ عُنیزہ کا سراپا کتنے حسین لیکن کھلے الفاظ میں کھینچا ہے۔

مهفهفة بیضاء غیر مفاضة　　　ترائبها مصقولة کالسجنجل

یعنی وہ گوری چٹی ہے۔ اس کی کمر پتلی ہے۔ اس کا پیٹ ڈھیلا ڈھالا یا ہرگز نکلا ہوا نہیں ہے۔ اور ہار پہننے کی جگہ (یعنی حلق کے نیچے والا حصہ سینہ سے قریب) آئینہ کی طرح چمکدار اور چکنا ہے۔

گردن کی تعریف یوں کرتا ہے:۔

وجید کجید الرئم لیس بفاحش　　　اذا هی نصته ولا بمعطل

اور اس کی گردن (تناسب اور خوبصورتی میں) ہرنی کی گردن کی طرح ہے۔ جب وہ گردن اٹھا کر دیکھتی ہے تو نہ بُری لگتی ہے اور نہ زیور سے خالی معلوم ہوتی ہے، یعنی گردن سونی نہیں دکھائی دیتی۔

پنڈلیوں اور کمر کا نقشہ یوں کھینچا ہے:۔

وکشح لطیف کالجدیل مخصر　　　وساق کانبوب السقی المذلل

اور اس کی کمر اتنی پتلی ہے کہ جیسے چمڑے کی بنی ہوئی مہار اور اس کی پنڈلی اتنی چمکتی اور صاف ستھری ہے، جیسے کہ خوب سیراب کئے ہوتے شاداب اور جھکے ہوتے بانس کا پور ہو۔

گھوڑے کے وصف میں بھی امرؤ القیس نے ایسی چابکدستی دکھائی ہے کہ جس کی مثال جاہلی شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔ کہتا ہے:۔

وقد أغتدي والطير في وكناتها — بمنجرد قيد الأوابد هيكل
مكر مفر مقبل مدبر معا — كجلمود صخر حطه السيل من عل
كميت يزل اللبد عن حال متنه — كما زلت الصفواء بالمتنزل

یعنی میں صبح تڑکے جبکہ چڑیاں بھی اپنے گھونسلوں میں ہوتی ہیں، ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل پڑتا ہوں جو بہت تنومند ہے اور جس کے بال بہت کم ہیں اور جو اتنا تیز رفتار ہے کہ جنگلی جانوروں کو بھی پکڑ لیتا ہے۔

(جو شہسواروں کی مرضی کے مطابق) حملہ کے موقع پر ٹوٹ پڑتا ہے، بھاگنے کا موقع ہوتا ہے تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ پیش قدمی کی ضرورت ہو تو آگے بڑھ جاتا ہے۔ پیچھے ہٹنے کی ضرورت ہو تو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس سخت پتھر کی طرح ہے، جسے سیلاب نے اونچائی سے نیچے پھینک دیا ہو۔

یہ گھوڑا کمیت لال ہے اور اس قدر فربہ اور چکنا کہ زین بھی اس کی پیٹھ سے پھسل کر گر پڑتی ہے جس طرح بارش کی وجہ سے سخت، چکنا اور صاف ستھرا پتھر پھسل کر گر پڑے۔

اسی طرح سے امرؤ القیس نے رات، بارش اور درندوں وغیرہ کے وصف میں بھی کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے۔[1]

غزل میں اس کے یہ اشعار نمونہ سمجھے جاتے ہیں:-

أفاطم مهلا بعض هذا التدلل — وإن كنت قد أزمعت هجري فأجملي
أغرك مني أن حبك قاتلي — وأنك مهما تأمري القلب يفعل
وإنك قسمت الفؤاد فنصفه — قتيل ونصف في حديد مكبل
وما ذرفت عيناك إلا لتضربي — بسهميك في أعشار قلب مقتل
تسلت عمايات الرجال عن الصبا — وليس فؤادي عن هواها بمنسل

یعنی اے فاطمہ[2]، ذرا اپنے ناز و انداز کو روک کے رکھو اور اگر تم نے جدائی کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو اس کو بھی اچھے ڈھنگ سے کرو۔

کہیں تم اس دھوکہ میں تو نہیں ہو کہ تمہاری محبت مجھے مار ڈالے گی اور یہ کہ تم جو حکم دو گی اسے دل بسر و چشم بجا لائے گا۔

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "الوصف" سلسلۃ فنون الادب، مطبوعہ قاہرہ۔ ۲۔ بعض روایتوں میں "امری" منقول ہے۔

تم نے میرے دل کے دو حصے کر دیے ہیں، ایک حصہ کشتہ ہوچکا ہے اور دوسرا حصہ لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

تمہاری آنکھوں نے آنسوؤں کی لڑیاں صرف اس لئے پرونی شروع کی ہیں کہ تم اپنے دونوں نینوں کے بانوں سے میرے شکستہ اور تمہاری محبت میں ہارے ہوئے دل پر سخت چوٹ لگاؤ۔

لوگوں کی راہ محبت میں کوربینی ختم ہوچکی ہے لیکن میرے دل سے اس کا خیال نہیں جانے والا ہے۔

میدانی نے کتاب الامثال میں قبیلہ طے کی ایک عورت سے اس کی شادی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جن دنوں امرؤ القیس قبیلہ طے میں رہا کرتا تھا۔ علقمہ الفحل سبھی وہاں آکر اتفاق سے ٹھہرا۔ دونوں میں بحث چل گئی کہ ہم میں سے کون بڑا شاعر ہے، چنانچہ اسی عورت کو حکم بنانے پر فیصلہ ہوا۔ امرؤ القیس نے اس کے سامنے اپنا وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے۔

خلیلی مرا بی علیٰ اُمّ جندب   نقض لبانات الفؤاد المعذّب

یہاں تک اس نے یہ شعر پڑھا۔

فللسوط الھوب وللساق درۃ   وللجزر منہ وقع اھوج منعب

اس کے بعد علقمہ نے اپنا قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے

ذھبت من الھجران فی غیر مذھب   ولم یک حقا کل ھذا التجنب

یہاں تک کہ جب اس شعر پر پہنچا کر

فادرکھن ثانیاً من عنانہ   یمر کغیث رائح متحلب

تو اس عورت نے امرؤ القیس سے کہا کہ علقمہ تم سے بڑا شاعر ہے۔ امرؤ القیس نے کہا کہ وہ کیسے تو اس نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ تمہیں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگانے، ڈانٹنے اور مارنے کی ضرورت پیش آئی، مگر علقمہ کا گھوڑا اتنا اچھا تھا کہ صرف لگام ہی کے اشارے سے اس نے شکار کو قبضہ میں کر لیا۔ امرؤ القیس اس فیصلہ سے خفا ہوگیا۔ جس کے بعد اس نے اس کو طلاق دیدی، اور علقمہ نے اس سے شادی کرلی۔ اسی جیت کے بعد سے علقمہ کو الفحل یعنی نر کہا جانے لگا۔ مگر اس قصہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے[1]

۱۔ اس مقابلہ کا تفصیلی حال علقمہ کے حالات زندگی میں، اس کتاب کے ص ۲۴ پر لاحظہ کیجیے۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ امرؤ القیس نے قسم کھا رکھی تھی کہ میں صرف اس لڑکی سے شادی کروں گا جو یہ پہیلی بوجھ لے کہ آٹھ، چار، اور دو کیا ہیں۔ چنانچہ اس نے کتنی لڑکیوں سے یہ سوال کیا۔ سب نے کہا کہ چودہ۔ وہ ایسی لڑکی کی تلاش میں چلا جا رہا تھا کہ اسے ایک آدمی ملا جس کے ساتھ ایک کمسن اور نہایت ہی حسین لڑکی تھی۔ امرؤ القیس نے اس سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ آٹھ، چار، اور دو کیا ہیں؟ لڑکی نے برجستہ جواب دیا کہ آٹھ تو کتیا کے تھن ہیں، اور چار اونٹنی کے اور دو عورت کے دودھ۔ یہ جواب سن کر امرؤ القیس بہت خوش ہوا اور اس نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ پھر اس لڑکی نے بھی بہت سی شرائط اس سے رکھیں۔

امرؤ القیس کا معلقہ

جاہلی شعر و شاعری اور امرؤ القیس کے کلام کا سب سے اچھا اور بھرپور نمونہ اس کا وہ شہرۂ آفاق معلقہ ہے جس میں اس نے ساری قوت بیان اور حسنِ تغزل و وصف و تشبیہ صرف کر دی ہے اور شاید اس کے کلام میں سے معلقہ ہی کے اکثر اشعار ایسے ہیں جن پر ادب جاہلی کے موافقین اور مخالفین سب کا تقریباً اتفاق ہے کہ وہ صحیح ہیں ورنہ اس کے بیشتر کلام کو موضوع اور عباسی دور کی اختراع بتایا گیا ہے[1]

بہرحال چونکہ یہ معلقہ نہ صرف امرؤ القیس کی زندگی کا آئینہ دار ہے بلکہ اس کے کمال فن کا بھی شاندار مظہر ہے۔ اسی لئے عربی ادب میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ اس معلقہ کو کہنے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسے اپنی چچازاد بہن عُنَیزہ بنت شرجیل سے محبت تھی۔ خاندان کے لوگ اس سے ملنے میں اس وجہ سے مانع ہوتے تھے کہ وہ کہیں اس کا نام لے کر شعر و شاعری نہ شروع کر دے۔ اور یہ بات بدوی معاشرہ میں معیوب تھی۔ چنانچہ وہ چوری چھپے اس سے ملا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب قبیلہ نے کوچ کیا تو یہ چپکے سے مردوں سے الگ ہو گیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ قافلہ کے آگے مرد ہوتے اور پیچھے عورتیں۔ چنانچہ امرؤ القیس مردوں سے الگ ہو کر عورتوں کے پیچھے لگ گیا۔ راستے میں ایک تالاب دَارَۃ جُلجُل کے نام سے پڑتا تھا۔ امرؤ القیس نظریں بچا کر عورتوں سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب عورتیں تالاب پر پہنچیں تو انھوں نے کپڑے

1۔ تفصیل طٰہٰ حسین فی الادب الجاہلی میں دیکھئے اور اس کا جواب النقد التحلیلی، محمد احمد الغمراوی میں پڑھئے۔ طٰہٰ حسین کا جواب محمد علی حمد اللہ نے بھی "شرح المعلقات للزوزنی" کے مقدمہ پر دیا ہے۔

اتار کر تالاب میں نہانا شروع کر دیا۔ اس میں اس کی محبوبہ عُنیزہ بھی تھی۔ ادھر امرؤالقیس نے یہ کیا کہ سب کپڑے جمع کر کے ان پر بیٹھ گیا اور عورتوں سے کہا کہ جب تک ننگی میرے سامنے نہ نکلو گی، کپڑے نہیں دوں گا۔ عورتوں نے بہت خوشامد کی لیکن وہ نہ مانا۔ جب بہت دیر ہو گئی تو مجبوراً ایک ایک کر کے سب نکلتی گئیں اور سب کو ان کے کپڑے دیتا گیا۔ عنیزہ نے نکلنے میں بہت حیل، حجت کی اور کپڑوں کے لئے بہت خوشامد درآمد کی لیکن امرؤالقیس نے ایک کی نہ سنی، چنانچہ وہ بھی ننگی باہر نکلی اور کپڑے لے کر پہنے۔ ان اٹھکھیلیوں میں ظاہر ہے بہت دیر ہو گئی۔ لڑکیوں نے کہنا شروع کیا کہ خدا تجھے غارت کرے، تو نے اتنی دیر کرادی۔ قافلہ کہاں نکل گیا ہو گا۔ اور اب ہمیں بھوک بھی لگ رہی ہے۔ امرؤالقیس نے فوراً اپنی اونٹنی ذبح کی۔ لڑکیوں نے گوشت بھونا، خوب کھایا پیا۔ جب چلنے کا وقت ہوا تو سب نے امرؤالقیس کا سامان بانٹ کر اپنے اونٹوں پر لادیا، سامان تو لد گیا لیکن خود امرؤالقیس کے لئے سوال تھا کہ وہ کس طرح جائے۔ چنانچہ اس نے عنیزہ سے کہا کہ تم مجھے اپنے اونٹ پر بٹھا لو اور دوسری سب لڑکیاں بھی پیچھے پڑ گئیں۔ مجبوراً عنیزہ نے اسے اونٹ کے اگلے حصہ پر بٹھا لیا، اور اس طرح یہ قافلہ حسینان چل پڑا۔ راستہ میں امرؤالقیس عنیزہ کے ہودہ میں سر ڈال کر اس سے پیار و محبت کی باتیں کرتا اور اس طرح یہ دلچسپ سفر ختم ہوا۔ اس واقعہ کے بعد اس نے اپنا یہ مشہور معلقہ کہا۔ جس میں نہ صرف اس واقعہ کا ذکر ہے، بلکہ مختلف موضوعات، مناظر اور مضامین اس میں آئے ہیں۔ مطلع یہ ہے:۔

قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل　　　بِسَقْطِ اللوى بين الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

یعنی اے میرے دونوں دوستو! ذرا ٹھہرنا تاکہ ہم تھوڑی دیر اپنے محبوب اور اس کی منزل کو یاد کر کے جو دخول اور حومل کے درمیان سقط اللوی میں ہے رو لیں۔ اس معلقہ میں ۸۱ شعر ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ معلقہ ایک نشست کی کاوشِ فکر کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس نے اسے اپنے زمانہ شباب و شاہد بازی کے مختلف اَدوار میں پورا کیا ہے۔ اس کا مرکزی خیال غزل ہے۔

اس کے بعد محبوبہ کے ٹھہرنے کی جگہوں کی نشانیوں (اطلال یا دیار) کو یاد کر کے نالہ و شیون اور سوزشِ غم کا اظہار یوں کرتا ہے:۔

وقوفا بها صحبى على مطيهم　　　يقولون لا تهلك أسى وتجمل

وإن شفائى عبرة مهراقة　　　فهل عند رسم دارس من معول

یعنی میرے دوستوں نے ان اطلال یا دیار کے پاس اپنی سواریاں روک کر مجھ سے کہا کہ

شدت غم میں اپنے کو ہلکان نہ کرو، بلکہ صبر و تحمل سے کام لو۔ مگر میری بیماری کا علاج تو بہتے آنسو میں ہے لیکن کیا مٹتے ہوئے نشانات پر بھلا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی میں لاکھ روؤں، دھوئیں محبوبہ کے یہ نشانات جو امتداد زمانہ سے اب مٹنے لگے ہیں میری باتوں کا جواب کہاں دے سکتے ہیں یا مجھے کیا سکون پہنچا سکتے ہیں۔

اس کے بعد غزل شروع کرتا ہے اور ام الحویرث اور ام الرباب، دو عورتوں سے اظہار تشبیب[1] کرتا ہے، پھر اپنی جوانی کے زمانے کی رنگ رلیوں اور خاص طور سے تالاب دارۃ جلجل کا ذکر بڑے والہانہ انداز سے کرتا ہے۔ غزل میں انداز بیان بڑا شوخ اور حرف و حکایت اور معاملہ بندی بڑی عریاں اور وصف و منظر کشی میں بڑی بیباکی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کے ہر ہر عضو کا حتی کہ مغابن کا بھی نقشہ یوں کھینچ دیتا ہے کہ عورت ایک مرمریں مجسمہ کی طرح سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔ اور معاملہ بندی میں تو وہ اخلاق و ادب کے سارے حدود کو پار کر گیا ہے۔ اس نے نا کتخدا دوشیزاؤں کے علاوہ حاملہ اور دودھ پلاتی عورتوں کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ پھر ایک دوسری لڑکی سے اپنی ہوسناکی کی داستان بڑے کھلے الفاظ میں بیان کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے اس کے اشعار۔

كدأبك من أم الحويرث قبلها — وجارتها أم الرباب بمأسل

سے اس کے شعر تسلت عمايات الرجال عن الصبا تک۔ اس کے بعد شب ہجران کا اور وہ بھی صحرا و بیاباں کی، مہیب نقشہ کھینچتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

وليل كموج البحر أرخى سدوله — على بأنواع الهموم ليبتلي

فقلت له لما تمطى بصلبه — وأردف أعجازا وناء بكلكل

ألا أيها الليل الطويل ألا انجلي — بصبح وما الإصباح منك بأمثل

یعنی سمندر کی طوفانی موجوں جیسی مہیب رات نے مختلف قسم کے رنج و غم کی چادر میرے

1- ام الحویرث: ھرۃ الحارث بن حصین بن ضمضم الکلبی کی ماں کی کنیت ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ الحارث کی ماں نہیں بلکہ بہن تھی اور اس سے امرؤالقیس کے والد نے شادی کی تھی۔ اسی لئے اس نے جب اس سے اظہار تشبیب کیا تو باپ نے اسے نہ صرف گھر سے نکال دیا بلکہ اسے قتل کرنے کی تدبیر بھی کر رہا تھا۔

ام الرباب: قبیلہ کلب کی ایک عورت کا نام تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے:

المعلقات العشر واخبار قائلیھا: احمد بن الامین الشنقیطی، مطبوعہ المطبعۃ الرحمانیہ، مصر ۱۳۴۸ھ

اور محض میری آزمائش کے لئے پھیلا دی۔ چنانچہ جب رات خوب بھیگ گئی اور چاروں طرف اس کا ڈنکا بجنے لگا، اور درازی بہت تکلیف دہ ہو گئی تو میں نے کہا کہ اے لمبی رات کیا تیرے دامن سے کبھی صبح طلوع ہو گی یا نہیں؟ لیکن اگر صبح ہوتی بھی تو کیا ہے؟ میرے لئے وہ تجھ سے کچھ زیادہ اچھی تھوڑی ہی ثابت ہو گی۔ یعنی دن کو بھی مجھے چین نصیب نہ ہو گا۔

اس کے بعد ایک سنسان اور خوفناک وادی کا ذکر کرتا ہے۔

وواد کجوف العیر قفر قطعتہ — بہ الذئب یعوی کالخلیع المعیل

یعنی میں نے ایک ایسی ویران اور سنسان وادی کو طے کیا جو گدھے کے پیٹ کی طرح ہر سبزی و شادابی سے خالی تھی اور اس میں بھیڑیا بھوک سے بیتاب ہو کر اس جواری کی طرح چیختا چلاتا تھا، جس کے بال بچے بہت ہوں (اور وہ بازی ہار چکا ہو اور ان کا خرچ چلانے کے لئے کچھ نہ رہ گیا ہو)۔

پھر اپنے گھوڑے کی تعریف کرتا ہے۔ (یہ اشعار اور ان کا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے)

اس کے بعد شکار کا ذکر کرتا ہے،

فعن لنا سرب کأن نعاجہ — عذاری دوار فی ملاء مذیل

یعنی ہمارے سامنے نیل گایوں یا ہرنیوں کا ایک ایسا غول آیا جس کی مادائیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے کہ دوار (بت کا نام) کا طواف کرنے کے لئے حسین دوشیزائیں لمبی لمبی چادریں اوڑھ کر آئی ہوں۔ سیر و شکار کے بعد بجلی کی چمک اور کڑک کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے:۔

أصاح تری برقا أریک ومیضہ — کلمع الیدین فی حبی مکلل

یضیئ سناہ أو مصابیح راہب — أھان السلیط بالذبال المفتل

یعنی میرے دوست تم بجلی کو دیکھ رہے ہو۔ آؤ میں تمھیں اس کی چمک دکھاؤں جو چمکدار تاج نما گھٹا میں ہے اور جس کی چمک اور لپک ایسی ہے جیسے کہ محبوب کے دونوں ہاتھوں کی چمک ہو۔

پھر بطور تجاہل عارفانہ کہتا ہے کہ واقعی یہ اس بجلی کی ہی چمک ہے یا ایسے سادھو یا راہب کے چراغ کی روشنی دکھائی دے رہی ہے، جس نے خوب بٹا ہوا فتیلہ تیل کی طرف جھکایا ہو تاکہ خوب روشنی ہو جائے۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کے بعد بارش کا ذکر کرتا ہے۔ صحراء عرب جیسے علاقہ میں پانی برس جائے اور ٹھنڈی اور خنک ہوائیں چلنے لگیں، تو چرند و پرند سب

مست ہو کر گانے لگتے ہیں۔ چنانچہ امرؤالقیس نے اپنا یہ معلقہ چڑیوں کے اسی موسم خوشگوار سے خوش ہو کر گانے پر ختم کیا ہے۔

كأن مكاكي الجواء غدية　　　صبحن سلافا من رحيق مفلفل

یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحرا کے پرندوں کو صبح تڑکے عمدہ قسم کی مرچ پڑی ہوئی شراب پلا دی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ مست ہو کر نغمہ سرا ہیں۔

امرؤالقیس کی طرف دوسرے بہت سے لمبے قصیدے منسوب کئے جاتے ہیں مگر جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بہت سے علماء اور مورخین ان کو امرؤالقیس کا نہیں مانتے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ ثقہ راویوں نے ان کی روایت نہیں کی ہے۔ پھر ان میں سے بعض امرؤالقیس کی زندگی اور اس کے انداز بیان سے میل نہیں کھاتے، جیسے کہ یہ شعر:

وقربة أقوام جعلت عصامها　　　على كاهل مني ذلول مرحل

کیونکہ اس شعر میں وہ یہ کہتا ہے کہ میں مشکیزہ لئے سنسان وادیوں میں مارا مارا پھرتا ہوں اور میرے ساتھی براتی سب مجھ سے بچھڑ گئے ہیں اور یہ سب کچھ میں انتہائی تنگدستی اور فقر و فاقہ کی حالت میں کرتا ہوں۔ مگر یہ سب باتیں امرؤالقیس کی شاہانہ زندگی کے بالکل خلاف ہیں۔ اس قسم کی زندگی عرب کے خانماں برباد اور آنادنش شاعر جیسے الشنفری اور تأبط شراً گزارتے تھے، یا اس کا یہ قصیدہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قیصر کے پاس اپنے ایک شاعر دوست عمرو بن قمیئۃ الضبعی کے ساتھ قسطنطنیہ جاتے ہوئے کہا تھا۔

سما لك شوق بعد ما كان أقصرا　　　وحلت سُلَيْمَى بطن ظَبْيٍ فعرعرا

یعنی محبوبہ سے شوق ملاقات کم ہونے کے بعد اب پھر سے بڑھ گیا اور اس وقت جب کہ سلمی (محبوبہ) بطن ظبی میں جانے کے بعد مقام عرعر میں پہنچ چکی ہے۔

کیونکہ اس کا انداز بیان، اس کی روانی، اس کا سبک پن بالکل جاہلی نہیں ہے بلکہ انداز بتاتا ہے کہ اس کو اسلامی زمانہ میں وضع کر کے اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔

تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ امرؤالقیس کے تابع ایک جن تھا جس کا نام "لافظ بن لاحظ" تھا اور یہی جن اس کے ذہن میں قصیدوں کے مضامین ڈالتا تھا یا خود ہی اشعار کہہ کر اس کی طرف منسوب کر دیتا تھا۔ تابع جنوں کے اس قسم کے قصے بہت مشہور ہیں جو بالکل غلط اور من گھڑت اور محض خیالی ہیں۔ الاغانی وغیرہ میں شعرا جاہلیہ کے جنوں کے نام اور کام سب کی تفصیل

درج ہے۔ احمد بن الامین الشنقیطی نے بھی بعض شعرا کے جنوں کا تذکرہ المعلقات العشر کی شرح میں کیا ہے جو بہت دلچسپ ہیں۔

حوالہ جات:۔

۱۔ الاغانی — لابی الفرج الاصفہانی۔

۲۔ کتاب الشعر والشعراء — لابن قتیبہ

۳۔ طبقات فحول الشعراء — لابن سلام الجمحی

۴۔ جمہرۃ اشعار العرب — لابی زید القرشی

۵۔ نہایۃ الارب — للنویری

۶۔ شعراء النصرانیہ — للاب شیخو الیسوعی

۷۔ العقد الفرید — لابن عبد ربہ

۸۔ معاہد التنصیص — للعباسی

۹۔ فی الادب الجاہلی — لطہٰ حسین

۱۰۔ تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام : الدکتور شکری فیصل۔

۱۱۔ الملک الضلیل — محمد فرید ابو حدید

۱۲۔ النقد التحلیلی — محمد احمد الغراوی

۱۳۔ الوصف — سلسلۃ فنون الادب

۱۴۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۱۔ جرجی زیدان

۱۵۔ الوسیط — احمد الاسکندری و مصطفیٰ عنانی

ان کے علاوہ تاریخ ادب کی دیگر کتب اور شروح معلقات

۲- النابغہ الذُّبیانی

(م ۱۸ قبل ہجری، مطابق ۶۰۴ عیسوی)

نابغہ قبیلہ مضر کی ایک شاخ قبیلہ ذبیان کا مشہور اور پر گو شاعر تھا۔ اس کا پورا نام زیاد بن معاویہ ہے اور کنیت ابو امامہ اور لقب نابغہ۔ وہ دورِ جاہلی کے شعرا میں طبقہ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔ اپنے طبقہ کے شعرا میں معذرت خواہی میں اسے مقامِ اوّل حاصل ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ "أشعر الشعراء امرؤ القیس إذا رکب والنابغة إذا رھب" یعنی شاعروں میں سب سے بڑا شاعر امرؤ القیس ہے جب وہ سوار ہو اور نابغہ ہے جب وہ ڈر جائے یعنی ڈر کر معذرت کرے۔ یہ عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔

نابغہ کی زندگی کا سب سے عجیب و غریب واقعہ یہ ہے کہ شعر کہنے کی کوشش میں اس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ بتا دیا، جوانی گزر گئی، بڑھاپا آگیا لیکن زمامِ شعر قابو میں نہ آیا۔ پھر نہ اس کا کوئی استاد تھا اور نہ موزوں طبع کوئی مربی۔ مگر دُھن کا پکا تھا، ریاض نہ چھوڑا۔ آخر کار عمر ڈھلے یک بیک اس کی طبیعت موزوں ہو گئی اور شعر خود بخود اس کی زبان سے چشمہ کی طرح پھوٹ کر نکلنے لگے، اور ایسی بے پناہ آمد ہو گئی کہ دنیا محوِ حیرت رہ گئی۔ کلام اتنا حسین، دل آویز، معیاری اور بلند تھا کہ ہر طرف اس کا چرچا پھیل گیا۔ اور ہر بزمِ طرب میں جانِ محفل بن گیا۔ اسی وجہ سے لوگوں نے اس کا لقب نابغہ یعنی چشمہ کی طرح پھوٹ کر نکلنے والا رکھ دیا[1]۔

۱۔ نبغ الماء: پانی کا چشمہ سے پھوٹ کر نکلنا ———— (باقی ص ۱۸۰ پر)

نابغہ اپنے قبیلہ ذبیان میں بڑا محترم معزز اور محبوب سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہوں کی مدح کرنے اور ان سے انعام و اکرام لینے کی وجہ سے اس کی شخصیت لوگوں کی نظر میں کچھ مجروح تو ہوگئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے اس کی وجہ سے اپنے آپ کو گرایا نہیں، اور نہ ہی انعام و اکرام کے لالچ میں اعشیٰ کی طرح ہر کس و ناکس اور ہر امیر و رئیس کی مدح کی۔

حیرہ کا بادشاہ ابو قابوس نعمان بن المنذر جس نے ۵۸۰ء سے ۶۰۲ء تک حیرہ پر حکومت کی، اس کا ممدوح تھا۔ نابغہ کے اکثر مدحیہ قصیدے اس کی تعریف میں ہیں۔ نعمان بڑا شاعر نواز اور باذوق بادشاہ تھا۔ حضرت حسان بھی اس کے دربار میں دور جاہلیت میں آیا جایا کرتے تھے اور شاہان غسان کی شان میں بھی مدحیہ قصیدے کہتے تھے[1]۔ لیکن نعمان کو نابغہ سے جو تعلق خاطر پیدا ہوگیا تھا وہ حسان یا کسی اور شاعر سے نہ ہوسکا[2]۔

نابغہ نعمان بن المنذر کی دل کھول کر تعریف کرتا تھا اور نعمان بھی دل کھول کر اسے انعام و اکرام دیتا تھا۔ چنانچہ اس کی داد و دہش سے نابغہ کی مالداری کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا۔ لیکن جیسا کہ دستور ہے ہر صاحب کمال اور بادشاہ سے زیادہ قریب رہنے والے آدمی کے بہت سے دشمن اور حاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ نابغہ کے بھی بہت سے حاسد اور دشمن پیدا ہوگئے۔ ان حاسدوں نے نابغہ کی طرف سے نعمان کے کان بھر دیئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نعمان اس سے اس قدر خفا ہوگیا کہ اسے قتل کرانے کی دھمکی دیدی۔

نابغہ سے نعمان کی خفگی کے بارے میں مختلف روایتیں اور مختلف قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حاسدوں نے نابغہ کی زبانی ایک قصیدہ کہا جس میں نعمان کی شان میں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹) ابوزید محمد القرشی نے جمہرۃ اشعار العرب میں مظعون بن مظعون الاعرابی سے روایت کی ہے کہ نابغہ کے تابع ایک جن تھا جس کا نام ہاذر تھا۔ اس کی قوت سے نابغہ میں یک بیک شاعری کا ملکہ پیدا ہوگیا۔ مگر اس قصہ اور خیال کی کوئی اصلیت نہیں۔

نابغہ کا پورا سلسلۂ نسب یہ ہے: زیاد بن معاویہ بن جناب بن جابر بن یربوع بن غیظ بن مرۃ بن عوف بن سعد بن ذبیان بن بغیض بن ریث بن غطفان بن سعد بن قیس عجلان ــــــــ

(جمہرۃ اشعار العرب)

۱۔ شاہان غسان کی وصف میں حضرت حسان نے وہ شاندار قصیدہ کہا ہے جس کا (باقی صفحہ ۱۸۱ پر)

گستاخی کی گئی تھی اور اس پر یہ عیب لگایا گیا تھا کہ اس کی ماں فدک[1] کے ایک سنار کی لڑکی ہے اور وہ خود جاہل اور بزدل ہے۔ قریب کے لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور دور والوں کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا، اور اپنے دوست کے ساتھ بے وفائی کرتا ہے۔ جمع کرنے کو ہزاروں فوجیوں کا لشکر جمع کر لیتا ہے، لیکن دشمن کا بال بھی بیکا نہیں کر پاتا۔ کہتے ہیں کہ نعمان کو جب اس قصیدہ کی خبر ہوئی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے نابغہ کو قتل کرانے کی دھمکی دی۔

خفگی سے متعلق دوسرا واقعہ تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ نعمان نے ایک دفعہ رات کو کھانے کے بعد ترنگ میں نابغہ سے کہا کہ میری بیوی مُتَجَرِّدَہ کا سراپا کھینچو۔ اتفاق سے نابغہ کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی، اور وہ اس پر اس طرح شرمائی تھی کہ جلدی سے اپنے گورے اور مہندی لگے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ یہ انداز حیا نابغہ کو غالباً بہت بھایا ہوگا اور اس کے جذبات شاعری بھی بھڑک اٹھے ہوں گے۔ ادھر ادھر اس کے ولی نعمت سے سراپا کھینچنے کا حکم بھی مل چکا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کا سراپا کھینچا۔ اور حسین الفاظ اور دلکش و دلنواز پیرایۂ بیان کے قالب میں اس کی جیتی جاگتی مورت بنا کر رکھ دی۔ جس میں اس کے تمام اعضاء و جوارح کا ایسا بھرپور اور دلکش مرقع کھینچا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اس کی تصویر پھر جاتی تھی۔ جب سراپا کہہ کر اس نے بادشاہ کو سنایا تو اس نے اسے بہت پسند کیا، لیکن بعد میں مُنَخَّل الیَشکری مشہور شاعر نے جو دربار میں موجود تھا اور جو بقول رواۃ متجردہ سے ملتا جلتا رہتا تھا اور بقول

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) مطلع ہے: ؎ بِلّٰہِ درّ عصابۃ نادمتہم
یوماً بجلق فی الزمان الأوّل

۲۔ جمہرۃ اشعار العرب میں حضرت حسان کی زبانی اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ نقل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ باوجود میری کوشش کے نابغہ کے مقابلہ میں انھیں دربار میں رسائی نہ ہو سکی (ص ۳۷)۔

۱۔ فدک مدینہ کے قریب ایک مشہور گاؤں تھا۔ اس کی ماں سے متعلق جو اشعار نابغہ کی طرف سے منسوب کئے گئے تھے، وہ یہ تھے۔

قبح اللہ ثم ثنّی بلعن ۔۔۔ وارث الصائغ الجبان الجہولا
من یضر الادنی و یعجز عن ضر الاقاصی ومن یخون الخلیلا
ثم یجمع الجیش ذا الألوف ویغزو ۔۔۔ ثم لا یرزأ العدو فتیلا

بعض اس سے محبت بھی کرتا تھا۔ نعمان سے کہا کہ حضور اعضا و جوارح کا ایسا نقشہ اور دلنوازی اور دلداری کی ایسی باتیں تو وہی کہہ سکتا ہے جس نے خود تجربہ کیا ہو۔ کہتے ہیں کہ یہ بات نعمان کے دل میں تیر کی طرح لگ گئی چنانچہ وہ نابغہ سے خفا ہو گیا اور اسے مروانے کی دھمکی دی اور نابغہ اس سے ڈر کر شام میں شاہان غسان کے پاس بھاگ کر چلا گیا۔

خفگی کا تیسرا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نابغہ کے پاس ایک بیش قیمت تلوار تھی۔ نعمان کی نظر اس پر پڑ گئی اور اسے بھا گئی۔ چنانچہ وہ نابغہ سے اسے مانگ بیٹھا۔ لیکن نابغہ نے اسے دینے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے نعمان سے چغلی کھائی کہ اس کے دل میں آپ کی اتنی بھی قدر نہیں کہ وہ ایک تلوار آپ کی خاطر قربان کر سکے۔ اس پر نعمان اس سے خفا ہو گیا اور مروانے کی دھمکی دی۔ چنانچہ جان بچانے کے لئے نابغہ شاہان غسان کے پاس بھاگ گیا۔

یہ ہیں تین مختلف قصے جو نابغہ سے نعمان کی خفگی کے بارے میں بیان کئے جاتے ہیں، مگر ان میں سے کسی قصّے کے بارے میں ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ روایت و درایت کے اصولوں کے پیش نظر یہ صحیح ہے۔ کیونکہ ان میں سے کسی قصہ کی مستند تاریخی روایتوں سے تصدیق نہیں ہوتی۔ پھر یہ واقعات اتنے سطحی اور ناقابلِ فہم و یقین ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی تھوڑے سے غور کرنے کے بعد ان کی، اگر تکذیب نہیں کرے گا تو شک و شبہہ کی نظر سے ضرور دیکھنے لگے گا۔

نعمان کی خفگی کی وجہ بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہمیں ان قصوں میں نہیں بلکہ خود نابغہ کے کلام میں ڈھونڈنا چاہئے۔ چنانچہ جب ہم نابغہ کا وہ کلام پڑھتے ہیں جس میں اس نے نعمان سے معذرت کی ہے، تو ہمیں اس کے اس قسم کے کلام میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو مذکورہ بالا واقعات میں سے کسی کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ کرتی ہو۔ پھر آخر خفگی کی اصل وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب ڈاکٹر طٰہٰ حسین یہ دیتے ہیں کہ " دراصل اس قصہ (خفگی کے قصہ) کی بنیاد سیاسی ہے۔ کیونکہ دورِ جاہلی کے آخری زمانے میں رومیوں اور ایرانیوں میں بڑی شدید رقابت پیدا ہو گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

۱۔ تذکرہ نگاروں نے متجردہ اور منخل یشکری کی داستانِ عشق و محبت سے متعلق ایک بہت ہی خوبصورت قصیدہ نقل کیا ہے۔ جس میں اس نے کہا ہے:

ولقد دخلت علی الفتاۃ — الخدر فی الیوم المطیر

الکاعب الحسناء تر — فل فی الد مقس فی الحریر

پورا قصیدہ حماسہ، حاشیہ مولانا محمد اعزاز علی مرحوم ص ۲۰۷، مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند۔
اور حماسہ شرح تبریزی، مطبعہ السعادہ مصر ص ۲۷ پر ملاحظہ کیجئے۔
مطلع ہے:

ان کنت عاذلتی فسیری — نحو العراق ولا تحوری

حیری اور غسانی بادشاہوں کے درمیان بھی رقابت و رنجش پیدا ہو گئی۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے آقاؤں یعنی ایرانیوں اور رومیوں کی ہر طرح مدد کرنے کے لئے اپنا پورا زور صرف کرتا تھا۔ اور اس مقصد کی خاطر یہ باج گزار شاہان ہر قسم کی تدبیریں بھی کرتے تھے۔ غسانیوں کو نابغہ کی عظمت اور اپنے قبیلہ اور نجد میں جو قدر و منزلت حاصل تھی، اس کا اندازہ تھا، اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ نابغہ نعمان بن المنذر کے دربار سے منسلک ہے اور اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے اس کی وجہ سے خود نعمان کی اور اس کے واسطہ سے اس کے ولی نعمت ایرانیوں کی بھی عزت بڑھتی ہے اور قبائل نجد میں اس کا بول بالا اور توقیر ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اس شاعر کو اس دربار سے الگ کر کے اپنے دربار سے منسلک کر لیا جائے تو یہ حیرہ کے بادشاہ کی شکست کے علاوہ اسکی بے عزتی کی بات بھی ہو گی کہ اس کا درباری شاعر حریف کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اور ان کی مدح سرائی کر رہا ہے۔ چنانچہ غسانیوں نے نابغہ کو بھڑکا کر اپنی طرف کر لیا۔ نابغہ باوجود نعمان کے درباری شاعر ہونے کے، ان کے پاس چلا گیا۔ اور ان کی تعریف و توصیف کرنے لگا۔ یہ بات نعمان کو بہت کھلی اور وہ اس سے خفا ہو گیا۔ اور اسے سخت سزا دینے کا اس نے فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا اندازہ اس کے اس قصیدہ سے ہوتا ہے جس میں اس نے نعمان سے معذرت کی ہے اور جس کا مطلع ہے:۔

اتانی ابیت اللعن انک لمتنی

وتلک التی اھتم منھا وأنصب

یعنی خدا آپ کو لعنت سے بچائے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مجھے برا بھلا کہا ہے اور اس بات سے مجھے سخت تکلیف اور بہت زیادہ رنج و غم ہے[1]

مگر یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نابغہ کو نعمان کے دربار سے اتنا انعام و اکرام ملتا تھا کہ وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا تو آخر اسے غسانیوں کے پاس جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی، کیونکہ جو بادشاہ اتنا قدر دان ہو وہ عزت اور قدر و منزلت بھی اسی اعتبار سے کرے گا۔ جب عزت، قدر و منزلت، روپیہ پیسہ سب اسے اس دربار سے مل رہا تھا تو وہ پھر غسانیوں کے پاس کس لالچ میں گیا۔ اس کا جواب ڈاکٹر طہٰ حسین نے نہیں دیا بلکہ نابغہ کے کلام

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: فی الادب الجاہلی ——— ڈاکٹر طہٰ حسین، ص ۲۷۰۔

کا حوالہ دے کر مذکورہ بالا قصیدہ کا وہ شعر نقل کیا ہے جس میں نابغہ نعمان سے کٹ کر غسانی دربار سے منسلک ہونے کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ "میں تو ایک شاعر ہوں۔ میرے لئے زمین تنگ نہیں ہے۔ میں جہاں چاہوں اور جس کے پاس چاہوں، جاؤں گا اور وہاں قدر و منزلت کے ہاتھوں لیا جاؤں گا۔ ایسے لوگوں میں بعض بادشاہ اور بھائی بھی ہیں کہ جب میں ان کے پاس جاتا ہوں تو ان کے مال کا مختار اور مقرب بن جاتا ہوں"۔

ولکنني کنت إمرأ لی جانب — من الارض فیہ مستراد و مذھب

ملوك و إخوان إذ اما أتیتھم — احکم فی أموالھم و اقرب

مگر مذکورہ بالا مراعات اور یہ قدر دانی تو اسے نعمان کے دربار میں بھی حاصل تھی۔ جب یہی رعایتیں وہاں بھی ملتی ہیں تو خواہ مخواہ اسے اپنے پہلے محسن سے جس سے ملنے کے لئے وہ ہمیشہ بیتاب بھی رہا، کیوں کٹ جاتا؟ رہی یہ بات کہ ممکن ہے کہ ملوک غسان کے پاس اسے ملوک حیرہ کے مقابلہ میں زیادہ قدر و منزلت اور زیادہ عزت و احترام اور پیسہ ملا ہو، صحیح نہیں ہے کیونکہ اول تو کسی تذکرہ نگار نے اس کی نشاندھی نہیں کی ہے پھر اس کا ثبوت اس کے کلام سے بھی نہیں ملتا، کیونکہ اس نے اپنے مختلف قصیدوں میں سے کسی میں بھی اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے کہ وہ غسانی دربار میں نعمانی دربار سے زیادہ باحیثیت، زیادہ معزز اور زیادہ مقبول ہے اور یہ کہ وہ یہاں زیادہ مطمئن اور خوش ہے۔ اس کے برعکس اس کے مذکورہ بالا قصیدہ ہی میں کئی ایسے اشعار ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ غسانی بادشاہ کے مقابلے میں وہ حیرہ کے بادشاہ کی نہ صرف تعریف و توصیف کرتا ہے بلکہ اس کا درجہ اس سے کہیں زیادہ اونچا بتاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

ألم تر أن اللہ أعطاك سورۃ — تری کل ملك دونھا یتذبذب

بأنك شمس والملوك کواکب — إذا طلعت لم یبد منھن کوکب

یعنی کیا آپ (نعمان بن المنذر) نہیں دیکھتے کہ خدا نے آپ کو ایسی قوت و سطوت اور جاہ و جلال دیا ہے کہ دوسرے بادشاہ آپ کے مقابلے میں آتے ہچکچاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ سورج ہیں اور دوسرے بادشاہ ستارے ہیں (اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ) جب سورج نکل آتا ہے تو ستارے ڈوب جاتے ہیں۔

ان اشعار میں صاف صاف کہتا ہے کہ آپ کا اور دوسرے بادشاہوں کا کیا مقابلہ

آپ سورج ہیں اور دوسرے ستارے۔ جب دونوں درباروں میں سورج اور ستارے کا فرق ہے تو پھر وہ سورج کو چھوڑ کر ستارے کے پاس کیوں جاتا؟۔ اس میں تو خود اس کی بھی بے عزتی ہے اور یہ بات محقق ہے کہ اس نے یہ اشعار غسانی دربار میں رہ کر اور وہاں کے طور طریقے دیکھ کر اور ذاتی تجربہ کرنے کے بعد کہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسے وہ داد و دہش اور انعام و اکرام غسانی دربار میں نہیں ملا ہوگا جو اسے یہاں ملتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ غسانیوں نے اسے چونکہ نعمان کے پاس سے بلا لیا تھا اور نابغہ نے پھر ان کی تعریف و توصیف بھی کی، اس لئے نعمان خفا ہوگیا، دل لگتی بات نہیں معلوم ہوتی۔

غالب گمان یہ ہے کہ یہ سارا قصہ اور اس سے متعلق تمام باتیں عباسی زمانے کے منچلوں کی ذہنی عیاشی کا نتیجہ ہیں، اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ ان منچلوں میں چند بہترین دماغ کے مالک اور شعر و ادب کے مسلم استاد و راوی اور مرجع بھی تھے۔ ممکن ہے ان میں سے کسی نے لطف زبان اور لطف محفل کے لئے یہ افسانے اور ان سے متعلق یہ اشعار خود ہی کہے ہوں اور انھیں نابغہ سے منسوب کردیا ہو، اور ایسا کرنے میں انھوں نے کہانی اور قصیدے کے تانے بانے کو پوری چابکدستی اور ہوشیاری سے ملانے کی کوشش کی ہو جس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں چنانچہ مشکل سے اندازہ ہو پاتا ہے کہ یہ کلام گڑھا ہوا ہے۔ اور اس قسم کی حرکتیں اس زمانے میں بہت ہوئی ہیں۔ جس کا اعتراف تمام نقاد اور تذکرہ نگاروں کو ہی نہیں بلکہ جن لوگوں نے یہ حرکتیں کی ہیں ان میں سے بعض نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر ان میں سے کوئی قصہ صحیح ہوسکتا ہے تو نعمان کی ہجو والا قصہ ایک حد تک صحیح ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ غسانیوں نے کسی شاعر کو کچھ دے دلا کر نعمان کی ہجو کرا دی ہو اور اسے نابغہ سے منسوب کرا دیا ہو تاکہ نعمان اس سے خفا ہو کر اسے مارنے کی دھمکی دے اور جب جان بچانے کے لئے بھاگے تو ہم اس کے لئے اپنی گود پھیلا دیں۔ چنانچہ رواۃ کہتے ہیں کہ جب یہ ہجویہ قصیدہ نعمان نے سنا تو اس نے نابغہ کو مروانے کی دھمکی دی۔ نعمان کا افسر حفاظت بان عصام نابغہ کا دوست تھا۔ اس نے آکر نابغہ سے کہا کہ فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ، ورنہ تمھاری خیر نہیں۔ بادشاہ تم کو مروا دے گا۔ چنانچہ وہ بھاگ کر شاہان غسان کے پاس شام چلا گیا۔

عمرو بن حارث الغسانی نے نابغہ کو نہ صرف پناہ دی بلکہ بڑے عزت و احترام سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے دربار سے منسلک کرلیا۔ نابغہ نے بھی جی کھول کر اس کی اور اس کے بھائی

نعمان کی تعریف و توصیف میں کئی قصیدے کہے۔ مگر نابغہ کو عمرو بن الحارث الغسانی، اپنے نئے ولی نعمت سے قلبی لگاؤ نہ پیدا ہو سکا اور اس کا دل اپنے پرانے محسن نعمان بن المنذر ہی سے اٹکا رہا اور کئی معذرتی قصیدے کہہ کر اس کی غلط فہمی کو دور کرنے اور اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر نعمان کا دل صاف نہ ہوا اور نابغہ کو ایک زمانے تک شام ہی میں رہنا پڑا۔ یہاں تک کہ عمرو بن الحارث الغسانی کا انتقال ہو گیا اور نعمان نے بھی نابغہ کی مسلسل معذرت خواہی اور اس کے قلبی لگاؤ اور ایک عرصہ تک اس کی ہم نشینی اور ہمدمی کا خیال کر کے اس کی غلطی معاف کر دی اور پھر سے اسے اپنے پاس حیرہ بلا لیا۔

کہتے ہیں کہ نعمان کو جب مُتجرِّدہ اور مُنَخَّل الیشکری کے تعلق کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں کو قتل کرا دیا اور نابغہ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اپنی غلط فہمی کے دور ہونے کا ذکر کر کے اسے اپنے پاس دوبارہ بلا لیا، اور یہ لکھا کہ تم نے ان لوگوں سے منسلک ہو کر جنھوں نے میرے باپ دادا کو قتل کیا تھا مجھے بڑی تکلیف پہنچائی ہے۔ حالانکہ تمھارے لئے تو تمھاری ہی قوم میں بڑی اچھی جائے پناہ اور مضبوط قلعہ تھا۔ چنانچہ نابغہ جب واپس آیا ہے تو دیکھا کہ نعمان سخت بیمار ہے اور لوگ اسے چارپائی پر اٹھائے ہوئے ہیں تو اس نے اس سے متاثر ہو کر وہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

أَلَم اُقسِم علیكَ لتخبرنی　　أَمحمولٌ علی النعشِ الهمامُ

یعنی کیا میں نے آپ کو قسم نہیں دھرا دی تھی کہ آپ مجھے اس کی اطلاع ضرور دیں کہ کیا آپ کو چارپائی پر اٹھایا گیا۔

بعض نے یہ بھی کہا کہ نابغہ قبیلہ فزارہ کے دو آدمیوں کی حفاظت میں خود ہی نعمان کے پاس آیا۔ ان دونوں کے نعمان سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ چنانچہ ایک دن نابغہ کی نظر نعمان کی ایک گانے والی لونڈی پر پڑ گئی۔ اس نے اس لونڈی کو اپنا وہ معذرتی قصیدہ یاد کرا دیا۔ جس کا مطلع ہے:

یا دارَ مَیّةَ بالعلیاءِ فالسندِ　　أَقوَت وطالَ علیها سالفُ الأبدِ

یعنی علیا اور السند میں واقع میۃ کا اے وہ مسکن جواب ویران و سنسان پڑا ہے، اور جس پر ایک زمانہ بیت گیا ہے۔

چنانچہ ایک رات جب نعمان بادۂ شبانہ کی سرمستیوں میں سرشار تھا لونڈی نے

یہ راگ چھیڑ دیا۔ نعمان قصیدہ سن کر پھڑک اٹھا اور بول پڑا کہ یہ تو ابو امامہ کے اشعار ہیں۔ اور پھر اس سے خوش ہوگیا اور اسے اپنے پاس بلا لیا۔ بہرحال قصہ جو بھی ہو، یہ بات صحیح ہے کہ نابغہ دوبارہ نعمان کے پاس آگیا۔ اور اس طرح نابغہ پھر سے عیش و عشرت کے شادیانے بجانے لگا اور ایک طویل عمر پاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل انتقال کر گیا۔ تاریخ وفات کے متعلق کوئی صحیح بات کہنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کی کسی ثقہ راوی سے نہ روایت ملتی ہے اور نہ کوئی تحریری ثبوت ہمارے پاس ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا انتقال ۱۸ھ قبل ہجری، مطابق ۶۰۴ء میں ہوا۔

امتیازی خصوصیات

نابغہ ذبیانی سارے جاہلی شعرا میں معذرت خواہی کے فن میں امتیازی شان کا مالک ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عرصہ تک وہ اپنے محسن اور ولی نعمت نعمان بن المنذر سے اپنی غلطیوں کی معذرت ناموں کے ذریعہ معافی مانگتا رہا اور چونکہ اس کے دل سے یہ بات لگی تھی کہ وہ کسی طرح خوش ہو جائے۔ اس لئے اس قسم کے اشعار اپنی دل کی انتہائی گہرائیوں سے کہتا تھا۔ ان کا اتنا اثر ہوتا تھا کہ سامع کے دل میں اتر جاتے تھے۔ ان کے اس جذب و تاثر کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ عربی شاعری میں نابغہ سے پہلے اتنی موثر معذرت خواہی کبھی نہیں پائی گئی۔ معذرت خواہی کو صحیح معنوں میں ایک صنف کا درجہ دینے میں نابغہ کے کلام کو بڑا دخل ہے۔ اس نے اس صنف میں ایسی زیبائش نکالی کہ اس کے معذرتی قصیدوں کے اچھوتے انداز کی وجہ سے اس کا نام ہی اعتذاریات نابغہ پڑ گیا۔

نابغہ جاہلی شعرا کے طبقۂ اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس طبقہ میں تین شاعروں کے نام لئے جاتے ہیں۔ امرؤالقیس، زہیر بن ابی سلمیٰ، اور نابغہ ذبیانی۔ اس کے کلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے الفاظ بہت سبک اور خوبصورت، بندش بہت چست، معانی و مطالب صاف و واضح، اسلوب بیان بہت دلکش اور موثر ہوتا ہے۔ اس کے یہاں تکلف یا آورد نام کو نہیں۔ اسی وجہ سے جریر جیسے استاد زمانہ شاعر نے اسے تمام جاہلی شعرا میں سب سے بڑا اور ممتاز شاعر مانا ہے۔

نابغہ اپنے ہم طبقہ دونوں شاعروں میں یعنی امرؤالقیس اور زہیر بن ابی سلمیٰ کے مقابلہ میں لطیف کنایہ، بلکے اشارے، حسن معانی و مطالب اور دلکش و موثر انداز بیان میں امتیازی شان رکھتا ہے۔ ان دونوں کے مقابلہ میں اس کے کلام میں تکلف یا آورد خال خال نظر آتی ہے۔ اپنے

کلام میں احساسات وجذبات کو پوری وضاحت سے بیان کرنے اور اپنی بات سامع کے دل میں اتار دینے میں اسے بڑا ملکہ حاصل ہے۔ اس کے کلام کی انھیں خصوصیات کی وجہ سے دوسرے جاہلی شعرا کے مقابلہ میں نابغہ کا کلام سب سے زیادہ گایا گیا۔ رات کی ہولناکی کا منظر کھینچنے میں، معذرت میں موثر اور دل لگتی بات کہنے میں، ممدوح کی مبالغہ یا کذب بیانی سے پاک تعریف کرنے میں نابغہ کو ایسا کمال حاصل ہے جس کی مثال دیگر جاہلی شعرا میں کم نظر آتی ہے۔ نابغہ کے کلام کی انھیں خصوصیات کی وجہ سے بعض نقاد اس کو امرؤالقیس کے بعد جاہلی شعرا میں دوسرے نمبر کا شاعر سمجھتے ہیں۔ بعض نقادوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ" نابغہ کا کلام دل آویزی، خوبصورتی اور کشش میں دور جاہلیت کی شاعری کی معراج ہے۔" اور اسی لئے اس کو بہت سے ادبا نے اصحاب المعلقات میں بھی شامل کیا ہے

اُخطَل عہد عباسی کا وہ نامور اور خود پسند شاعر تھا جو اپنے مقابلہ میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ مگر وہ بھی نابغہ کے فضل وکمال کا معترف تھا۔ اسکے حریف جریر کی رائے اوپر گزر چکی ہے۔ ابوزید القرشی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب کے پاس غطفان کا وفد آیا تو آپ نے ان کے سامنے چند اشعار پڑھے، اور ان سے پوچھا کہ یہ اشعار کس کے ہیں اور جب انھوں نے بتایا کہ یہ اشعار نابغہ ذبیانی کے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ" ھو اشعر شعراءکم" یعنی تمھارے شاعروں میں وہ سب سے بڑا شاعر ہے [1]

مذکورہ بالا خوبیوں کے باوجود نابغہ کے کلام میں "إقواء" کا عیب پایا جاتا ہے۔ اقواء کا مطلب یہ ہے کہ ایک شعر کے قافیہ میں زبر ہو اور دوسرے شعر کے قافیہ میں پیش یا کوئی دوسرا اعراب آجائے، جیسے نابغہ کے یہ دو شعر:-

سقط النصیف ولم ترد إسقاطہ   فتناولتہ واتقتنا بالیدِ

بمخضب رخص کأن بنانہ   عنم یکاد من اللطافة یعقد

یہاں پہلے شعر کے قافیہ میں "زیر" ہے اور دوسرے شعر کے قافیہ میں "پیش" اور یہ ایک عیب ہے۔ لوگوں کو اس کا احساس تھا۔ لیکن ہمت کسی کی نہیں پڑتی تھی کہ نابغہ کو اس کی طرف متوجہ کر سکیں۔ اتفاق سے ایک دفعہ نابغہ مدینہ گیا اور وہاں ایک محفل موسیقی میں

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: جمہرۃ اشعار العرب۔ ابوزید القرشی اور طبقات فحول الشعرا، لابن سلام الجمحی۔

جس میں نابغہ بھی مدعو تھا۔ منتظمین نے مغنیہ سے فرمائش کی کہ نابغہ کا وہ قصیدہ سنائے جو اس نے نعمان کی بیوی متجردہ کا سراپا کھینچتے ہوئے کہا ہے۔ اور جس کا مطلع ہے۔

أمن آل میة رائح او مغتد عجلان ذا زاد وغیر مزودد

اور پہلے ہی سے مغنیہ کو بتا دیا تھا کہ "اقوار" والے اشعار کو ذرا کھینچ کر پڑھنا۔ چنانچہ جب گاتے گاتے اقوار والے اشعار پر آئی تو اس نے "بالیہ" کو اتنا کھینچ دیا کہ دال کا زیر "ی" ہو گیا اور "یعقد" کے دال کے پیش کو اتنا لمبا کر دیا کہ پیش "واؤ" بن گیا۔ نابغہ یک بیک چونک پڑا۔ آدمی زیرک اور ذہین تھا، فوراً غلطی کا احساس ہو گیا۔ اور اس نے اس کی اصلاح کر دی اور کہا کہ دخلت یثرب وفی شعری بعض العاهة وخرجت منها وأنا أشعرُ "یعنی جب میں مدینہ آیا تھا تو میرے شعر میں کچھ خامی تھی مگر جب میں وہاں سے نکلا، تو میں سب سے بڑا شاعر تھا۔

نابغہ کی جلالت قدر اور فن شاعری میں اس کے استادانہ کمال کے اعتراف کی ایک زندہ مثال یہ ہے کہ عکاظ کے میلے میں جب شعر و شاعری کا مقابلہ ہوتا تھا تو اسی کو حَکم بنایا جاتا تھا۔ اس کے لئے الگ چمڑے کا خیمہ لگا جاتا اور شعری مقابلہ کی محفل سجائی جاتی۔ شعرا اپنا کلام پڑھتے اور جس شاعر کے کلام کے حق میں نابغہ فیصلہ دے دیتا، اس کا سارے جزیرۂ عرب میں شہرہ ہو جاتا اور ہر خاص و عام کی زبان پر شاعر اور اس کے اشعار چڑھ جاتے۔ کہتے ہیں کہ اس میلہ میں سب سے پہلے اعشیٰ قیس نے، پھر حضرت حسان بن ثابت نے اور ان کے بعد تماضر خنساء مشہور صحابیہ اور مرثیہ گو شاعرہ نے اپنا کلام سنایا۔

کہتے ہیں کہ خنساء نے اس موقعہ پر اپنا وہ قصیدہ سنایا جس میں انھوں نے اپنے بھائی صخر کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا۔

وإن صخراً لتأتم الهداة به کأنه علم فی رأسه نار

یعنی صخر وہ روشن اور تابناک شخصیت ہے جس سے راستہ بتانے والے بھی روشنی حاصل کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پہاڑ ہے جس کی بلندی پر آگ روشن ہے۔ تو نابغہ نے کہا کہ اگر ابو بَصیر یعنی اعشیٰ نے اپنا کلام ابھی نہ سنا دیا ہوتا تو میں کہتا کہ انسانوں اور جنات میں سب سے بڑی شاعرہ تم ہو۔ یہ سن کر حضرت حسان بن ثابت کو تاؤ آگیا اور انھوں نے کہا کہ "خدا کی قسم، میں تم سے، تمھارے باپ سے اور خنساء سے بھی بڑا شاعر ہوں۔" اس پر نابغہ نے کہا کہ آخر اپنے کس شعر پر یہ دعویٰ تم کو ہے۔ تو انھوں نے اپنا وہ مشہور شعر پڑھا جس میں اپنی

(۱) اس کا مطلع ہے: قذی بعینک أم بالعین عوّار و أم اقفرت من أهلها الدار۔

قوم پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :۔

لنا الجفنات الغر یلمعن بالضحی　　　وأسیافنا یقطرن من نجدۃ دما

یعنی ہمارے یہاں چمکتے دمکتے پتیلے ہیں جو دن کو چمکتے رہتے ہیں (یعنی ہم اتنے مہمان نواز ہیں کہ مہمانوں کو کھلانے کے لئے پتیلے آگ پر چڑھے رہتے ہیں جن میں ان کے لئے کھانا پکتا رہتا ہے) اور ہماری تلواریں لوگوں کی مدد کرنے کی وجہ سے خون کے قطرے ٹپکاتی رہتی ہیں۔ اس شعر پر نابغہ نے کچھ اعتراضات کئے اور آخر میں اپنا تفوق ثابت کرنے کے لئے اپنا وہ مشہور شعر پڑھا جو اس نے نعمان بن المنذر سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا۔

فانک کاللیل الذی ھو مدرکی　　　وإن خلت أن المنتأی عنک واسع [1]

مگر بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ نوک جھونک فرضی ہے اور محض لطف محفل کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

بہر حال عکاظ کے میلے میں شعرا کے درمیان حکم بننا بہت بڑی عزت سمجھی جاتی تھی۔ اور یہ عزت نابغہ کو حاصل ہوئی۔ اس سے اس کی مسلّم حیثیت اور عربوں میں اس کی قدر و منزلت اور دنیائے شعر و شاعری میں اس کے امتیاز اور تفوق کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

عربی ادب میں معذرتی کلام کی کمی نہیں۔ لیکن معذرت خواہی میں نابغہ نے بالکل ایک اچھوتا رنگ اختیار کیا ہے۔ کبھی کبھی وہ ممدوح کی تعریف ایک چیز سے کرتا ہے اور پھر اسی چیز کی ضد سے بھی اس کی تعریف کا پہلو نکال لیتا ہے۔ جیسے اس کا یہ شعر جو اس نے نعمان سے معذرت کرتے ہوئے کہا ہے :۔

فانک شمس والملوک کواکب　　　اذا طلعت لم یبد منھن کوکب

یعنی آپ تو سورج ہیں اور (دوسرے) بادشاہ آپ کے مقابلے میں ستارے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب سورج نکل آتا ہے تو ان ستاروں میں سے ایک ستارہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تقابل کا یہ انداز اور ندرت کسی اور شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ معذرت کرتے ہوئے کتنے خوب صورت انداز میں دو متضاد چیزوں کو جمع کر کے کہتا ہے کہ :۔

فانک کاللیل الذی ھو مدرکی　　　وإن خلت أن المنتای عنک واسع

۱۔ اس قصے کی تفصیل کے لئے الاغانی اور شرح المعلقات العشر ۔ احمد بن الامین الشنقیطی ملاحظہ فرمائیے۔

یعنی آپ اس رات کی طرح ہیں جو مجھے ضرور پالے گی، چاہے میں یہ سمجھتا رہوں کہ آپ سے بچ کر نکل جانے کی راہیں بہت وسیع ہیں۔

معذرت خواہی اس کا خاص فن ہے۔ چنانچہ اس نے اس میں نت نئے معنی پیدا کئے ہیں۔ اپنی بات بہت ہی حسین اور خوبصورت انداز میں کہتا ہے۔ جب نعمان بن المنذر سے اس کی چغلی کھا کر اسے بدظن کر دیا گیا تو اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

أتانی أبیت اللعن أنك لمتنی ۔۔۔ وتلك التی تستك منها المسامع

فبت كأنی ساورتنی ضئیلة ۔۔۔ من الرقش فی أنیابها السم ناقع

یُسهّد من لیل التمام سلیمها ۔۔۔ لحلی النساء فی یدیه قعاقع

تناذرها الراقون من سوء سمها ۔۔۔ تطلقه طورًا وطورًا تراجع

فانك كاللیل الذی هو مدركی ۔۔۔ وإن خلت أن المنتأى عنك واسع

تذکرہ نگاروں کے درمیان اس قصیدہ کے اشعار میں بڑا اختلاف ہے۔ میں نے ان اشعار کے نقل کرنے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تحقیق پر اعتماد کیا ہے[1]۔

ترجمہ:-

(۱) مجھے یہ اطلاع ملی ہے ۔۔۔ خدا آپ کو لعنت سے بچائے رکھے۔ کہ آپ نے مجھے لعنت ملامت کی ہے اور یہ بات ایسی ہے جس سے میرے کان پھٹے جاتے ہیں۔

(۲) (یہ بات سن کر) میں نے اپنی رات اتنی بے چینی میں کاٹی کہ جیسے مجھے ایسی چت کبری پتلی ناگن نے ڈس لیا ہو، جس کے دانتوں میں زہر قاتل بھرا ہوا ہو۔

(۳) اس ناگن کے ڈسے ہوئے آدمی کو پوری رات جگایا جاتا ہے اور عورتوں کے زیورات کی آواز اس کے دونوں ہاتھوں میں سے آتی ہے۔

(۴) جھاڑ پھونک کرنے والے اس کے زہر کی تیزی سے ایک دوسرے کو ڈراتے رہتے ہیں، اور کبھی اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی واپس آجاتے ہیں۔

(۵) پس بیشک آپ اس رات کی طرح ہیں جو مجھے ضرور پالے گی، چاہے میں یہ سمجھتا رہوں کہ آپ سے بچ کر نکل جانے کی راہیں بہت وسیع ہیں۔

۱۔ فی الادب الجاہلی، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ص ۳۸۴۔

جب نابغہ نعمان سے ذکر کر عمرو بن الحارث الغسانی کے پاس شام گیا ہے تو اس کی شان میں جو مدحیہ قصیدہ کہا ہے وہ بھی بہت شاندار ہے۔ کہتا ہے:۔

کلینی لھم یا أمیمۃ ناصب — ولیل اقاسیہ بطئی الکواکب۔
تطاول حتی قلت لیس بمنقض — ولیس الذی یرعی النجوم بآیب
وصدر أراح اللیل عازب ھمہ — تضاعف فیہ الحزن من کل جانب
علی لعمرو نعمۃ بعد نعمۃ — لوالدہ لیست بذات عقارب
حلفت یمینا غیر ذی مثنویہ — ولا علم الا حسن ظن بصاحب

ترجمہ:

(۱) اے امیمہ مجھے اس تکلیف دہ غم میں اپنے حال پر چھوڑ دو، اور اس تکلیف دہ رات میں جس کے ستارے بہت سُست رفتار ہیں، میرے حال پر مجھے اکیلا رہنے دو۔

(۲) یہ رات اتنی لمبی ہو گئی کہ میرے منہ سے نکل گیا کہ اب یہ کبھی ختم نہ ہو گی۔ اور یہ کہ جو (ستارہ) سب ستاروں کی نگہداشت کرتا ہے وہ کبھی نہ ڈوبے گا۔ یعنی جو ستارہ سب سے پہلے طلوع ہوا تھا، اور جسے سب سے پہلے ڈوبنا چاہئے تھا، وہی نہ ڈوبے گا، تو دوسرے ستاروں کا کیا ذکر، جو اس کے بعد نکلے ہیں۔ یہ سب رات کی درازی کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) اور مجھے اور میرے اس سینہ کو جس کے بھولے بسرے غموں کو اس رات نے تازہ کر دیا ہے اور جس میں ہر طرف سے میرے اوپر رنج و غم کی یلغار ہے، اپنے حال پر چھوڑ دو۔

(۴) میرے اوپر عمرو (بن الحارث الغسانی) نے نئے سرے سے مہربانی کی ہے۔ اس کرم اور مہربانی کے بعد جو ان کے والد بغیر احسان جتائے پہلے میرے اوپر کر چکے ہیں۔

(۵) میں نے بڑی پختہ قسم کھائی ہے۔ ایسی قسم جس کی صحت کے بارے میں سوائے اپنے اس بھروسہ اور حسنِ ظن کو جو مجھے اپنے ممدوح سے ہے، دوسری چیز ثبوت کے طور پر نہیں پیش کر سکتا۔

جب نابغہ نے عمرو بن الحارث کی شان میں مذکورہ قصیدہ کہا جس میں نعمان کے حریف کی تعریف تھی تو نعمان کو اس سے بہت زیادہ تکلیف ہوئی اور اس کا پارہ بہت چڑھ گیا۔ اور اس نے اس کی احسان فراموشی اور ناسپاسی پر اسے بہت برا بھلا کہا۔ جب نابغہ کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے بہت ہی حسین انداز میں اس سے معذرت کی:۔

أتانی أبیت اللعن أنک لمتنی — وتلک التی أھتم منھا وأنصب

فبت كأن العائدات فرشنني ... هراساً به يُعلى فراشي ويقشب
حلفت فلم أترك لنفسك ريبة ... وليس وراء الله للمرء مذهب
لئن كنت قد بُلّغت عني خيانة ... لمبلغك الواشي أغش وأكذب
ولكنني كنت امرأً لي جانب ... من الأرض فيه مستراد ومذهب
ملوك وإخوان إذا ما أتيتهم ... أحكم في أموالهم وأقرب
كفعلك في قوم أراك اصطنعتهم ... فلم ترهم في شكر ذلك أذنبوا
فلا تتركني بالوعيد كأنني ... إلى الناس مطلي به القار أجرب
ألم تر أن الله أعطاك سورة ... ترى كل ملك دونها يتذبذب

یہاں تک کہ ایک بڑی حکمت کی بات کہتا ہے۔

ولست بمستبقٍ أخاً لا تلمّه ... على شعثٍ أي الرجال المهذب
فإن أك مظلوماً فعبداً ظلمته ... وإن تك ذا عتبى فمثلك يعتب

ترجمہ۔

(۱) خدا آپ کو لعنت سے محفوظ رکھے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ نے مجھے بُرا بھلا کہا ہے اور اس بات سے مجھے سخت تکلیف اور بہت رنج وغم ہوا ہے۔

(۲) اس تکلیف کی وجہ سے میں نے رات اس طرح بتائی گویا کہ میری تیمارداری کرنے والی عورتوں نے میرے لئے کانٹوں کی سیج بچھا دی ہے، جس سے میرا بستر اونچا اور نیا ہوتا رہتا ہے۔

(۳) میں نے ایسی قسم کھائی ہے جس میں آپ کے لئے شک کی گنجائش نہیں چھوڑی اور آدمی کے لئے اللہ کے سوا اور کسی کے پاس جانے کی جگہ نہیں ہے۔

(۴) اگر آپ کو میری طرف سے کسی خیانت کی اطلاع ملی گئی ہے تو (یقین کیجئے) خبر دینے والا چغلخور بہت بڑا دھوکہ باز اور بہت جھوٹا ہے۔

(۵) لیکن میں ایسا آدمی ہوں جس کے لئے زمین کا ایک ایسا گوشہ ہے جہاں میں طلب رزق کی خاطر آجا سکتا ہوں۔

(۶) (جہاں) بہت سے بادشاہ اور بھائی ہیں کہ اگر میں ان کے پاس چلا جاؤں گا تو ان کے مالوں کا مختار کل بنا لیا جاؤں گا اور مجھ سے بالکل اپنائیت کا سلوک کیا جائے گا۔

(۷) جس طرح آپ جب کسی ... نعمان کریں، اور وہ لوگ اس پر آپ کا شکریہ ادا کریں، تو میں یہ چاہوں کہ آپ انھیں ایسا کرنے میں گنہگار نہیں سمجھتے (اسی طرح سے میں نے بھی غستانیوں کی ان کی مہربانیوں اور حسن سلوک کی وجہ سے ان کا شکریہ ادا کیا ہے)

(۸) اس لئے آپ مجھے اپنی دھمکی کے ذریعہ لوگوں میں اس خارشی اونٹ کی طرح بنا کر نہ چھوڑیئے، جس پر تارکول مل دیا گیا ہو۔

(۹) کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ خدا نے آپ کو ایسی قوت اور جاہ و جلال دیا ہے کہ دوسرے بادشاہ اس کی وجہ سے آپ کے سامنے آتے ہچکچاتے ہیں۔

(۱۰) آپ کوئی ایسا بھائی نہ رکھ پائیں گے جسے اس کی لغزش پر آپ کو سرزنش کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ پورے مہذب لوگ کہاں ملتے ہیں۔

(۱۱) اس لئے اگر آپ نے میرے اوپر ظلم کیا ہے تو (درحقیقت) اپنے ایک غلام پر ظلم کیا ہے اور اگر آپ مجھ سے خوش ہیں تو آپ جیسی شخصیت ہی خوش رکھنے کے لائق ہے۔

موشحہ میں بھی اس کے چند اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ ایک شعر میں کتنی پتہ کی بات کہتا ہے۔

حسب الخليلين نأى الأرض بينهما   هذا عليها وهذا تحتها بالي

دو دوستوں کے لئے یہ بات (تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے) کافی ہے کہ ان دونوں کے درمیان زمین ہی دوری کا باعث بن جائے۔ (اس طرح کہ) ان میں سے ایک زمین کے اوپر (زندہ) اور دوسرا اس کے نیچے سڑگل رہا ہے۔

نابغہ کے بعض اشعار اتنے معنی خیز اور اچھوتے ہیں کہ ان کو بہت سے شعرا نے اپنایا ہے چنانچہ اس کا یہ مشہور شعر، جسے اس نے نعمان کی خفگی کی خبر ملنے پر کہا تھا۔

نُبئتُ أن أبا قابوس أوعدني   ولا قرار على زأر من الأسد

مجھے خبر دی گئی ہے کہ ابوقابوس نے مجھے دھمکی دی ہے، اور شیر کے دھاڑنے پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔

اس کو حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کی خفگی کے موقع پر پڑھا تھا۔

اسی طرح اس کے یہ دونوں اشعار جو اس نے متجردہ کے وصف میں کہے تھے۔

ولو أنها عرضت لأشمط راهب   عبد الإله صرورة المتعبد

لرنا لبهجتها وحسن حديثها   ولخاله رشداً وإن لم يرشد

یعنی اگر متجرّدہ ایک ادھیڑ عمر، غیر شادی شدہ راہب کے سامنے آجائے، جس نے اپنی ساری عمر اللہ کی عبادت میں گزار دی ہو تو وہ اس کے حُسن برق پاش کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہ جائے اور اس کی خوش گفتاری پر فریفتہ ہو جائے۔ اور اپنے اس عمل کو سب سے بڑی عقلمندی سمجھنے لگے۔ چاہے اسے یہ عقلمندی میسّر نہ آسکے

ربیعہ بن مقروم نے اس خیال کو لے کر یوں کہا ہے :۔

ولو أنها عرضت لأشمط راهب ۔۔۔ في رأس مشرفة الذرى يتبتل

لرنا لبهجتها وحسن حديثها ۔۔۔ ولهم من ناموسه يتنزل

اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت کے سراپا کھینچنے میں بھی اس نے وہ کمال فن دکھایا ہے جو کسی جاہلی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ اس قصیدہ کے بعض اشعار نابغہ کی غزل کے بھی بہترین نمونہ ہیں۔

نظرت بمقلة شادن متربب ۔۔۔ أحوى أحم المقلتين مقلد

صفراء كالسيراء اكمل خلقها ۔۔۔ كالغصن في غلوائه المتاود

قامت تراءى بين سجفي كلة ۔۔۔ كالشمس يوم طلوعها بالاسعد ۔

أو درة صدفية غواصها ۔۔۔ بهج متى يرها يهل ويسجد

أو دمية من مرمر مرفوعة ۔۔۔ بنيت بآجر يشاد وترمد

سقط النصيف ولم ترد إسقاطه ۔۔۔ فتناولته واتقتنا باليد

بمخضب رخص كأن بنانه ۔۔۔ عنم على أغصانه لم يعقد

لو أنها عرضت لأشمط راهب ۔۔۔ يخشى الإله صرورة المتعبد

لرنا لبهجتها وحسن حديثها ۔۔۔ ولخاله رشداً وإن لم يرشد

ترجمہ :۔

(۱) اس نے (متجردہ) ایسے سدھائے ہرن کی آنکھوں سے دیکھا جسکے ہونٹ سیاہی مائل سُرخ ہیں جس کی آنکھیں کالی کجراری ہیں اور جو گردن میں ہار پہنے ہے۔

(۲) اس کا رنگ سیرا (ایک ریشمی کپڑا جس میں پیلی دھاریاں ہوتی ہیں) کی طرح نظر افروز پیلا ہے، اور اپنی بناوٹ میں وہ ہر طرح سے مکمل ہے۔ اور (اس کا قد) لچکیلی اور تروتازہ اور نازک شاخ کی طرح ہے۔

(۳) جب وہ اپنا شفاف ریشمی دوپٹہ اوڑھے کھڑی ہوتی ہے تو اس کا مکھڑا ایسا دمکتا ہے

جیسے کہ سورج، جب کہ وہ منزل اسعد میں داخل ہو (اسعد وہ منزل ہے جس میں پہنچنے کے بعد سورج بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتا ہے)۔

(۴) یا وہ سیپی کا وہ موتی ہے کہ غوطہ خور جب اسے دیکھ لیتا ہے تو خوشی کے مارے اس کی چیخ نکل جاتی ہے اور وہ سربسجود ہو جاتا ہے۔

(۵) یا سنگ مرمر کا ایسا بلند مجسمہ ہے جس کی تخلیق میں اینٹ اور پکائی ہوئی چینی (زخرف) استعمال کی گئی ہے۔

(۶) (ایک دن) اس کے سر سے دوپٹہ سرک گیا، حالانکہ اس نے گرانے کا ارادہ نہیں کیا تھا (تو شرم کے مارے) اس نے ایک ہاتھ سے اسے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے ہم سے اپنے چہرہ کو اوٹ میں کر لیا۔

(۷) یہ ہاتھ مہندی رچا، بڑا نرم و نازک تھا۔ اور انگلیاں ایسی حسین اور سرخی لیے ہوئے گویا وہ عنم کا درخت ہے جس کی شاخیں گتھی نہیں تھیں ۔ (عنم ایک درخت کا نام ہے جس کے پھل سرخ ہوتے ہیں اور شاخیں بہت نرم اور لچکیلی)۔

(۸) اگر وہ ایک ادھیڑ عمر، غیر شادی شدہ، راہب کے سامنے آجائے، جس نے اپنی ساری عمر اللہ کی عبادت میں گزار دی ہو تو

(۹) وہ اس کے حسن برق پاش کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہ جائے، اور اس کی خوش گفتاری پر فریفتہ ہو جاتے اور اپنے اس عمل کو سب سے بڑی عقلمندی یا رشد و ہدایت تصور کرنے لگے، چاہے اسے یہ عقلمندی یا رشد و ہدایت میسر نہ آسکے۔

اس وصفیہ قصیدہ کے علاوہ غزل کے اشعار اس کے دوسرے قصیدوں میں بھی جا بجا ملتے ہیں۔ ان میں سب سے مثالی وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:-

غراءُ اکمل من یمشی علی قدم حسنا واُملح من حاورتہ الکلما

اعتذاریات کے علاوہ اس کے کلام کا بہترین نمونہ اس کے اس قصیدہ میں بھی ملتا ہے جس کی وجہ سے بعض نقادوں نے اسے اصحاب المعلقات کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔ اس کا مطلع ہے:-

عوجوا فحیوا لنعم دمنۃ الدار ماذا تحیون من نوی واُحجار[1]

ا- احمد الاسکندری وغیرہ نے المفصل ج ۱، ص ۸۲ میں اس کا والیہ قصیدہ جس کا مطلع ہے: اگلا صفحہ

اس معلقہ میں ساٹھ شعر ہیں اور اس میں مختلف مضامین سے بحث کی گئی ہے، جن میں سے اہم یہ ہیں۔

"شروع میں وہ اپنی محبوبہ نعم اور اس کے دیار کا ذکر کرتا ہے، پھر اس کے حسن وجمال کی تعریف کرتا ہے، پھر سیر وشکار کا ذکر کرتا ہے پھر اپنی قوم کی بہادری پر فخر کرنے کے ساتھ معلقہ ختم کرتا ہے۔"

بعض نقادوں نے اس کے اس قصیدہ کو جس کا مطلع ہے،

یادارمیۃ بالعلیاء فالسند　　أقوت وطال علیھا سالف الدھر

معلقہ کے زمرہ میں شامل کیا ہے مگر ثقہ تذکرہ نگاروں نے سب سے پہلے جس قصیدہ کا ذکر ہوا ہے اس کو معلقہ نابغہ شمار کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ الاغانی ــــــــ ابوالفرج الاصفہانی

۲۔ جمہرۃ اشعار العرب ــــــــ ابوزید القرشی۔

۳۔ طبقات فحول الشعراء ــــــــ ابن سلام الجمحی

۴۔ البیان والتبیین ــــــــ جاحظ ج ۱-۲-۳-۴۔

۵۔ شرح المعلقات السبع ــــــــ لابی عبداللہ الحسین الزوزنی۔

۶۔ المعلقات العشر واخبار قائلیھا ــــــــ امین الشنقیطی

۷۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ــــــــ جرجی زیدان/ج/۱

۸۔ تاریخ الادب العربی ــــــــ احمد حسن الزیات

۹۔ الوسیط فی الادب العربی وتاریخہ ــــــــ احمد الاسکندری

۱۰۔ المفصل فی تاریخ الادب العربی ــــــــ مصطفیٰ عنانی

۱۱۔ المنتخب من ادب العرب ــــــــ طٰہٰ حسین

۱۲۔ فی الادب الجاہلی ــــــــ طٰہٰ حسین

(باقی حاشیہ ص ۲۰۱) یا دارمیۃ بالعلیاء فالسند ۔ أقوت وطال علیھا سالف الابد کو اس کا معلقہ بتایا ہے۔ لیکن اصح وہی قصیدہ ہے جس کا ذکر ہم نے کیا ہے۔

۳۔ زُہَیر بن اَبی سُلمیٰ

(م ۶۱۵ء یا ۶۳۱ء، بعثتِ نبوی سے ایک سال قبل)

زہیر کا پورا نام زہیر بن ابی سُلمیٰ ربیعہ بن ریاح المزنی ہے۔[۱] یہ دورِ جاہلی کے ان تین ممتاز شعرا میں شمار کیا جاتا ہے جنھیں طبقۂ اوّل میں گنا جاتا ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ ہم طبقہ دونوں شعرا کے مقابلہ میں بڑا پاکباز اور پاک گفتار تھا۔ کلام میں اختصار پسندی، حکمت و فلسفہ کی گہرائی اور اپنے اشعار کو مستقل طور سے کانٹ چھانٹ، اصلاح و ترمیم اور نظرِ ثانی کر کے صرف عمدہ اور معیاری اشعار کو باقی رکھنے میں اپنے دونوں ساتھیوں یعنی امرؤ القیس اور نابغہ الذبیانی پر فوقیت رکھتا ہے۔

زُہَیر قبیلہ مُزَینہ سے تعلق رکھتا تھا جو قبیلہ مضر کی ایک شاخ تھا۔ زہیر اور اس کے ماں باپ اور اس کے خاندان کے لوگ نجد میں غَطَفان کے علاقے میں رہتے تھے۔

قبیلہ غطفان کا یہ علاقہ وہی سرزمین ہے جہاں عرب کے دو قبیلوں عبس اور ذبیان میں ایک مدت دراز تک وہ خونیں معرکے ہوتے رہے جنھیں تاریخ میں حرب داحس و غبراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[۲] ان جنگوں میں جہاں ایک طرف سیکڑوں لوگوں کی جانیں گئیں، بیشمار بچے یتیم اور متعدد عورتیں بیوہ ہوئیں، وہاں ان کی بدولت دورِ جاہلی میں شعر و ادب کے بہت سے نئے اصناف بھی پیدا ہوئے۔ چنانچہ شاعری کے نئے اصناف میں فخر، ہجو، حماسہ اور "ثأر" یعنی خون کا بدلہ لینے کا جذبہ، انھیں جنگوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ اسی طرح ان معرکوں اور ان سے متعلق قصوں اور

۱۔ پورا سلسلۂ نسب یوں ہے: ——— زہیر بن ابی سلمیٰ (و اسم ابی سلمیٰ ربیعہ) بن ریاح بن قرط بن الحارث بن مازن بن ثعلبہ بن ثور بن ہرمہ بن لاطم بن عثمان بن مزینہ۔ (سنِ وفات میں خاصا اختلاف ہے) (طبقات فحول الشعرا: ابن سلام الجمحی)

۲۔ حرب داحس و غبراء کے متعلق ص ۱۴۳ پر گذر چکا ہے۔

واقعات کو ایک حد تک منظوم کر کے محفوظ رکھنے کا طریقہ بھی اکثر انھیں لڑائیوں کی دین ہے۔ چنانچہ عنترہ بن شداد العبسی کے کلام میں اس جنگ کے آخری مرحلوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور سب سے بڑا فائدہ ان جنگوں کی ہولناکیوں کا یہ ہوا کہ پہلی دفعہ جزیرہ نمائے عرب میں صلح و آشتی اور امن وچین سے رہنے کی دعوت اور جنگ وجدال اور لڑائی جھگڑوں سے نفرت کرنے کا نعرہ اسی سرزمین سے بلند ہوا، اور یہ نعرہ لگانے والا ہمارا شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ تھا۔

زہیر کی نشو ونما قبیلہ غطفان کے اسی علاقہ میں ہوئی، لیکن ایسے گھرانے میں جس کے تمام افراد مرد اور عورت سب شاعر تھے چنانچہ اس کا باپ، اس کا خالو اس کی دو بہنیں سلمیٰ اور خنساء اور زہیر کے دونوں لڑکے کعب اور بجیر سب شاعر تھے۔ ان کے علاوہ اس کے باپ کا خالو بشامہ بن الغدیر بھی اپنے زمانے کا سب سے بڑا شاعر، فلسفی، دانا اور مالدار آدمی تھا۔ قبیلہ غطفان میں اس کی ذہانت، سمجھ بوجھ اور دوراندیشی کا ایسا شہرہ تھا کہ مشکل مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے لئے لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ اپنے معاملات میں اس سے مشورہ لیتے تھے اور اس کے کہنے کے مطابق چلتے تھے۔ اس کی عزت اور قدر ومنزلت کا یہ عالم تھا کہ مالِ غنیمت میں سے سب سے پہلے اس کا حصہ نکال کر رکھ دیتے تھے۔ زہیر نے اسی کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی۔ اور اس کے کلام اور اس کی حکمت وفلسفہ اور طرزِ فکر ونظر سے بہت متاثر ہوا۔ جس کی جھلک اس کے کلام میں بھی ملتی ہے۔ بشامہ کے علاوہ زہیر نے اپنے سوتیلے باپ اوس بن حجر سے بھی جو اپنے زمانہ میں مضر کا شاعر تھا استفادہ کیا۔ اور اس کے اشعار کی روایت کی۔ اور آخر میں اس سے بھی سبقت لے گیا۔ ظاہر ہے جس شخص کو ایسا شعری ماحول اور ایسے بلند پایہ شاعر میسّر آجائیں تو اس کے کلام میں سحر آفرینی کیسے نہیں پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ زہیر بن ابی سلمیٰ جاہلی عہد میں آسمان شعر وادب پر روشن ستارہ بن کر چمکا جس کی دعوت کی روشنی سے سارا جزیرہ عرب جگمگا اٹھا۔

زہیر بن ابی سلمیٰ نے عرب کے اس صحرائے بے آب وگیاہ میں سب سے پہلے صلح وآشتی، محبت اور میل جول کے لافانی نغمے اپنے اشعار میں گائے۔ عبس اور ذبیان کے قبیلے داحس وغبراء کی جنگ میں لڑ کر کٹے مرے جا رہے تھے۔ اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ چالیس سال تک کشت وخون ہونے کے بعد بھی اس کی ہولناکی کا سلسلہ ختم ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ قبیلہ ذبیان کے دو سرداروں ہرم بن سنان اور الحارث بن عوف کے دل میں رحم آیا اور انھوں نے کوشش کر کے آپس میں صلح کرائی۔ اور مقتولین کے خون بہا کے طور پر

اپنے پاس سے تین ہزار اونٹ دیئے اور اس طرح یہ منحوس لڑائی ختم ہوئی۔ اور دونوں قبیلوں کو چین سے سونا نصیب ہوا۔ زہیر بن ابی سلمٰی کے دل پر جو فطرتاً بہت صلح جو، نیک اور اخلاق فاضلہ کا مالک تھا، اس واقعہ کا بہت گہرا اثر ہوا اور ان دونوں سرداروں کی عزت و وقعت بہت بڑھ گئی چنانچہ اس نے ان دونوں کی شان میں ایک شاندار مدحیہ قصیدہ کہا جس میں دل کھول کر ان کے اس نیک کام کی تعریف کی، جنگ و جدال کی ہولناکی کے انجام سے ڈرایا۔ اور صلح و صفائی سے رہنے کی ترغیب دی۔ اور یہ سب اتنے حسین انداز، دلکش پیرایۂ بیان عبرت و موعظت کے موثر طریقہ پر کہ بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اس کا یہ مدحیہ قصیدہ وہ معلقہ ہے جس کا مشہور مطلع یہ ہے:۔

أمن أم أوفیٰ دمنة لم تکلم
بحومانه الدراج فالمتثلم

کیا اُمِ اوفیٰ (زہیر کی بیوی کا نام) کے رہنے کی جگہ کے یہ نشانات جو حومانہ الدراج و متثلم میں ہیں، بولتے نہیں۔ یعنی میرے سوالوں کے جوابات نہیں دیتے؟۔

اس معلقہ میں ۵۹ شعر ہیں اور اس کا موضوع جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہرم بن سنان و حارث بن عوف کے صلح و صفائی اور قربانی کے کارناموں کی تعریف ہے۔ اور اس کے ضمن میں میل محبت، صلح و آشتی سے رہنے کی تلقین ہے۔ پہلے شعر سے لے کر پندرہویں شعر تک اپنی بیوی اُم اوفیٰ سے جاہلی دور کے طریقے کے مطابق اظہار عشق ہے۔ اُم اوفیٰ سے کسی بات پر خفا ہو کر زہیر نے اسے طلاق دے دی تھی۔ لیکن جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو پھر اسے اپنے گھر بلانے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس کا اثر زہیر کے دل پر بہت ہوا۔ اور وہ اس کو اور اس کی نگری کو یاد کر کے رو دیا۔

ودار لها بالرقمتین کأنها   مراجع وشم فی نواشر معصم

یعنی اُم اوفیٰ کے مکانوں میں سے ایک مکان وہ بھی ہے جو دو سنگلاخ زمینوں کے درمیان واقع ہے، اور جس کے نشانات ہوا اور پانی سے دھل کر اس طرح نکھر گئے ہیں جیسے کہ کسی عورت کی کلائی کی رگوں پر گدنوں کو دوبارہ گو دکر نکھار دیا گیا ہو۔

شاعر اس جگہ بیس سال گزرنے کے بعد آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جگہ کے پہچاننے میں دشواری ہوتی ہے: ——— وقفت بها من بعد عشرین حجة
فلأیا عرفت الدار بعد توهم

اس کے بعد دستور کے مطابق ان جگہوں سے محبوبہ کے قافلہ کے کوچ کا نقشہ کھینچتا ہے۔

اور یہ بتاتا ہے کہ یہ بڑے سکون اور بے خوفی سے سفر کرتی ہیں، اور جب منزل پر اترتی ہیں اور پڑاؤ پڑتا ہے تب بھی اسی طرح اطمینان وسکون سے رہتی ہیں، جیسے کہ اپنے گھر میں ہوں۔ اس کے بعد ان کے حسن وجمال اور ان کی دل آویزی و دلداری کا نقشہ کھینچتا ہے۔

وفیھن ملھی للطیف ومنظر   أنیق لعین الناظر المتوسم

یعنی ان عورتوں میں باریک بین آدمی کے لئے دل بہلانے کے سامان اور انداز موجود ہیں، اور صاحب نظر اور پرکھ رکھنے والے آدمی کے لئے بہت جاذب نگاہ نظارہ ہے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جا ست   ع

تشبیب کے بعد حسب دستور گریز کرتا ہے اور اصل مطلب یا موضوع پر آتا ہے۔ چنانچہ سولہویں شعر سے لے کر ۲۵ ویں شعر تک ھرم اور الحارث کی تعریف کرتا ہے، اور صلح وصفائی کے لئے جو کوشش ان دونوں نے کی ہیں ان کو جی کھول کر سراہتا ہے، اور بہت ہی دلنشیں انداز سے کہتا ہے:۔

فاقسمت بالبیت الذی طاف حولہ   رجال بنوہ من قریش وجرھم

تو میں اس خانہ کعبہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ارد گرد قریش اور جرہم کے وہ لوگ طواف کرتے ہیں جنھوں نے اس کو بنایا ہے کہ

یمینا لنعم السیدان وجدتما   علی کل حال من سحیل ومبرم

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم دونوں روئے زمین پر سختی و نرمی دونوں حالتوں میں بہترین سردار ثابت ہوتے ہو۔ (یعنی مصیبت اور فارغ البالی)

اس کے بعد ان دونوں کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے:۔

تدارکتما عبسا وذبیان بعدما   تفانوا ودقوا بینھم عطر منشم

تم دونوں نے عبس اور ذبیان کو ان کے مرمٹنے اور منشم[1] کے عطر پر قسم کھانے کے بعد بچالیا۔

۱۔ عطر منشم: منشم کا عطر۔ یہ ایک عربی کہاوت ہے جو نحوست کے موقع پر بولی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے رائج ہونے کے بارے میں دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں ——— ایک تو یہ ہے کہ منشم ایک عطر فروش عورت تھی جس سے کچھ لوگوں نے عطر خرید کر اس میں ہاتھ ڈال کر یہ عہد کیا کہ یا تو دشمن کو زیر کر دیں گے یا لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔ چنانچہ یہ لوگ دشمن سے نبرد آزما ہوئے اور لڑائی میں سب کے سب مارے گئے۔ اس طرح

(باقی ص ۲۰۸ پر)

اس کے بعد اس صلح و صفائی سے اور خون بہا کے اونٹوں سے جو خیر و برکت اور مال و دولت کی فراوانی دونوں قبیلوں میں ہوئی اس کا ذکر کرتا ہے اور پھر ۲۹ ویں شعر سے ۳۲ ویں شعر تک سارے عرب کو مخاطب کر کے جنگ اور اس کی ہولناکی کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کے مہیب انجام سے ان کو ڈراتا ہے۔

وما الحرب إلا ما علمتم وذقتم ... وما هو عنها بالحديث المرجم

(سے فتغلل لكم تک)

تم لوگ جنگ کا مزہ چکھ کر خوب اچھی طرح اب اسے سمجھ چکے ہو۔ اب یہ تمہارے لئے کوئی انکل پچو بات نہیں رہ گئی ہے۔

اس لئے جب کبھی تم لوگ جنگ چھیڑو گے تو وہ بُری ہی ثابت ہوگی اور اگر تم لوگوں نے اسے بھڑکایا تو خوب زور و شور سے بھڑک اٹھے گی۔

پھر تمہیں اس طرح پیس کر رکھ دے گی جس طرح چکی کے پاٹ دانے کو پیس دیتے ہیں پھر یہ جنگ سال میں دو مرتبہ حاملہ ہوگی اور ہر دفعہ جڑواں بچے دے گی یعنی دن بدن اس کی شدت اور ہولناکی بڑھتی ہی جائے گی۔ اور احمر عاد کی طرح کا ہی منحوس بچے جنے گی (یعنی قدار بن سالف جیسے منحوس بچے، جس نے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ذبح کر دیا تھا، جس کی وجہ سے قوم ثمود پر سخت عذاب نازل ہوا۔) پھر انہیں دودھ پلائے گی، اور اس کے بعد ان کا دودھ چھڑائے گی، اور اس کے بعد اتنے کثیر قفیز و درہم و پیمانے غلہ پیدا کرے گی جتنا کہ عراق کے گاؤں بھی پیدا نہیں کر پاتے۔ یعنی یہ جنگ جتنا طول کھینچے گی اتنی ہی پریشانی مصیبت، ہولناکی اور تباہی بڑھے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسے ختم کر دو اور سب مل جل کر زندگی گزارو، ورنہ سب تباہ ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد حُصَین بن ضَمضَم اور اس کی نازیبا حرکتوں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

لعمري نعم الحي جر عليهم ... بما لا يواتيهم حصين بن ضمضم

(باقی منشم کا) یہ عطر نحوست میں ضرب المثل بن گیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ منشم ایک عطر فروش تھا جس سے مردوں پر لگانے کے لئے لوگ ایک خاص قسم کا مسالہ خریدا کرتے تھے اور اس طرح یہ نحوست میں ضرب المثل ہو گیا۔

(مجمع الامثال للمیدانی)

میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ قبیلہ ہی اچھا ہے جس پر حصین نے زیادتی کی تھی۔
اگرچہ اس قبیلے نے اس کی عہد شکنی اور دھوکہ دہی پر اس کی موافقت نہیں کی تھی!

اس کے بعد ۴۷ ویں شعر سے معلقہ کے آخر تک حکمت وفلسفہ کی باتیں کرتا ہے اور اپنی لمبی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ جس میں اپنی مثال دے کر بتاتا ہے کہ انسان جتنی لمبی زندگی پاتا ہے اتنا ہی اس زندگی سے اکتا جاتا ہے کہ دنیا کی زندگی بڑی تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔

سئمت تکالیف الحیاۃ ومن یعیش ثمانین حولاً لا أبا لك[۲] یسئم

میں زندگی کی تکلیفوں سے اکتا چکا ہوں، مایوس ہو گیا ہوں۔ اور جو شخص اسی سال تک زندہ رہے گا، تمھارے باپ کی جان کی قسم اس زندگی سے اکتا ہی جائے گا۔

اس کے بعد صبر و تحمل اور دوسروں کی لغزشوں اور غلطیوں کو معاف کرنے کی تلقین کرتا ہے پھر سخاوت کی طرف مائل کرتا ہے۔ نیکی کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ بتاتا ہے کہ موت برحق ہے، کسی کو بھی اس سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ خواہ وہ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائے۔ اس کے بعد اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ برا کام اور بری عادت چاہے کتنی ہی چھپائی جائے ایک نہ ایک دن ظاہر ہو کر رہے گی پھر ایک بڑے پتے کی بات بتاتا ہے کہ انسان درحقیقت نام ہے زبان اور دل کا۔ اگر یہی دونوں بگڑ جائیں تو پھر انسان نہیں بلکہ گوشت پوست کا صرف ایک جاندار شے رہ جائے گا۔ ان حکیمانہ باتوں کے بعد یہ معلقہ ختم ہو جاتا ہے۔

ومهما یکن عند امرئ من خلیقة وإن خالها تخفی علی الناس تعلم
وکائن تری من صامت لك معجب زیادته او نقصه فی التکلم

۱۔ قصہ کی تفصیل تاریخ ادب کی کتابوں میں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ورد بن حابس العبسی نے اس صلح سے پہلے ہرم بن ضمضم کو قتل کر دیا تھا۔ جب عبس اور ذبیان نے صلح کی تو حصین بن ضمضم کہیں چھپ گیا تاکہ وہ اس میں شریک نہ ہو اور ایک دن گھات لگا کر اس نے ایک عبسی کو قتل کر ڈالا جس سے دونوں قبیلوں میں پھر تلواریں نکل آئیں لیکن خون کے بدلے مال لینے پر معاملہ رفع دفع ہو گیا اس دھوکہ بازی کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے۔

۲۔ لا ابا لك — تیرا باپ نہ ہے۔ لیکن عرب اس کو بدعا کے طور پر نہیں سمجھتے تھے بلکہ قسم کے معنی میں اور کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے بولتے تھے۔

لسان الفتی نصف ونصف فؤادہ ۔۔۔ فلم یبق الا صورۃ اللحم والدم

یعنی اگر کسی شخص میں کوئی بُری عادت ہے، مگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کو اس کا علم نہیں تو یہ غلط ہے کیونکہ ایسی عادتیں لاکھ چھپائی جائیں، ایک نہ ایک دن کھل کر رہتی ہیں۔ اکثر لوگ جب تک چپ رہتے ہیں، بڑے بھلے مانس دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی حقیقت کا علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ بولتے ہیں۔ اس کو فارسی میں یوں کہا گیا ہے۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد ۔۔۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اس کے بعد اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ آدمی درحقیقت عبارت ہے دل اور زبان سے یعنی جس کا دل اچھا ہو اور زبان پاک گو ہو وہ درحقیقت انسان ہے۔ اگر یہ نہیں تو یہ محض گوشت پوست کا لوتھڑا ہے۔ اس کے بعد ایک دوسری حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اگر بوڑھے آدمی میں بُری عادتیں پیدا ہو جائیں تو وہ کبھی نہیں جا سکتیں، مگر جوان آدمی چاہے تو اپنی بُری عادت چھوڑ سکتا ہے۔

اس کے بعد آخری شعر میں اپنے ممدوح ہرم بن سنان کی داد و دہش کا ذکر کر کے معلقہ کو ختم کر دیتا ہے۔

زہیر بن ابی سلمیٰ کو اپنے ممدوح ہرم بن سنان سے اس کی سخاوت، صلح جوئی اور اخلاقِ فاضلہ کی وجہ سے بہت تعلق تھا۔ چنانچہ اپنے اکثر قصیدوں میں اس کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ ہرم کو بھی زہیر سے بڑا لگاؤ اور تعلقِ خاطر تھا۔ چنانچہ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ "جب بھی زہیر اس کی تعریف کرے گا، اس سے سوال کرے گا یا اس کو سلام کرے گا، وہ اسے ایک غلام یا ایک لونڈی یا ایک گھوڑا ضرور دے گا۔" ادھر زہیر اس کی داد و دہش سے اتنا گراں بار ہو چکا تھا کہ اس کی غیور طبیعت اب مزید احسان اٹھانے پر تیار نہیں تھی۔ چنانچہ جب وہ ہرم بن سنان کو کسی مجمع میں دیکھتا تو یوں سلام کرتا کہ "تم سب کی صبح بخیر ہو، سوائے ہرم کے۔ اور تم میں سے سب سے بہتر آدمی کو میں نے مستثنیٰ کیا ہے۔" انعموا صباحًا غیر هرم وخیرکم استثنیتُ:

ہرم بن سنان کی مدح میں جو قصیدے زہیر نے کہے ہیں، ان میں سب سے اچھا معنی خیز، اور زہیر کے قدرت کلام، جدت طرازی کا بہترین نمونہ ذیل کے اشعار ہیں۔

وأبیض فیاض یداہ غمامۃ ۔۔۔ علی معتفیہ ما تغب فواضلہ

أخی ثقۃ لا یہلک الخمر مالہ ۔۔۔ ولکنہ قد یہلک المال نائلہ

تراہ إذا ما جئتہ متہللا ۔۔۔ کأنک تعطیہ الذی أنت سائلہ

ہرم بن سنان عیوب سے پاک وصاف اور بڑا سخی داتا ہے۔ اس کے ہاتھ اس سے مدد
مانگنے والے کے لئے مثل اس بادل کے ہیں جو نافہ نہیں کرتے، بلکہ مستقل برستے رہتے ہیں۔ وہ
قابلِ بھروسہ شخص ہے۔ شراب اس کے مال کو ختم نہیں کر پاتی۔ البتہ اس کی سخاوت
اسے ختم کر سکتی ہے۔

اس کے بعد اس کی سخاوت کے بارے میں ایسی نادر بات کہتا ہے، جو شاید اس سے پہلے کبھی کسی شاعر نے نہیں کہی۔ کہتا ہے:۔

جب تم اس کے پاس مانگنے کے لئے آؤ، تو وہ اتنا خوش ہوتا ہے اور اس کی باچھیں اس قدر
کھل جاتی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم جو مانگ رہے ہو، درحقیقت مانگ نہیں رہے ہو
بلکہ تم خود اس کو دے رہے ہو۔

زہیر کے ان مدحیہ قصائد نے ہرم بن سنان کی سخاوت، مروت، صلح وصفائی اور اعلیٰ اخلاق کی سارے عرب میں دھوم مچا دی تھی۔ اور اس کے ان کارناموں کو ہمیشہ کے لئے زندہ و درخشندہ کر دیا۔

کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہرم بن سنان کے کسی لڑکے سے کہا کہ زہیر نے تمہارے باپ کی تعریف میں جو اشعار کہے ہیں ان میں سے چند مجھے بھی سناؤ۔ چنانچہ لڑکے نے آپ کو چند شعر سنائے۔ آپ نے فرمایا کہ "وہ واقعی تم لوگوں کے بارے میں بہت اچھے شعر کہتا تھا۔" اس پر لڑکے نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم ہم لوگ بھی تو خوب دل کھول کر داد و دہش کرتے تھے۔" حضرت عمر نے کہا کہ ہاں، مگر جو کچھ تم نے اس کو دیا تھا وہ تو اب ختم ہو چکا۔ مگر اس نے جو کچھ تم کو دیا ہے وہ اب تک باقی ہے۔" اسی طرح ایک دفعہ آپ نے زہیر کے لڑکے سے کہا کہ تمہارے باپ کو ہرم نے جو خلعتیں پہنائی تھیں ان کا کیا حشر ہوا؟" لڑکے نے جواب دیا۔" امیر المومنین، انھیں تو زمانہ نے خستہ کر دیا۔" آپ بولے کہ "لیکن تمہارے باپ نے ہرم بن سنان کو جو جوڑے پہناتے تھے، انھیں زمانہ پرانا اور خستہ نہ کر سکا۔" ہرم بن سنان کے مرنے پر زہیر نے اس کا زوردار مرثیہ بھی لکھا تھا۔

زہیر جاہلی شعرا میں پہلا شاعر ہے جو اپنے کلام کو معیار کے مطابق نوک پلک سے درست رکھنے، الفاظ و معانی کے اعتبار سے بھرپور، اثر آفرینی اور دلکشی میں معیاری رکھنے کی طرف بڑی توجہ دیتا تھا۔ اسی لئے قصیدہ کہنے کے بعد فوراً اسے مشتہر نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کا معمول تھا کہ اپنے لمبے قصیدے چار مہینے میں کہتا، اور ان کی اصلاح و ترمیم چار مہینے تک کرتا،

پھر چار مہینے تک انھیں اپنے خاص دوستوں اور شاگردوں کو سناتا رہتا۔ اس کے بعد انھیں عوام میں مشہور کرنے کی اجازت دیتا۔ اسی لئے زہیر کے ان قصیدوں کو "حولیات" یعنی جن پر ایک سال گزر چکا ہو، کہتے ہیں۔

اس قسم کے لمبے قصیدے اس کے چار ہیں، جن کے مطلعے ہیں :۔

۱۔ قِفْ بالدیارِ التی لم یعفها القِدَمُ	بَلیٰ وغیّرَ ها الأرواح والدِّیَمُ
۲۔ إنّ الخلیط اجدّ البین فانفرقا	وعلق القلب من أسماءَ ما علقا
۳۔ بان الخلیطُ ولم یأوُوا لمن ترکوا	وزوّدوك اشتیاقا ایّةً سلکوا
۴ لمن طلَلٌ برامةَ لا یریم	عفا وخلاله حُقبٌ قدیمُ

کلام کی امتیازی خصوصیات

جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ زہیر باتفاق رائے جاہلی شعرا کے طبقہ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض علما اور نقادوں نے اسے اپنے دونوں ہم طبقہ شاعروں یعنی امرؤ القیس اور نابغہ الذبیانی پر بھی فوقیت دی ہے اور اس ترجیح کی دلیل یہ ہے کہ زہیر کے کلام میں مندرجہ ذیل امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو مذکورہ دونوں شاعروں میں نہیں پائی جاتی۔

زہیر کا کلام دور از کار اور فضول باتوں سے پاک ہے۔ اور حسن ایجاز کا مرقع ہے۔ وہ اس خوبصورتی سے شعر کہتا ہے کہ تھوڑے سے الفاظ سے بہت سے معانی اور مطالب پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے اس کا یہ شعر :۔

فما یكُ من خیرٍ أتوه فانما　　توارثه آباءُ آبائهم قبلُ

یہ لوگ جو بھلائیاں اور اچھے کام کرتے ہیں، درحقیقت انھیں ان کے آباء اجداد کے آباء و اجداد نے ورثہ میں پایا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ خاندانی شریف لوگ ہیں اور بھلائی کرنا ان کے پرکھوں سے انھیں ورثہ میں ملا ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے احنف بن قیس سے پوچھا کہ شاعروں میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ زہیر۔ معاویہ نے کہا۔ وہ کیسے۔ تو بولے کہ اس نے مدح میں سے فضول اور بیکار باتوں کو نکال دیا ہے۔ معاویہ نے کہا مثلاً؟ تو احنف نے مذکورہ بالا شعر مثال میں پیش کیا۔

دوسرے یہ کہ اس کے مدحیہ قصائد بہت معیاری اور جھوٹ سے پاک وصاف ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی کی تعریف کرتا ہے تو اس کے سچے اور حقیقی اوصاف کو گنا تا ہے۔ جھوٹے اوصاف یا جھوٹے اخلاق کی تعریف نہیں کرتا ہے۔ جیسے۔

علیٰ مکثریھم رزق من یعتریھم وعند المقلین السماحۃ والبذل

یعنی ان میں جو لوگ مالدار ہیں ان کے ذمہ ان کے ناداروں کا رزق ہوتا ہے اور جو لوگ کم استطاعت والے ہوتے ہیں ان کے ساتھ فیاضی اور سخاوت کا برتاؤ کرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ تعقید لفظی ومعنوی سے حتی الامکان پرہیز کرتا ہے۔ کلام میں نامانوس اور بھدّے بھونڈے الفاظ نہیں استعمال کرتا۔ معانی ومطالب کو بیان کرنے سے پہلے ان پر غور کرتا ہے اور ان کے لئے مناسب اور چیدہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جیسے:

لو أن حمدا یخلد الناس أخلدوا

ولکن حمد الناس لیس بمخلد

یعنی اگر تعریف سے لوگوں کو بقائے دوام حاصل ہو سکتا تو یہ لوگ ضرور بقائے دوام حاصل کر لیتے لیکن لوگوں کی تعریف کسی کو بقائے دوام نہیں بخش سکتی۔

حضرت بن عباس سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے کہا کہ کیا تم شاعروں کے شاعر کے کلام کی روایت کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ وہ کون؟ تو بولے کہ وہ جو کہتا ہے ۔ ولو ان حمدا ـــــــ الخ۔ یہ میں نے کہا کہ وہ تو زہیر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، وہی شاعروں کا شاعر ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ تو فرمایا کہ چونکہ وہ کلام میں تعقید نہیں کرتا تھا اور نہ ایک مفہوم کو دوسرے میں گڈمڈ کرتا تھا۔ اور اس کے علاوہ نامانوس اور بھدّے الفاظ سے پرہیز کرتا تھا۔ اور آدمی کی سچی اور صحیح تعریف کرتا تھا[1]۔ عکرمہ بن جریر نے کہا ہے کہ ایک دن میں نے اپنے والد (جریر) سے پوچھا کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ دورِ جاہلیت میں یا اسلامی عہد میں؟ میں نے کہا کہ دورِ جاہلیت میں۔ تو بولے کہ زہیر سب سے ممتاز شاعر ہے۔

چوتھے یہ کہ اس کے کلام میں گندے، گھٹیا اور معیار سے گرے ہوئے الفاظ بہت کم ملتے ہیں۔

---

(۱) العمدۃ اور البیان والتبیین ۱/۱۳۵ میں آیا ہے کہ حضرت عمر زہیر کو اس شعر کی وجہ سے شعرا کے قاضی کا خطاب دیا تھا۔ فإن الحق مقطعہ ثلاث یمین أو نفار أو جلاءُ

جس کی وجہ سے اس کے کلام میں عفت اور تقدس کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کی۔ البتہ ایک مرتبہ ایک قبیلہ کی ہجو کی اور جب ان کو اس سے شدید تکلیف پہنچی تو اس پر اسے سخت ندامت ہوئی۔

اس کے کلام میں حکمت و فلسفہ اور ضرب الامثال کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ جو کسی دوسرے جاہلی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عربی شاعری میں ضرب الامثال اور حکمت و فلسفہ کی آمیزش کی داغ بیل اسی نے ڈالی ہے۔ عہد عباسی کے ممتاز شعراء صالح بن عبد القدوس، ابو العتاہیہ، ابو تمام، المتنبی اور المعری نے اس نہج کو اس کی تقلید میں اپنایا ہے۔

رأیت المنایا خبط عشواء من تصب	تمته ومن تخطئ یعمر فیهرم
رَأیتُ المنایا خبطَ عشواءَ مَن تُصِب	تُمِتهُ ومن تُخطِئ یُعَمَّر فیَهرَمِ
ومن یجعل المعروف من دون عرضهِ	یفرهُ، ومن لا یتق الشتمَ یُشتمِ
ومن یکُ ذا فضلٍ فیبخل بفضلهِ	علی قومهِ، یُستغنَ عنه ویذمَمِ
ومن هابَ أسبابَ المنایا ینلنه	وإن یرقَ أسبابَ السماءِ بسُلّمِ
ومن یوفِ لا یُذمَم، ومن یهدِ قلبه	إلی مطمئنِ البر، لا یتجمجمِ
ومن یجعل المعروفَ فی غیرِ أهلهِ	یکن حمده ذمًا علیهِ ویندمِ

ترجمہ۔ میں نے موتوں کو اندھی اونٹنیوں کی طرح سے ٹاپک ٹوئیاں مارتے دیکھا کہ جو شخص ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو وہ ختم کر دیتی ہیں اور جس پر ان کا داؤں نہ چل سکا تو وہ بہت دنوں تک جیتا رہتا ہے پھر بوڑھا ہوتا ہے۔

۲۔ جو شخص بھلائی کو اپنی عزت کے لئے ڈھال لیتا ہے تو اسے وہ بڑھا لیتا ہے اور جو شخص گالی سے نہیں بچتا اسے گالی دی جاتی ہے۔

۳۔ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہوتا ہے پھر وہ اپنی قوم سے بخل کرتا ہے تو اس سے بے پرواہی برتی جاتی ہے اور اس کی برائی کی جاتی ہے۔

۴۔ جو شخص موتوں کے راستوں سے ڈرتا ہے تو موتیں اسے پا ضرور لیتی ہیں، چاہے وہ سیڑھی لگا کر آسمان کی بلندیوں پر کیوں نہ چڑھ جائے۔

۵۔ جو شخص ایفائے عہد و پیمان کرتا ہے اس کی برائی نہیں کی جاتی اور جس کے دل کو بھلائی کرنے کی ہدایت مل جائے۔ (یعنی دل سے بھلائی کا خیال کرتا ہے) تو وہ

پس وپیش نہیں کرتا۔

۶- (مگر) جو شخص نااہلوں کے ساتھ بھلائی کرتا ہے تو بجائے شکریہ کے اسے بُرائی ملتی ہے اور آخر میں اسے شرمندگی اُٹھانی پڑتی ہے۔

عصر جاہلی میں یوں تو بعض دوسرے شعرا نے بھی حکمت وفلسفہ اور عقلمندی کی باتیں کہی ہیں لیکن زہیر اس صنف میں اس وجہ سے منفرد ہے کہ اس نے بعض ایسے حقائق کا اظہار کیا ہے جو عام طور سے جاہلی شعراء کے یہاں ناپید ہیں۔ مثلاً جنگ کی تباہ کاریاں، اخلاق فاضلہ اور اقدار عالیہ کی تعریف وتوصیف، یا موت وزندگی کی حقیقت، انسان کا حال اوران سب سے بڑھ کر اس حقیقت کا اظہار کہ اس کارگہہ ہستی کو چلانے والی ایک ذات ہے جو دل کی باتوں کو بھی، چاہے لاکھ انھیں چھپانا چاہیں، جانتی ہے۔ اور یہ کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اسے ایک کتاب میں (نامہ اعمال) لکھ دیا جاتا ہے۔ اور قیامت کے دن آدمی کے سامنے اسے پیش کر کے ان پر اسے سزا دی جائے گی۔ یا اس کا بدلہ جلد ہی اس دنیا میں دے دیا جائے گا۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ زہیر اللہ پر بھی ایمان رکھتا تھا۔

فلا تکتمن اللہ ما فی نفوسکم　　لیخفیٰ ومھما یکتم اللہ یعلم

یؤخر فیوضع فی کتاب فیدخر　　لیوم حساب أو یعجل فینقم

اپنے ایک قصیدے میں اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ خدا کا وجود حق ہے۔ اور کہتا ہے کہ جب مجھے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوا تو اللہ کے ڈر نے مجھے اس حقیقت سے اور قریب کر دیا۔ مجھے اس بات کا بھی عرفان حاصل ہوا کہ گزری ہوئی چیز کو نہ میں واپس لاسکتا ہوں اور نہ جو آئندہ آنے والی ہے اسے اس کے وقت مقررہ سے پہلے حاصل کرسکتا ہوں اور یہ کہ موت کے چنگل سے میری جان نہیں بچ سکتی۔ چاہے اس کے بدلے میں، میں اپنا قیمتی مال دے دوں۔

بدا لی أن اللہ حق فزادنی　　إلی الحق تقوی اللہ ما کان بادیا

بدا لی أنی لست مدرک ما مضیٰ　　ولا سابق شیئاً إذا کان جائیا

وما إن أری نفسی تقیھا منیتی　　وما إن تقی نفسی کرائم مالیا

اس قصیدہ میں ایک بہت پتے کی بات کہتا ہے۔

ألا لیت شعری، ھل یری الناس ما أری　　من الأمر أو یبدو لھم ما بدا لیا

بدالی انّ الناس تغنی نفوسهم ... وأموالهم ولا أری الدھر فانیا

ترجمہ:۔
کاش میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، لوگ بھی دیکھ لیتے اور جس حقیقت کا انکشاف میرے اوپر ہوا ہے، اُن کے اوپر بھی ہو جاتا۔ میرے اوپر یہ راز منکشف ہوا کہ لوگ اور ان کا مال و متاع سب ایک دن فنا ہو جاتے گا۔ مگر زمانہ کو کبھی فنا نہیں۔ التدلیس، باقی ہوس۔

کہتے ہیں کہ زہیر نے ایک سو سال سے بھی زیادہ عمر پائی۔ دلیل میں اس کا اپنا یہ شعر نقل کرتے ہیں:۔ ——— بدا لی انی عشت تسعین حجۃ

تباغا دعشرا عشتہا وثمانیا

اس سے ایک سو آٹھ سال عمر بنتی ہے۔ ہجرت نبوی سے ۱۱ سال پہلے وفات ہوئی۔ اس کے دونوں لڑکے کعب اور بجیر مسلمان ہوئے۔ ان کا تذکرہ مناسب موقع پر آئے گا۔

زہیر کا دیوان مع شرح ثعلب، م ۲۹۱، دار الکتب المصریہ نے شائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ شعرائے جاہلی کے متعدد مجموعوں میں بھی اس کا دیوان چھپ چکا ہے۔

حوالہ جات:۔

۱۔ الاغانی — لابی الفرج الاصفہانی
۲۔ طبقات فحول الشعراء — لابن سلام الجمحی
۳۔ جمہرۃ اشعار العرب — لابی زید القرشی
۴۔ معاہد التنصیص — للعباسی
۵۔ شعراء النصرانیہ — للویس شیخو الیسوعی
۶۔ کتاب الشعر والشعراء — لابن قتیبہ
۷۔ فی الادب الجاہلی — لطٰہٰ حسین
۸۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ — لجرجی زیدان، الاوّل
۹۔ تاریخ الادب العربی — احمد حسن الزیات
۱۰۔ الوسیط — احمد الاسکندری
۱۱۔ المفصّل؛ — احمد الاسکندری وغیرہ
۱۲۔ العمدۃ فی صناعۃ الشعر ونقدہ لابن رشیق القیروانی
اور معلقات کی شروح

۴۔ عَنْتَرَۃُ بن شَدّادِ العَبسی

م ۶۱۵ء

عنترہ نام، کنیت ابوالمغلّس تھی۔ وہ قبیلہ عبس کے ایک شخص شداد العبسی کا لونڈی زادہ تھا[1]۔ اس کی ماں کا نام "زبیبہ" تھا۔ یہ ایک حبشی لونڈی تھی۔ جسے شداد نے اپنی کسی جنگ میں گرفتار کرکے لونڈی بنایا تھا، اور بعد میں اس کے پیٹ سے عنترہ پیدا ہوا۔ عربوں کا قاعدہ تھا کہ لونڈی کے پیٹ سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اسے بھی غلام بنا لیتے تھے۔ اور اس سے بھی وہی کام لیتے اور وہی سلوک کرتے جو غلاموں کے ساتھ ان دنوں میں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس رواج کے مطابق عنترہ بھی اپنے باپ کے خاندان میں اچھوت کی طرح رہتا تھا۔ غلاموں کے دوسرے کاموں کے علاوہ اس کے ذمہ سب سے بڑا کام اونٹوں اور گھوڑوں کی گلہ بانی کرنا تھا۔ چنانچہ عنترہ دن بھر اپنے باپ کے جانور چراتا اور شام کو انھیں ان کے باڑے میں کرکے دودھ وغیرہ دوہتا، اور ان کی رکھوالی کرتا۔ عنترہ کی رگوں میں بھی چونکہ خالص عربی خون دوڑ رہا تھا، اس لئے اسے یہ برتاؤ اور اپنی حیثیت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ مگر رواج اور قانون سے مجبور تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو کبھی دیگر غلاموں کی طرح گرنے نہیں دیا۔ اور نہ وہ غلامانہ ذہنیت پیدا ہونے دی جو عام طور سے ایسے حالات میں پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس نے اپنی عزتِ نفس، خودداری و خود نگری کو قائم رکھا اور دوسرے غلاموں کے برخلاف شہسواری اور فنونِ جنگ میں بڑی مہارت پیدا کی۔ یہاں تک کہ قبیلہ میں شہسوار، اولوالعزم اور باہمت نوجوان کی طرح اس کی شہرت ہو گئی۔ انھیں دنوں قبیلہ

۱۔ پورا سلسلۂ نسب یہ ہے : ــــــــــ عنترہ بن شداد بن معاویہ بن قراد بن مخزوم بن مالک بن غالب بن قطیعہ بن عبس ــــــــــ

طے کے بعض لوگوں نے عبس پر حملہ بول دیا، اور ان کے اونٹ و گھوڑے لے بھاگے۔ بنو عبس نے ان کا مقابلہ کیا، لیکن پیش نہ پا سکے۔ مجبوراً عنترہ کے باپ نے عنترہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ "کر یا عنترۃ" یعنی عنترہ تم حملہ کرو۔ مگر عنترہ بولا کہ "العبد لا یحسن الکر، و انما یحسن الحلاب والصر" یعنی غلام حملہ کرنا کیا جانے، اسے تو صرف دودھ دوہنے اور اونٹنیوں کے تھنوں کو پینو سانے کا کام آتا ہے۔ اس چبھتے جملہ کو باپ سمجھ گیا۔ اس نے کہا کہ "کر و انت حر" اچھا حملہ کرو تم آزاد ہو۔ عنترہ یہ سنتے ہی دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، اور اس بہادری اور بے جگری سے لڑا کہ دشمنوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور وہ اونٹ اور گھوڑے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، اور عنترہ اپنے جانور ان سے واپس لے آیا۔ اس کے اس کارنامے کے بعد اس کے باپ نے اسے اپنے نسب میں شامل کر لیا۔ اب عنترہ عام عبسیوں کے برابر ہو گیا۔ اور قبائل عرب میں عبس کے شہسوار اور سردار کی حیثیت سے اس کی شہرت پھیل گئی۔ عنترہ، شداد کے نسب میں داخل ہو جانے کے بعد قبیلہ عبس کے تمام معرکوں میں اور خاص طور سے داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں برابر شریک رہا۔ اور اپنی بہادری، بے خوفی اور فن سپہ گری میں مہارت کی بدولت سارے قبیلہ کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ اور لوگ اس کی بڑی عزت کرتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسے عزت و ناموس کا محافظ، جان و مال کا بچانے والا، شریف اور غیور سردار سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ عنترہ اپنے کارناموں کی بدولت بہادری اور شجاعت میں سارے عرب میں ضرب المثل بن گیا۔

عنترہ نے بڑی لمبی عمر پائی، بڑھاپے کی وجہ سے بہت ضعیف و لاغر ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں آخر میں اتنا دم نہیں رہا تھا کہ جنگ میں ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ قبیلہ طے پر ایک حملہ کے دوران گرفتار ہو گیا اور بعثت نبوی سے پہلے ہی ۶۱۵ء میں قتل کر دیا گیا۔

عنترہ اپنی ماں کی طرح کالا تھا۔ اس لئے اسے "أغربة العرب" یعنی عربوں کے کوؤں میں شمار کیا جاتا تھا[1] اسے بھی اپنے اس عیب کا شدید احساس تھا۔ اور اسی عار کو دھونے کے لئے اس نے فن سپہ گری اور شجاعت و بہادری میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ چنانچہ اس نے خود کہا ہے کہ:۔

۱۔ زمانۂ جاہلیت میں چار عرب کوّے ہوئے ہیں ـــــ عنترہ ـــــ خفاف بن ندبہ ـــــ ابو عمیر بن الحباب ـــــ اور سلیک بن السلکہ جو صعالیک العرب یعنی خانماں برباد نوجوانوں میں شمار ہوتا تھا

إني امرؤ من خير عبس منصبا ۔۔۔ شطري وأحمي سائري بالمنصل
وإذا الكتيبة أحجمت وتلاحظت ۔۔۔ ألفيت خيراً من معمّ مخول

اپنے نسب میں ایک طرف سے میں عبس کے بہترین افراد میں سے ہوں، اور اپنے پورے جسم کو میں تیز تلواروں کے ذریعہ بچاتا ہوں، اور جب فوج حملہ کرنے میں آنا کانی کرنے لگتی ہے تو میں نجیب الطرفین لوگوں سے بھی بہتر ثابت ہوتا ہوں۔

بہادری، اولوالعزمی اور فنون سپہ گری میں مہارت پیدا کر کے سارے عبسی نوجوانوں میں امتیاز حاصل کرنے کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اسے نوجوانی میں اپنی چچا زاد بہن "عبلہ" سے محبت ہو گئی تھی، اس نے بڑی کوشش کی کہ اس سے اس کی شادی ہو جائے لیکن چچا نے صرف اس وجہ سے یہ رشتہ نامنظور کر دیا کہ وہ غلام تھا۔ اس ناکامی کا ردّ عمل اس پر یہ ہوا کہ ایک طرف تو اس نے ان فضائل اور اوصاف کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دی، تو دوسری طرف اس ناکامی نے اس کے جذبات شاعری کو برانگیختہ کر دیا۔ چنانچہ دونوں میدانوں میں اس نے وہ نام اور کمال پیدا کیا کہ اپنے زمانے میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا ۔ آخر میں جب اس کے باپ نے اس کو آزاد کر کے اپنے نسب میں شامل کر لیا تو عبلہ سے اس کی شادی ہو گئی۔

امتیازی خصوصیات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنترہ جب تک غلام رہا، اس کی طبیعت بھی بجھی بجھی اور جذباتِ شاعری خفتہ سے رہے، کیونکہ اس زمانے میں سوائے دو ایک شعر کے کوئی قابلِ ذکر قصیدہ یا غزل کا ذکر نہیں ملتا، البتہ جب وہ آزاد ہو گیا اور جنگ و جدل میں اس کی بہادری اور شجاعت کے جوہر کھلے تو اس کے جذبات شاعری بھی بھڑک اٹھے۔ اس کی یادگار اس کا وہ معلقہ ہے، جو ادب عربی میں فخر و حماسہ میں اپنی مثال آپ ہے۔

اس معلقہ کے کہنے کا سبب یہ ہوا کہ قبیلہ عبس کے ایک شخص نے اس کو اس کے کالے رنگ اور اس کی حبشی نژاد ماں کا طعنہ دیا اور بڑی بُری گالی دی۔ اس پر عنترہ نے کہا کہ تم ہمارے میرا کیا مقابلہ کر سکتے ہو، میں تو جنگوں میں بے دھڑک کود پڑتا ہوں، مالِ غنیمت پورا پورا بانٹتا ہوں، اور دستِ سوال دراز کرنے سے پرہیز کرتا ہوں، لیکن اپنے مال میں سے بے دریغ سخاوت کرتا ہوں۔ عبسی نے کہا لیکن شعر تجھ سے اچھے میں کہہ لیتا ہوں۔ اس پر عنترہ نے کہا کہ اچھا تم کو یہ بعد

میں معلوم ہوگا کہ کون اچھے شعر کہتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے اپنا یہ مشہور معلقہ کہا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے سونے کے پانی سے لکھا گیا۔ اس کا مطلع ہے:

هل غادر الشعراء من متردم ... ام هل عرفت الدار بعد توهم[1]

اس معلقہ میں اس نے اپنی زبان دانی، شجاعت و بہادری اور اخلاقِ فاضلہ پر فخر کرنے کے علاوہ اپنی قوم کے کارناموں کو گنایا ہے اور ضمناً اس کی مدافعت میں جو کارہائے نمایاں اس نے انجام دیئے تھے، ان کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ اپنی سخاوت اور دریا دلی کا بھی اظہار کیا ہے۔ اس کا یہ معلقہ تمام معلقات میں سہل ترین الفاظ اور حسین ترین پیرایہ بیان اور بہترین وصف اور شاندار فخر و حماسہ کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

مطلع کے بعد اپنی محبوبہ عبلہ کی نگری سے جاہلی شعرا کے دستور کے مطابق خطاب کرتا ہے اور اس کو سلام کرنے کے بعد بقائے دوام کی دعا دیتا ہے۔ اور پھر اپنی محبوبہ کی آنکھ، اس کی مسکراہٹ اور ہونٹوں کی تعریف کرنے کے بعد اپنی شدید محبت، سوزِ دروں اور پھر عالمِ یاس کی بہترین تصویر کھینچتا ہے۔

يا دار عبلة بالجواء تكلمي ... وعمي صباحا دار عبلة واسلمي
دار لآنسة غضيض طرفها ... طوع العنان لذيذة المتبسم
حييت من طلل تقادم عهده ... أقوى واقفر بعد ام الهيثم
حلت بأرض الزائرين فأصبحت ... عسرا علي طلابك ابنة مخرم

یہاں تک کہ کہتا ہے:

ولقد نزلت فلا تظني غيره ... مني بمنزلة المحب المكرم

اس کے بعد اپنی محبوبہ کے ہونٹوں کی خوبصورتی اور مشامِ جان کو معطر کر دینے والے لعاب دہن کا ذکر کرتا ہے اور اس کی مثال "فارة التاجر" یعنی نافۂ مشک سے دیتا ہے اور یہ تصور دیتا ہے کہ جب تم اپنا منہ ایسے حسین ہونٹوں کو پیار کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھاؤ گے، تو ہونٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی خوشبو کی ایک لپٹ محبوبہ کے منہ سے نکل کر تم کو سرمست و بے خود کر دے گی۔ پھر اس خوشبو کو اس سرسبز و شاداب باغ کی خوشبو سے تشبیہ دیتا ہے جو بارشوں سے سیراب

1۔ ترجمہ معلقات میں ملاحظہ فرمایئے۔

ہوا ہے۔ اور جس میں چوپایوں وغیرہ نے پہنچ کر اس کی ہوا کو گندہ اور ملوث نہیں کیا ہے جس میں بکمیاں ایک طرف چین وسکون سے خوشی کے نغمے اس سرمست شرابی کی طرح الاپتی رہتی ہے جو مستی و ترنگ میں گنگنا پڑتا ہے۔

وكأن فارة تاجر بقسيمة	سبقت عوارضها إليك من الفم
أو روضة أنفا تضمن نبتها	غيث قليل الدمن ليس بمعلم

اس کے بعد محبوبہ کے کوچ کرنے، اس کی ناقہ اور اس کی چال ڈھال اور قافلہ اور اس کی کیفیت کا مفصل ذکر کرتا ہے۔ پھر اپنی محبوبہ کو اپنے صفات گنا کر اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ میرا رنگ کالا ہے، میری ماں حبشی لونڈی ہے تو کیا ہوا۔ میرے اوصاف اور میرے کارنامے کسی نجیب الطرفین شریف زادے سے تو کم نہیں۔

إن تغدفي دوني القناع فإنني	طب بأخذ الفارس المستلئم
أثني علي بما علمت فإنني	سمح مخالقتي إذا لم أظلم
فإذا ظلمت فإن ظلمي باسل	مر مذاقته كطعم العلقم

یعنی تو مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہے۔ میں تو اتنا نامور بہادر ہوں کہ موٹی زرہیں پہنے ہوئے بڑے بڑے بہادروں اور شہسواروں کو زیر کر دیتا ہوں۔ ایسے آدمی کی محبت کا جواب دینے میں تجھ کیا شرم محسوس ہوتی ہے۔ تجھے تو چاہیے کہ میرے ان اوصاف کی وجہ سے جنھیں تو جانتی ہے میری تعریف کرے اور مجھ سے قریب ہو جائے۔ کیونکہ میں ایسا آدمی ہوں کہ اگر مجھ پر کوئی ظلم کرتا ہے تو میں اس ظلم کا ایسا بدلہ لیتا ہوں کہ اس کا مزہ ظالم کو اتنا کڑوا لگتا ہے کہ جیسے علقم کا مزہ ہوتا ہے۔ پھر اس سنگ دلی اور سخت خوئی کے ساتھ اس میں نرم دلی بھی ہے۔ چنانچہ معرکہ کارزار میں تیروں کی بارش کی وجہ سے اس کے گھوڑے کو جو تکلیف پہنچ رہی ہے، اس کا احساس کر کے گھوڑے کی دل کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی زبان ہوتی تو اس پر جو بیت رہی ہے مجھ سے کھول کر بیان کرتا۔ لیکن وہ جانور ہے، اور صرف ہنہنا کر اور تیروں کی بارش سے منہ پھیر کر اور اپنے آنسو بہا کر اپنی تکلیف کا اظہار مجھ سے کرتا ہے۔

فازور من وقع القنا بلبانه	وشكا إلي بعبرة وتحمحم
لو كان يدري ما المحاورة اشتكى	ولكان لو علم الكلام مكلمي

پھر کہتا ہے کہ اگر تم کو معلوم نہیں ہے تو میری بہادری اور شجاعت کے کارناموں کو گھوڑوں

سے پوچھ لو۔ اور اس شخص سے پوچھ لو جس نے مجھے معرکہ کارزار میں بے دریغ لڑتے دیکھا ہے۔ اور جب مالِ غنیمت لوٹنے کا وقت آتا ہے تو میں بہت پاکباز اور پاکدامن بن جاتا ہوں۔

هلا سألت الخيل يا ابنة مالك ... إن كنت جاهلة بما لم تعلمي
يخبرك من شهد الوقيعة أنني ... أغشى الوغى وأعف عند المغنم

اپنی جود و سخا اور حریف سے نبرد آزمائی کا ذکر کرنے کے بعد اپنے جنگ کرنے کا اور بہادری کا نقشہ اس شاندار طریقہ سے کھینچتا ہے:۔

لما رأيت القوم أقبل جمعهم ... يتذامرون كررت غير مذمم
يدعون عنتر والرماح كأنها ... أشطان بئر في لبان الأدهم
مازلت أرميهم بثغرة نحره ... ولبانه حتى تسربل بالدم
فازور من وقع القنا بلبانه ... فشكا إلى بعبرة وتحمحم(1)
لو كان يدري ما المحاورة اشتكى ... ولكان لو علم الكلام مكلمي
ولقد شفى نفسي وأذهب سقمها ... قيل الفوارس ويك عنتر اقدم
والخيل تقتحم الخبار عوابسا ... من بين شيظمة وأجرد شيظم

ترجمہ: جب میں نے دیکھا کہ قوم کی فوج ایک دوسرے کو جنگ پر ابھارتی ہوئی آن پہنچی ہے تو میں نے بے دریغ حملہ بول دیا۔

وہ لوگ میرا نام لے کر مجھے ایسی حالت میں پکار رہے تھے جب کہ نیزے گھوڑے کے سینے پر اس شدت اور تیزی سے پڑ رہے تھے جیسے کہ کنویں میں تیزی سے پانی نکالنے کے رسّیاں ڈالی جا رہی ہوں۔

چنانچہ میں اس کی گردن کے بالائی حصے اور اس کے سینہ سے مستقل تیر اندازی کرتا رہا یہاں تک کہ گھوڑا خون میں نہا گیا۔

اپنے سینے پر مستقل نیزوں کے پڑنے سے وہ (گھوڑا) اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ اس نے جب منہ پھیر لیا تو میں نے اس کو ڈانٹا تو اس نے آنسو اور اپنی ہنہناہٹ سے مجھ سے اپنی تکلیف بیان کی۔

۱۔ بعض رواۃ نے اس شعر کو یوں بھی لکھا ہے:

فازور من وقع القنا بلبانه ... وشكا إلى بعبرة وتحمحم

اگر وہ بول سکتا تو کھل کر اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرتا اور اگر اسے بات کرنی آتی ہوتی تو مجھ سے زبان سے باتیں کرتا۔

مجھے اس بات سے بڑا سکون ہوا اور میرا سارا دکھ درد جاتا رہا جب میں نے شہسواروں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ واہ عنترہ، بڑھے جاؤ۔

اور حالت یہ تھی کہ گھوڑے معرکۂ کارزار کی نرم زمین میں منہ بسورے ہوئے گھستے جا رہے تھے۔ ان میں بڑے ڈیل ڈول کے اور چھوٹے بالوں والے، دونوں طرح کے گھوڑے تھے۔

مذکورہ بالا اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عنترہ کے کردار میں عربی شجاعت اور مردانگی، اور عربی اخلاق وعادات پوری طرح رچ بس گئی تھیں۔ وہ نرم دل ہے لیکن کمزور دل نہیں، وہ سخت کوش ہے لیکن تندخو نہیں، وہ صرف انسانوں ہی کا دکھ درد اور مصیبت کو نہیں سمجھتا بلکہ جانوروں کی تکلیفوں اور ان کے احساسات کو بھی خوب سمجھتا ہے۔

آگے چل کر وہ اپنی رندی ومستی کا بھی ذکر کرتا ہے لیکن اس میں عربی اعلیٰ اقدار اور اخلاق کو نہیں بھولتا۔ وہ مے خوار ہے لیکن بدکار نہیں، وہ شغل بادہ کرتا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ عزت وآبرو، جُود وسخا اور اعلیٰ اخلاق وکردار کو دُختِ رز کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ بلکہ اس انداز اور اس وضع سے کہ ایک شریف عربی نژاد بہادر نوجوان کو جو اعلیٰ کام کرنے چاہئیں انھیں بھول نہ جائے۔ کہتا ہے:۔

وإذا شربت فإنني مستهلك — مالي وعرضي وافر لم يكلم
وإذا صحوت فما أقصر عن ندى — وكما علمت شمائلي وتكرمي

آخر میں حُصَین بن ضَمضَم اور اس کے بھائی ہَرِم بن ضَمضَم کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اس کا ڈر ہے کہ میں کہیں ان دونوں کا بدتر انجام دیکھنے سے پہلے ہی نہ مر جاؤں۔ کیونکہ یہ لوگ مجھے بُرا بھلا کہتے ہیں اور میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ میں نے ان کے باپ کو قتل کر کے درندوں اور گدھوں کا کھانا بنا دیا تھا۔ یاد ہوگا جب ہرم بن سنان اور الحارث بن عوف نے عبس و ذبیان کے دونوں قبیلوں میں صلح کرائی تھی تو حصین بن ضمضم وہ ذبیانی تھا جو اس صلح میں شریک نہ ہوا تھا اور اس نے پھر اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کی خاطر جنگ کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ جس کا ذکر زہیر نے بھی اپنے معلقہ میں کیا ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے لبید بن ربیعہ اور عنترہ کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے بالکل صحیح

لکھا ہے کہ "۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لبید کے قصیدے کا لطف نوجوان طبقہ اسی وقت لے سکتا ہے، جب کہ اس کا ترجمہ اور صاف تشریح کر دی جائے اور اس میں جو بلند شاعرانہ محاکات اور منظر کشی ہے اسے ان کے سامنے سہل اور آسان زبان میں پیش کر دی جائے۔ لیکن عنترہ کا یہ قصیدہ اگر تم انھیں نوجوانوں کے سامنے پڑھو تو وہ بغیر ترجمہ و تشریح کے اس کے اکثر حصّہ کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ کیونکہ عنترہ کا یہ قصیدہ واضح اور صاف ہے۔ اس کے الفاظ آسان، معانی و مطالب عام فہم ہیں اور باوجود (بعض جگہ) غرابتِ الفاظ و معانی کے بات بغیر پردے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ ان سب خصوصیات کے باوجود اس شاعر نے بھی پرانے شاعروں کی ریت اختیار کی ہے۔ اور انھیں کے نقشِ قدم پر چلا ہے۔ چنانچہ اسی طرح اونٹنی اور محبوبہ کا ذکر کیا ہے جس طرح اس کے اگلوں نے کیا ہے اور بالکل اسی انداز میں جود و سخا اور شرافت پر فخر کیا ہے جس طرح انھوں نے کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جب میں یہ قصیدہ پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قصیدہ کیا ہے نغمہ و موسیقی کی مختلف دھنوں کو ایک ساتھ ملاکر ایک ایسا راگ ایجاد کیا گیا ہے جس میں مرکزی حیثیت صرف ایک ہی دُھن کو حاصل ہے، جو شروع قصیدہ سے لے کر آخر تک جاری و ساری رہتی ہے۔ یہ دُھن قصیدہ میں کہیں بہت واضح طریقے سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی ایسے دھیمے سُروں میں کہ صرف تم محسوس کر سکتے ہو، اور کبھی اتنی مخفی کہ قوت سامعہ کو بھی دھوکہ دے جائے۔ اور یہ دھن جو قصیدہ کا بالکل اسی طرح مرکزی خیال ہے جس طرح لبید کے قصیدہ میں ملتا ہے۔ دل کی وہ بات ہے جو شاعر اپنی محبوبہ سے کرتا ہے اور اس کا وہ سراپا ہے جو شاعر ابتدائے قصیدہ سے لے کر آخر قصیدہ تک اپنی جنت نگاہ بنائے رکھتا ہے۔ مگر لبید اور عنترہ کے قصیدوں میں مرکزی خیال کے اس اشتراک کے باوجود دونوں میں بڑا فرق ہے۔ چنانچہ عنترہ کے قصیدہ میں یہ مرکزی خیال اتنا شیریں اور لطیف ہے کہ دل و دماغ کی گہرائیوں سے ہوتا ہوا رُوح میں تحلیل ہو جاتا ہے کیونکہ عنترہ بڑا شیریں نفس، نرم دل مگر احساسات و عواطف میں بڑا قوی اور ذکی تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک زمانہ تک ذلت کی زندگی گزارنے کے بعد اسے عزت ملی تھی۔ (کیونکہ) وہ غلامی کی زندگی گزارنے کے بعد آزاد ہوا تھا۔ اور اسی طرح اس نے اپنے بچپنے اور جوانی میں بھی سخت تکلیفیں اور ذلتیں برداشت کی تھیں اور اس ذلت و رسوائی نے جو اس کی روح میں گھس گئی تھی۔ اس کے خیالات کو ۔ ۔ جلا اور اس کے مزاج میں وہ نرمی بخشی تھی جو اور کسی طرح ممکن نہ تھی۔ اس کے مقابلہ میں لبید کے قصیدہ میں یہ خیال نسبتاً بہت گمبھیر ہے۔ اس میں بدویانہ تند خوئی اور وحشی پوری طرح نمایاں

ہے۔ چنانچہ لبید اپنی محبوبہ کا ذکر شروع قصیدہ میں کرتا ہے اور قصیدہ کے درمیان بھی اس کا تذکرہ کرتا ہے اور کہیں بھی اسے نہیں بھولتا۔ لیکن وہ اس پر جاں نثار نہیں کرتا، اس پر مرنہیں مٹتا۔ اور نہ اس کے منہ پھیر لینے سے اسے کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے اعراض کا بدلہ اعراض سے، اس کے قطع تعلق کا بدلہ قطع تعلق سے، اور اس کے دور ہونے کا بدلہ دور ہونے سے دیتا ہے، برخلاف اس کے عنترہ کا یہ انداز ہے کہ :۔

ولقد نزلت فلا تظنی غیرہ

منی بمنزلۃ المحب المکرم

یعنی تو میرے دل کی گہرائیوں میں اس طرح جا بسی ہے کہ ایسا عزیز اور قابل احترام کوئی دوسری شخصیت ہو ہی نہیں سکتی۔

اسی طرح عنترہ کے فخر و مباہات کا عالم ہے۔ یہ محبوبہ کے مقابلہ میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی خاطر ہے کہ ایسے اخلاق حمیدہ اور اوصاف فاضلہ کا آدمی تیرا عاشق ہے[1]

ایک دوسرے قصیدہ میں قبیلہ عبس کی تعریف کرنے کے بعد اپنے کالے رنگ کے عیب کو اپنی شجاعت و بہادری کے کارناموں سے دھو کر ان پر فخر کرتا ہے :۔

لِلّٰہ درّ بنی عبس لقد نسلوا　　من الأکارم ما قد تنسل العربُ

ترجمہ : اللہ بنو عبس کا بھلا کرے ان لوگوں نے ایسی اُولوالعزم اور بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں جو عرب قوم نہیں پیدا کر سکتی ہے۔ میں گزشتہ زمانے میں ان کے اونٹ چرایا کرتا تھا مگر جب آج ان پر مصیبت پڑتی ہے تو میں ان کی عزت بچاتا ہوں۔ اگر لوگ میرے کالے رنگ کا طعنہ مجھے دیتے ہیں تو یہ کالا رنگ جنگ کے دن جب حسب نسب کا مذکور نہیں ہوتا، میرا نسب بن جاتا ہے۔ اس کے بعد نعمان بن المنذر کو مخاطب کر کے اپنی بہادری پر فخر کرتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے قصیدے میں موت سے بے خوفی کا ذکر بڑے دلنشیں انداز میں کرتا ہے۔ کہتا ہے :۔

بکرت تخوفنی الحتوف کأنّنی　　أصبحت من غرض الحتوف بمعزل

۱۔ ڈاکٹر طہٰ حسین۔ حدیث الاربعاء ۱/۱۳۵

یعنی صبح سویرے وہ مجھے موت سے ڈرانے لگی گویا کہ میں موت کے نشانے سے بچا ہوا ہوں۔

عنترہ کی طرف جو قصیدے منسوب کیے جاتے ہیں، ان میں بعض بہت ہی معیاری ہیں۔ خاص طور سے قابلِ ذکر وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے :۔

الاقاتل الله الطلول البو الیا وقاتل ذکراك السنین الخوالیا

ولا یحمل الحقد من تعلو به الرتب ولا ینال العلی من طبعه الغضب

غرض کہ عنترہ کا قصیدہ اور اس کا کلام، اس کی زندگی، اس کے حالات ایک شریف نفس، شریف دل اور شریف خیالات وعواطف والے بدوی کا آئینہ دار ہے۔ جس میں جاہلی زمانہ کی شاعری کی تمام صفات اور خصوصیات پوری طرح عیاں ہیں اور فضول، لغو اور بیکار باتوں سے پاک وصاف ہے۔ چنانچہ عنترہ کے بعض اشعار ضربُ المثل کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

عنترہ کا قصہ

عنترہ کی شخصیت اور اس کی بہادری، جوانمردی اور جنگوں میں جو کارہائے نمایاں اس نے انجام دیئے ہیں ان کے سہارے عربی میں " قصۃ عنترہ " کے نام سے ایک پوری لوک کہانی وجود میں آگئی ہے۔ جس کے متعلق نثر جاہلی کے باب میں تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے۔ جیسا کہ دنیا کی تمام لوک کہانیوں کا حال ہے، اس قسم کی کہانیوں کے ایجاد کرنے والے کے نام کا پتہ نہیں چلتا یہی حال عنترہ کے قصہ کا بھی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ عنترہ کی کہانی زمانۂ جاہلیت سے شروع ہو کر اسلامی زمانے میں پوری ہوتی ہے۔ اور ہر دور میں اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ اسلامی عہد میں عنترہ کے اشعار کو فوج میں جوش پیدا کرنے اور ہمت وبہادری کی صفات کو اجاگر کرنے کے لئے سب سے پہلے جمع کیا گیا، پھر ان کو ادبی حیثیت دی گئی۔ اسی طرح اس کی جنگوں اور بہادری کے قصوں کو مشہور عالم اور ناقد اصمعی کی روایت سے جمع کیا گیا۔ اس کے بعد اس میں حشو وزیادہ ہوتا رہا یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں مصر میں ان سب قصوں کو یکجا کر کے مدوّن کیا گیا، یہ زمانہ ہے خلیفہ العزیز باللہ الفاطمی کا۔ کہتے ہیں کہ اس کے محل میں کوئی نازیبا بات ہو گئی جس کا چرچا گلیوں اور بازاروں میں ہونے لگا چنانچہ خلیفہ نے اپنے ایک حاشیہ نشین اور قصہ گو الشیخ یوسف بن اسمٰعیل سے کہا کہ تم ایسی ترکیب کرو کہ لوگ اس بات کو بھول کر کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ شیخ یوسف علم وادب، نقل وروایت اور اخبار عرب میں اپنے زمانے میں یکتائے روزگار عالم سمجھے

جاتے تھے۔ انھوں نے مختلف روایتیں ابو عبیدہ، ابن ہشام اور اصمعی وغیرہ جیسے نقادوں اور علماء سے سیکھ رکھی تھیں، چنانچہ انھوں نے عنترہ کا قصہ لکھنا شروع کیا اور جستہ جستہ لوگوں میں اسے تقسیم کرنے لگے۔ اور اس طرح سلسلہ در سلسلہ کر کے انھوں نے اس قصہ کو مکمل کیا۔

مگر ثقہ رواۃ اور نقادوں کا اتفاق ہے کہ عنترہ کا یہ قصہ محض خیالی، جھوٹا اور من گھڑت ہے، نہ اس کی کوئی تاریخی حقیقت ہے اور نہ کوئی اس کا ثبوت، قصہ عنترہ چھپ کر عام ہو چکا ہے۔ اسی طرح ثقہ علماء اور نقاد، عنترہ کے بہت سے قصیدوں کو بھی جعلی اور اسلامی دور کی پیداوار سمجھتے ہیں۔

حوالہ جات :

۱۔ الاغانی — لابی الفرج الاصفہانی، ج ۷

۲۔ کتاب الشعر والشعراء — لابن قتیبہ

۳۔ جمہرۃ اشعار العرب — لابی زید القرشی۔

۴۔ طبقات فحول الشعراء — لابن سلام الجمحی

اس نے عنترہ کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے :۔

یا دار عبلہ بالجواء تکلمی — وعمی صباحا دار عبلہ واسلمی

اور لکھا ہے کہ اس کے علاوہ اس کے بہت سے اشعار منقول ہیں۔ طبع مصر ص ۱۲۸

۵۔ شعراء النصرانیہ — شیخو الیسوعی

۶۔ العقد الفرید — لابن عبد ربہ ج ۱

۷۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ — لجرجی زیدان

اور شروح معلقات۔

۵- اَعشیٰ قیس

(م ۶۶۲۹ء، مطابق ۷ھ ہجری)

اس کا پورا نام مَیمُون بن قیس بن جُندُل بن شراحیل بن عوف بن سعد بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ ہے۔ کنیت ابوبصیر تھی[1] اور لقب اعشیٰ تھا۔ کیونکہ اس کو رتوندھی آتی تھی[2]۔ اسے "عربوں کی جھانجھ" بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ پہلا عربی شاعر ہے جس کا کلام گا کر پڑھا گیا۔ ادب کی کتابوں میں اسے اعشیٰ قیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تاکہ دوسرے ہمنام شعراء سے اسے ممتاز رکھا جا سکے۔ اس کا سلسلۂ نسب بکر بن وائل تک پہنچتا ہے۔

اعشیٰ قیس زمانۂ جاہلیت کے آخری دور کا شاعر ہے اور طبقۂ جاہلی کے مشہور شعراء میں چوتھے نمبر کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ امرؤ القیس، نابغہ الذبیانی اور زہیر بن ابی سلمیٰ کے بعد اسی کو فنِ شاعری میں استاذِ کامل اور قوتِ بیان میں عدیم المثال سمجھا جاتا ہے۔ سارے جاہلی شعراء میں اعشیٰ کو مدح سرائی، شراب اور شراب کی تعریف اور اشعار میں گہرائی اور تنوع پیدا کرنے میں امتیاز حاصل ہے۔ اسی طرح شاید یہ پہلا شاعر ہے جس کے لمبے قصیدے جو اکثر مدحیہ ہوتے تھے، نوک پلک سے پوری طرح درست ہوتے تھے۔

اعشیٰ یمامہ کے ایک گاؤں مَنفُوحَہ کا رہنے والا تھا۔ لیکن اس نے پورے جزیرۂ عرب کا سفر کیا تھا اور وہاں کے مختلف بادشاہوں اور امراء کی شان میں مدحیہ قصیدے کہے تھے۔ اس نے خود اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ کہتا ہے:-

قد جبت ما بين بانقيا إلى عدن　　　وطال في العجم تردادی وتسیاری

۱- طبقات فحول الشعراء: ابن سلام الجمحی۔

۲- عشی یعشی عشاً، عام معنی: رات یا دن میں دکھائی نہ دینا۔ اکثر استعمال رتوندھی۔

میں بانقیا اور عدن کے درمیان خوب گھوما پھرا ہوں اور ایک زمانۂ دراز تک عجمیوں کے درمیان میرا آنا جانا رہا ہے۔

اعشیٰ اپنی ابتدائی زندگی میں اپنے خالو المُسَیّب بن عَلَس کے اشعار کا راوی تھا۔ المسیّب کم گو لیکن پُرگو شاعر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ چنانچہ اعشیٰ اس کے شعروں کی خوب تعریف و توصیف کر کے لوگوں میں سناتا تھا۔ اور خود بھی اس کے انداز میں مشقِ سخن کرتا تھا۔ جب کلام میں پختگی آگئی اور لوگوں میں اس کی شہرت پھیل گئی تو اس نے بادشاہوں کے درباروں اور امیروں کے کاشانوں کا رُخ کیا اور اس کے لئے دور دراز کے سفر کئے۔ اور ان بادشاہوں اور امیروں کی شان میں مدحیہ قصیدے کہے اور ان سے انعام و اکرام حاصل کیا۔ غالباً اعشیٰ صرف جاہلی شعرا میں ہی نہیں بلکہ شاید پورے عربی شعرا میں پہلا شاعر ہے جس نے اپنے ممدوحوں سے منہ پھوڑ کر صلہ مانگا ہے۔ اس لئے عربوں کی نظر میں اس کی وقعت بہت کم ہو گئی تھی۔

یوں تو اعشیٰ نے ہر چھوٹے بڑے کی تعریف کی ہے، مگر خاص طور سے اس نے شاہانِ نجران بنو عبد المدان اور ان کے پادریوں اور حیرہ کے بادشاہوں میں سے الاسود کی شان میں جو شاہ النعمان بن المنذر کا بھائی تھا، بڑے شاندار مدحیہ قصیدے کہے ہیں۔ شاہانِ نجران کے یہاں مدّتوں وہ ٹھہرتا، خوب شرابیں پیتا اور نغمہ و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتا۔ مدتوں تک ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کے خیالات بھی متاثر ہو گئے۔ اس کے ثبوت میں اس کا ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔ جس میں اس نے کہا ہے:۔

استأثر الله بالوفا وبالـ عدل وولی الملامة الرجلا

جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہودیوں میں اعشیٰ کے تعلقات شریح بن السموئل سے بھی تھے جو تیماء کا والی تھا۔ اعشیٰ اس سے اس کے قلعہ "الابلق" تاجی میں ملا تھا۔

عرب حکمرانوں سے خوب انعام و اکرام پانے کے بعد بھی جب اس کی نیت نہ بھری تو اس نے کسریٰ انوشیرواں کے دربار کا رخ کیا اور اس کی شان میں ایک لمبا قصیدہ کہہ کر اسے سنایا۔ ایرانی حکمرانوں کے لئے ایک عرب نژاد کی یہ تعریف منہ مانگی مراد تھی۔ چنانچہ کسریٰ نے دل کھول

کر اعشیٰ کو انعام و اکرام دیا۔ اگرچہ ترجمہ کی خرابی کی وجہ سے کسریٰ کو اعشیٰ کا یہ قصیدہ کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔

اعشیٰ نے بڑی لمبی عمر پائی۔ آخر عمر میں جب اسلام کا ظہور ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائلِ عرب میں کامیابی حاصل ہونے لگی تو اعشیٰ نے آپ کی شان میں ایک بہت ہی خوبصورت اور پرشکوہ مدحیہ قصیدہ کہا اور اس نیت سے حجاز کی طرف روانہ ہوا کہ قصیدہ خدمت نبوی میں پیش کر کے مسلمان ہو جائے۔ یہ واقعہ فتحِ مکہ سے پہلے کا ہے۔ ادھر قریش کے لوگوں کو اس کی بھنک پڑ گئی اور انھوں نے سوچا کہ اگر اعشیٰ نے اپنا مدحیہ قصیدہ پیش کر دیا تو سارے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دھوم مچ جائے گی۔ چاہے وہ خود مسلمان ہو یا نہ ہو۔ اس لئے اس سے راستے میں یہ لوگ ملے اور ابو سفیان نے اس سے کہا۔ "ہمارے اور اس کے (محمدؐ) درمیان اس وقت لڑائی بند ہے۔ اس لئے تم ایک سو اونٹ لے لو اور اس سال اپنے وطن واپس چلے جاؤ اور انتظار کرو کہ ہمارے اور اس کے درمیان کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہم پر غالب آجاتا ہے تو تم بیشک اس کے پاس آجانا۔" چنانچہ اعشیٰ نے مکے والوں سے یہ سو اونٹ لے لئے اور اپنے وطن یمامہ کو واپس لوٹ آیا۔ جب یمامہ سے تھوڑی دور رہ گیا تو اتفاقاً اونٹنی سے گر گیا جس کی وجہ سے اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ وہیں مر گیا۔ اور اپنے گاؤں منفوحہ میں دفن کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا، کہ وہ نجات پاتے پاتے رہ گیا!

امتیازی خصوصیات

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ اعشیٰ[1] کو جاہلی دور کے تینوں ممتاز شعرا کے بعد چوتھے نمبر کا شاعر سمجھا جاتا ہے اور یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو کسی شاعر کو مل سکتا ہے۔ اعشیٰ کو اپنے پیش رَو شاعروں میں کلام کی گہرائی اور بڑی تعداد میں لمبے اور اچھے قصیدے کہنے اور مروجہ اصناف شعر

۱۔ طبقات فحول الشعرا: ابن سلام الجمحی، ص ۴۴۔

۲۔ پورا سلسلۂ نسب یہ ہے:

میمون بن قیس بن جندل بن شراحیل بن عوف بن سعد بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ بن بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل بن قاسط۔

میں سے اکثر پر طبع آزمائی کرنے اور ہر صنف میں نت نئی باتیں پیدا کرنے میں امتیاز حاصل تھا اور شراب کی تعریف میں تو اس کا مقابلہ مشکل سے کوئی کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ کہاوت مشہور ہوگئی تھی کہ "أشعرُ الشعراء أعشیٰ إذا طرب" یعنی جب اعشیٰ شراب پی کر مست ہو جائے، تو سب سے بڑا شاعر ہوتا ہے۔ اعشیٰ کے کلام میں ایسی مٹھاس اور اندازِ بیان میں ایسا بانکپن ہے جو عام طور سے دورِ جاہلی کے شعرا میں نہیں ملتا۔ اس کے اشعار میں اتنی موسیقیت اور غنائیت تھی کہ محفلوں میں اس کے اشعار گائے جاتے تھے۔ اسی لئے اسے "صَنَّاجَةُ العَرب" یعنی عرب کی جھانجھ کہتے ہیں[1]۔ اعشیٰ کے کلام کے اثر کا یہ عالم تھا کہ قبائلِ عرب میں جس کو چاہتا، اپنی مدح کے ذریعہ اونچا اُٹھا دیتا اور جس کو چاہتا نیچا گرا دیتا۔ اس کے مدحیہ کلام کی بدولت بڑے بڑے شریف اور نامی لوگ ذلیل اور خوار ہو گئے اور کتنے نیچے درجے کے لوگ اونچے اور معزز ہو گئے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ اعشیٰ کی تعریف کی بدولت مُحلّق نامی ایک معمولی شخص چشم زدن میں ساداتِ عرب میں شمار ہونے لگا تھا اور یہی نہیں بلکہ اس کی آٹھ بن بیاہی لڑکیاں جن کی شادی محلق کی غربت اور گمنامی کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی، صرف ایک سال کے اندر محض اس مدحیہ قصیدہ کی وجہ سے جسے اس نے عکاظ کے میلے میں پڑھا تھا بڑے بڑے امراء کے محلوں کی زینت بن گئیں[2]۔

اعشیٰ اپنے کلام میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے فارسی کے بعض الفاظ اور ایرانی ساز و سامان کا ذکر بھی کرتا تھا چنانچہ پھولوں میں 'گل'، 'یاسمین'، اور بعض سازوں کا ذکر اسکے کلام میں ملتا ہے[3]۔ اعشیٰ اس قسم کے شعر محض تفننِ طبع کے طور پر ہی نہیں کرتا تھا، بلکہ اس سے یہ بھی دکھانا چاہتا تھا کہ اس نے ملکوں کا سفر کیا ہے انکے بادشاہوں اور ممتاز لوگوں سے گھلا ملا ہے اور ان کے ساتھ اٹھا بیٹھا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ ان چیزوں کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ اعشیٰ کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عکاظ کے میلے میں اس کے لئے الگ چمڑے کا

۱۔ عمدہ کی روایت ہے کہ اسے 'صناجۃ العرب' اس لئے کہا گیا کہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے "الصنج" یعنی جھانجھ کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔ ۲۔ تعمہ کی تفصیل ص پر ملاحظہ فرمائیے۔ محلق نام پڑنے کی وجہ "ایک گول دائرہ" جو گھوڑے کے کاٹنے سے بن گیا تھا۔

۳۔ جیسے :— شاھدنا الجُلّ والیاسمین والمسمعات بأقصابها

وبربطنا دائم معمل فأی الثلاثة أزری بها

ایک خیمہ لگایا جاتا تھا جس میں شعرا آکر اپنا کلام اسے سناتے اور کلام کے بارے میں اس کی رائے معلوم کرتے، اور جس کے حق میں جو فیصلہ کر دیتا سب لوگ اسے مان لیتے۔

اعشیٰ کو بھی اکثر نقادوں نے اصحاب المعلقات میں شمار کیا ہے اور اس کے اس قصیدہ کو جس کے ذریعہ اس نے نعمان بن المنذر کے بھائی الاسود کی تعریف کی ہے، اس کا معلقہ بتاتے ہیں۔ اس معلقہ میں زوزنی کی روایت کے مطابق ۹۸ شعر ہیں۔ اس کا مطلع ہے؛

ما بکاء الکبیر بالاطلال　　　وسؤالی وما ترد سؤالی[1]

یعنی میرے ایسے عمر دراز آدمی کے لئے محبوبہ کی نگری کے نشانات کو دیکھ کر رونے سے اور اس سے سوالات کرنے سے کیا فائدہ ہے جب کہ میرے سوالات کے جوابات نہ دیئے جاتے ہوں۔

دستور کے مطابق اس نے اپنا یہ قصیدہ تشبیب سے شروع کیا ہے اور یہ سلسلہ ۲۶ ویں شعر تک چلا ہے جس میں غزل کے بعد سفر اور اونٹنی کا وصف ہے۔ ۲۷ ویں شعر سے گریز کیا ہے، اور اپنے ممدوح الاسود الکندی کی تعریف شروع کی ہے۔ اور اپنی اونٹنی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ؛۔

لا تشکی الیّ و انتجعی الاسـ　　　ـود أهل الندی وأهل الفعال

یعنی مجھ سے اپنی تکلیفوں اور پریشانیوں کی شکایت نہ کرو۔ بلکہ اسود کے پاس جاؤ جو بڑا سخی داتا ہے اور ہمیشہ اچھے کام کرتا ہے۔

اس کے بعد اس کے صفات گناتا ہے۔ اس کے خاندان اور حسب نسب کی تعریف کرتا ہے اور اس کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے۔ اور پھر غزل کی طرف آتا ہے۔ اس کے بعد شکار اور اس کا منظر کھینچتا ہے۔ اور آخر میں اسی پر قصیدہ کو ختم کر دیتا ہے۔

قصیدہ لفظی و معنوی اعتبار سے خاصا مشکل اور دقیق ہے اور اس میں جاہلی رنگ پورا جھلکتا نظر آتا ہے۔ اسی لئے عام خیال یہ ہے کہ یہ قصیدہ اعشیٰ کا فخر رہے۔ علماء کا اس امر میں اتفاق ہے کہ اعشیٰ کا سب سے اچھا قصیدہ وہ ہے جسے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کہا تھا اور جسے اہل قریش کی سازش کی وجہ سے آپ کو سنا نہ سکا۔ اس کا مطلع ہے ؛۔

الم تغتمض عیناک لیلۃ أرمدا

وبتّ کما بات السلیم مسهدا

---

[1] بعض رواۃ نے "بی الاطلال" لکھا ہے ۔ جمہرہ ۵۶ ۔

یعنی کیا آشوبِ چشم کی رات کو تمہاری آنکھوں نے پلک بھی نہیں جھپکائی۔ اور تم نے سانپ کے ڈسے آدمی کی طرح جاگ کر اپنی رات بتائی؟

آگے چل کر اپنی اونٹنی کے متعلق کہتا ہے کہ میں نے یہ قسم کھائی ہے کہ اس کے تھکنے اور پریشان ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کروں گا جب تک کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مل نہ لے گی۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ گھبراؤ نہیں، تم جب آپؐ کے دروازے پر بیٹھو گی، تو تم اپنی ساری تھکن اور سفر کی تکلیف بھول جاؤ گی۔ کیونکہ آپؐ بڑی فیاضی اور دریا دلی سے تمہارا خیر مقدم فرمائیں گے۔ اس کے بعد آپؐ کی تعریف شروع کرتا ہے کہ آپ ایسے نبی ہیں کہ وہ سب کچھ آپ پر منکشف اور عیاں رہتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔ اور آپ کی شہرت جزیرۂ عرب کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے۔ آپؐ مستقل بھلائیاں کرتے رہتے ہیں اور بے انتہا داد و دہش فرماتے ہیں اور آپ کی آج کی جُود و سخا کل کی جُود و سخا کے لئے مانع نہیں ہوتی۔

فآلیت لا أرثی لها من کلالة	ولا من حفی حتی تلاقی محمدا
متی ماتناخی عند باب ابن هاشم	تراحی وتلقی من فواضله ندی
نبی یری مالا یرون وذکره	أغار لعمری فی البلاد وأنجدا
له صدقات ماتغب ونائل	ولیس عطاء الیوم یمنعه غدا

ایک دفعہ یونس بن حبیب نحوی سے پوچھا گیا کہ آپ کے خیال میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو اس نے کہا کہ اس سلسلہ میں کسی خاص شاعر کا نام تو نہیں لے سکتا، البتہ یہ کہتا ہوں کہ۔

"إمرؤ القیس إذا رکب، والنابغة إذا رهب، وزهیر إذا رغب، والأعشیٰ إذا طرب"

یعنی سب سے بڑا شاعر امرؤ القیس ہے جب وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو، اور نابغہ اس وقت جب ڈرا ہوا ہو، اور زہیر جب اسے انعام و اکرام کا لالچ ہو، اور اعشیٰ اس وقت جب وہ مست ہو جائے۔ مستی و ترنگ میں بہترین شعر کہنے کی مثال وہ مدحیہ قصیدہ ہے جس میں اس نے محلق نامی بدو کی تعریف کی ہے۔ اس کا یہ قصیدہ اپنے طرز بیان اور جدت میں مثالی سمجھا جاتا ہے۔

بعض نقادوں نے اس کے اس مدحیہ قصیدہ کو معلقات میں شامل کیا ہے جسکا مطلع یہ ہے

ودّع هُرَیْرَةَ إن الرکب مرتحل	وهل تطیق وداعًا أیها الرجل

هریرہ کو اب رخصت کر دو کہ قافلہ اب کوچ کرنے والا ہے۔ لیکن اے آدمی کیا تم رخصت کرنے پر قادر بھی ہو، یعنی یہ مشکل کام ہے۔

آگے چل کر اپنی قوم کی شجاعت وبہادری پر فخر کرتا ہے اور اپنے حریف یزید بن شیبان کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تم ہماری بے عزتی کرنے اور گڑے مردے کھودنے سے باز نہیں آؤ گے۔ آخر اس سے فائدہ کیا ہے؟۔ تم لاکھ کوشش کرو ہمیں رسوا اور ذلیل نہیں کرسکتے ہو۔ تمہاری اس کوشش کی مثال ایسی ہے کہ پہاڑی بکرا اگر کسی چٹان کو اپنی سینگ سے توڑنا چاہے تو چٹان پر کوئی اثر نہ پڑے گا، البتہ وہ خود اپنی سینگ توڑے گا۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم تم سے نبرد آزمائی نہیں کرسکتے، تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ہم تم جیسے لوگوں کو بے دریغ تہ تیغ کر دیتے ہیں اور اگر دل میں کوئی حسرت ہے تو پھر آجاؤ میدان جنگ میں، تم کو ہماری شجاعت اور بہادری کا اندازہ ہو جائے گا۔

أبلغ يزيد بن شيبان مالكة　　　أبا ثبيت أما تنفك تأتكل

ألست منتهيا عن نحت أثلتنا　　　ولست ضائرها ما أطت الابل

مذکورہ بالا قصیدہ کے بعض اشعار اور خاص طور سے مندرجہ ذیل اشعار محبوبہ کے سراپا کا بہترین نمونہ ہیں۔

غراء فرعاء مصقول عوارضها　　　تمشي الهوينا كما يمشي الوجي الوحل

كأن مشيتها من بيت جارتها　　　مر السحابة لا ريث ولا عجل

تسمع للحلي وسواسا إذا انصرفت　　　كما استعان بريح عشرق زجل

إذا تقوم يضوع المسك أصورة　　　والزنبق الورد من أردانها شمل

یعنی میری محبوبہ سرو قد زہرہ جبین ہے اور اس کے دانت سفید اور چمکیلے ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تو اس کے پاؤں میں کوئی تکلیف ہے جس کی وجہ سے وہ ہولے ہولے قدم دھرتی ہے، یا اس آدمی کی طرح پگ دھرتی ہے جو کیچڑ میں چل رہا ہو، اور قدم سنبھال سنبھال کر رکھ رہا ہو۔ اور جب وہ اپنی پڑوسن کے گھر سے واپس جاتی ہے تو اس کی چال ایسی لگتی ہے جیسے کہ بدلی ہو، نہ بہت آہستہ اور نہ بہت تیز۔ اور چلنے میں اس کے زیورات کی کھنک اس طرح سنائی دیتی ہے جیسے کہ عشرق[1] کے پودے کی آواز ہو جسے باد نسیم ہلا جائے۔ اور جب وہ کھڑی ہوتی ہے تو ساری فضا اس کی خوشبو سے معطر اور معنبر ہو جاتی ہے۔

1۔ عشرق ایک پودا ہے جس کے پھل جب ہوا سے ہلتے ہیں تو بیجوں کی آواز بہت بھلی لگتی ہے۔

اسی طرح اعشیٰ نے شراب کے وصف میں بھی کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے وہ اشعار مثال میں پیش کئے جاتے ہیں جن میں اس نے کہا ہے کہ صبح تڑکے جب کہ مرغ سحر بھی بانگ نہیں دے چکے ہوتے، اور سب لوگ گہری نیند میں پڑے خراٹے لیتے ہوتے ہیں تو میں اٹھ کر شراب فروش کے پاس جاتا ہوں، جہاں ساقی گلفام اپنے دستِ حنائی سے بادہ لالہ گوں کو پیالوں میں بھرے ہمارے اوپر نچھاور کرتا ہے۔ جس کے جام ہم اس وقت تک لنڈھاتے رہتے ہیں جب تک جسم پر سکون اور اعضا ڈھیلے نہ پڑ جائیں۔

نقلنا دلما يصح ديكنا إلى حبونة عند حدادها

ایک دوسری جگہ شراب کا اتنا حسین وصف بیان کرتا ہے کہ جس کی مثال جاہلی شعراء میں کم ملتی ہے۔ کہتا ہے:۔

وأدكن عاتق جحلٍ ربحلٍ[1] صبحت براحه شربا كراما

من اللائي حملن على المطايا كريح المسك تستل الزكاما

اور ایک ایسے کالے رنگ کے پرانے مٹکے کی شراب سے جو ایک بڑے مشکیزہ کی طرح تھا میں نے صبح سویرے شریف یاران میکدہ کی تواضع کی۔ یہ مٹکہ دور دراز کے ملکوں سے سواریوں پر لایا گیا ہے اور جن کے شراب کی خوشبو مشک جیسی تیز ہوتی ہے کہ جب وہ ناک میں پہنچتی ہے تو زکام کو ختم کر دیتی ہے۔

آغانی نے روایت کی ہے کہ شعبی کہا کرتے تھے کہ اعشیٰ کی غزل کا بہترین شعر یہ ہے:۔

غراء فرعاء مصقول عوارضها تمشي الهوينا كما يمشي الوجي الوحل

ور بہادری اور شجاعت میں اس کے اس شعر کا جواب نہیں۔

قالوا الطراد فقلنا تلك عادتنا أو تنزلون فانا معشر نزل

دبے پاؤں نظریں بچا کر رات کی تاریکی میں محبوبہ سے ملنے کا جو نقشہ اس شعر میں ہے، مشکل سے کسی اور شاعر کے کلام میں اتنے حسین انداز سے ملے گا۔ کہتا ہے:۔

فظللت أرعاها وظل يحوطها حتى دنوت إذا الظلام دنا لها

فرميت غفلة عينه عن شانه فأصبت حبة قلبها وطحالها[2]

(۱) بعض نسخوں میں "بجل" کا لفظ بھی آیا ہے۔

(۲) اعشیٰ کے کلام کے متعلق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی رائے، ان کی کتاب "فی الادب الجاہلی" صفحہ ۲۹۱ اور اس کے بعد، اور طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی میں ملاحظہ فرمائیے۔

یعنی ایک طرف میں محبوبہ پر نظریں جمائے رہا تو دوسری طرف اس کا شوہر ہر طرح سے چوکس رہا۔ لیکن تاریکی پھیل گئی تو میں اس کے قریب پہنچ گیا، اور اس کی نظریں بچا کر محبوبہ پہ ایسا وار کیا کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں میری محبت کے تیر اتر گئے۔

یہ شعر اس نے ایک عورت کے بارے میں کہے تھے، جو شادی شدہ تھی۔ لیکن اعشیٰ کو بھی اس سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس کے شوہر کی یہ کوشش رہتی تھی کہ اعشیٰ اس سے نہ ملنے پائے۔ اور اعشیٰ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ کسی طرح اس کی نظریں بچا کر گھڑی دو گھڑی اس سے ہمکلام ہو لے۔

اعشیٰ کی انھیں امتیازی خصوصیات اور جدت طرازیوں کی وجہ سے ابو عمر بن العلاء، لبید، اور اس کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ "لبید رجل صالح و اعشیٰ رجل شاعر" یعنی لبید ایک نیک آدمی ہے مگر اعشیٰ شاعر ہے۔ کہتے ہیں کہ عبدالملک نے اپنے لڑکوں کے اتالیق سے کہا کہ "انھیں اعشیٰ کے اشعار کی روایت کی تربیت دینا، کیونکہ خدا اسے غارت کرے" "ما كانَ أعذب بحره و أصلب صخره" یعنی وہ تو بہت ہی خوش گفتار اور عدیم المثال ناقابلِ تسخیر شاعر تھا۔

کہتے ہیں کہ اخطل ایک دفعہ کوفہ آیا چنانچہ شعبی اس کے پاس آئے۔ تو اس نے پوچھا کہ کہئے کس غرض سے آنا ہوا۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ آپ کے اشعار سننے کی غرض سے، تو اس نے اپنا وہ قصیدہ سنایا جس کا مطلع ہے۔ ——— صرمت أُمَامَۃ حبلها و رعوم۔ یعنی میری محبوبہ امامہ نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے اور جب اس شعر پہ پہنچا کہ۔

و اذا تعاورت الأكف ختامها ——— نفحت، فنال ریاحها المزكوم

یعنی وہ شراب اتنی اچھی اور تیز ہے کہ جب اس کے منکہ سے ڈھکن ہٹایا جاتا ہے، تو اس میں سے ایسی تیز خوشبو نکلتی ہے کہ زکام والے آدمی کے مشام کو بھی معطر کر جاتی ہے۔ (جسے زکام ہو اسے خوشبو اور بدبو کا احساس نہیں ہوتا)

تو اخطل بولا کہ میں نے اپنے اس شعر سے سارے شعرا کو چت کر دیا ہے۔ یہ سن کر شعبی بولے کہ نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ان معنوں میں تو اعشیٰ آپ سے بھی بازی لے گیا ہے۔ یہ سُن کر اخطل چونکا اور کہا کہ وہ کیسے؟ اس پر شعبی نے کہا کہ اپنے اس شعر سے۔

ومن خمر حانۃ قد اتی لختامه ——— حول تسل غمامۃ المزكوم

یعنی عانہ کی وہ ایسی تیز شراب ہے، جس پر ایک سال بیت چکا ہے اور جس کی صرف خوشبو اتنی تیز ہے کہ زکام والے آدمی کے بھی چودہ طبق روشن کر دیتی ہے۔

یہ سُن کر اخطل نے شراب کا پیالہ زمین پر پٹک دیا اور بولا کہ حضرت مسیح کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بڑا شاعر ہے اور واقعی اس نے سارے شعرا کو چت کر دیا ہے، سوائے میرے۔

عَلْقَمہ بن عُلَاثَہ العَامِری اور اَعشیٰ

اعشیٰ نے ذُو فَائش الحِمْیَری کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا، جس کا مطلع ہے:

الشعر قلدته سلامة ذا   فائش والشئ حيث ما جعلا

یعنی میں نے سلامہ ذو فائش کو شعر کا ہار پہنایا ہے اور کسی چیز کی اصلی قیمت اور قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ مناسب جگہ پر ہو۔

جب اعشیٰ نے یہ قصیدہ پڑھا تو ذو فائش بہت خوش ہوا اور اعشیٰ کو سو اونٹ اور خلعت دی۔ اور ایک تھیلے میں عنبر بھر کر دیا۔ اور کہا کہ خبردار اس سے غافل نہ رہنا۔ اس کے یہاں سے رخصت ہو کر وہ جب حیرہ آیا تو اس نے تین سو اونٹوں کے بدلے میں اسے بیچ دیا۔ جب اسے اس کا خطرہ ہوا کہ یہ سارا مال کہیں لٹ نہ جائے، تو علقمہ بن علاثہ العامری کے یہاں پناہ لینے کے لئے آیا۔ علقمہ نے کہا میں تمھیں کالے اور سُرخ سب سے پناہ دیتا ہوں۔ یعنی جن و انس سب سے تمھاری حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ اس پر اعشیٰ نے کہا کہ "اور موت سے بھی" تو علقمہ نے کہا کہ نہیں۔ یہ سُن کر اعشیٰ عامر بن الطفیل العامری کے پاس آیا، اور اس سے بھی یہی بات کہی۔ اس نے جب موت سے بھی حفاظت کا ذمہ لیا تو اعشیٰ نے کہا کہ موت سے تم کیسے مجھے بچا سکتے ہو۔ تو اس نے کہا کہ اگر تم میری پناہ میں رہتے ہوئے مر گئے تو میں تمھارے ورثا کو تمھارا خون بہا ادا کر دوں گا۔ جب علقمہ کو اس بات کا علم ہوا تو بولا کہ مجھے کیا خبر تھی کہ "موت سے بچانے سے" اس کی یہ مراد تھی۔ ورنہ تو معاملہ مشکل نہ تھا۔ یہ واقعہ اس زمانے میں پیش آیا ہے جب علقمہ اور عامر کے درمیان سخت منافرت چل رہی تھی۔ چنانچہ اعشیٰ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر یہاں سے جب روانہ ہوا تو عامر کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ کہا جس میں اس کے بے لاگ فیصلہ اور رشوت نہ لینے اور عدل و انصاف کی یوں تعریف کی:

حكمتموه فقضى بينكم   أبلج مثل القمر الزاهر

لا يأخذ الرشوة في حكمه   ولا يبالي غبن الخاسر

چنانچہ علقمہ کو جب اس قصیدہ کی خبر لگی، تو اس نے اعشیٰ کا خون مباح کر دیا اور اسے پکڑنے کے لئے آدمی چھوڑ دیئے۔ اتفاق سے ایک جگہ جاتے ہوئے راہبر کی غلطی سے اعشیٰ بنی عامر کی جائے سکونت میں بھٹک کر پہنچ گیا۔ اور اسے علقمہ کے آدمیوں نے پکڑ کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ علقمہ نے جب اپنے حریف کو اپنے سامنے پابجولاں دیکھا تو کہا کہ "الحمد الله الذی امکننی منك" خدا کا شکر ہے کہ اس نے آج تمھیں میرے حوالہ کر دیا۔ اس پر اعشیٰ نے فی البدیہہ یہ شعر کہے:۔

اعلقم قد صیرتنی الامو ر   إلیك ما أنت لی منتقص.

فهب لی نفسی فدتك النفو س ولا زلت تنمو ولا تنتقص

یعنی اے علقمہ آج حالات نے مجھے تمھارے سامنے لا کھڑا کیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم میری بے عزتی نہ کرو گے۔ میری جان بخشی کر دو، لوگ تم پر فدا ہوں۔ اور تم دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے رہو۔

علقمہ کے ساتھیوں نے کہا کہ " اقتلہ وأرحنا والعرب من شق لسانہ " اس کی ہجو اس نہ سنو، اس کو قتل کر کے ہمیں اور تمام عرب کو اس کی زبان کے فساد سے نجات دلا دو۔ مگر علقمہ نے کہا کہ نہیں۔ اب ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ دشمن پر قابو پا لینے کے بعد اسے معاف کر دینا سب سے بڑی فخر کی بات اور بھلائی ہے۔ چنانچہ اس نے اس کے ہاتھ پاؤں کھلوا دیئے اور اسے نیا جوڑا پہنایا اور ایک اونٹنی دی۔ اور بنی کلاب میں سے کچھ لوگوں کو اس کی حفاظت اور رہبری کے لئے ساتھ کر دیا، اور کہا کہ اب جہاں تمھارا جی چاہے، چلے جاؤ۔ اس فراخ دلی اور بڑائی کا اعشیٰ کے دل پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد وہ ہمیشہ علقمہ کی تعریف کرتا رہا۔ بعد میں علقمہ مسلمان ہو گئے اور ان لوگوں میں شامل تھے جن کی دلداری کے لئے آنحضورؐ خاص طور سے نظرِ کرم رکھتے تھے۔ چنانچہ اعشیٰ نے عامر کی تعریف کرتے ہوئے علقمہ کی ہجو میں جو اشعار کہے تھے، آنحضرتؐ نے لوگوں کو ان کے پڑھنے سے منع کر دیا۔

قبیلہ کلب کے ایک آدمی اور اعشیٰ کا قصہ مہاجات:

کہتے ہیں کہ اعشیٰ نے قبیلہ کلب کے ایک آدمی کی ہجو کی تھی۔ ایک رات اس کلبی نے ایک عربی قبیلہ پر حملہ کیا اور مال و متاع پر قبضہ کرنے کے ساتھ اس قبیلہ کے لوگوں کو بھی قیدی بنا لیا تھا۔ اتفاق سے اس رات اعشیٰ ان کے یہاں مہمان ٹھہرا ہوا تھا، اور وہ بھی قیدیوں میں پکڑا گیا۔ مگر کلبی اس کو پہچانتا نہ تھا چنانچہ جب وہ قیدیوں کو لے کر تیماء سے گزرتے ہوئے

شُرَیحٗ بن السّموٗل کے گھر کے پاس ٹھہرا تو شریح اتفاق سے وہاں سے گزرا۔ اعشیٰ نے اسے دیکھ لیا اور اسے آواز دے کر فی البدیہہ ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا۔

شریح لاتترکنی بعد ما علقت　　　حبالک الیوم بعد القد اظفار

یعنی اے شریح اس ذلت و رسوائی کی حالت میں جب کہ میں نے تم سے اپنا تعلق جوڑ لیا ہے تو مجھے اب چھوڑ کر نہ چلے جاؤ، بلکہ ــــــــــــ

کن کالسموٗل إذطاف الھمام بہ　　　فی جحفل کسواد اللیل جرار

اپنے باپ سموٗل کی طرح سلوک کرو جب کہ موت رات کی تاریکی جیسی ایک لشکر جرّار لے کر آئی، تو بھی اس کے قدم ایفائے عہد سے نہیں لڑکھڑائے، بلکہ اس نے اپنی زبان پوری کی ــــــــــ"

یہ اشارہ تھا سُموٗل بن عَادِیَا کے ایفائے عہد کے اس قصہ کی طرف جس میں سموٗل نے امرؤ القیس کی لڑکی کو مخالفوں کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے اس کا بیٹا اس کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔ لیکن وہ اپنی زبان سے نہیں پھرا۔ اس واقعہ کی وجہ سے ایفائے عہد میں وہ سارے عرب میں مشہور ہو گیا تھا۔[1]

یہ سن کر شریح کلبی کے پاس آیا اور بولا کہ اس بیچارے قیدی کو مجھے دے دو۔ کلبی نے اعشیٰ کو اسے دے دیا۔ شریح نے اعشیٰ سے کہا کہ کچھ دنوں میرے پاس مہمان رہو تاکہ میں تمہاری خاطر مدارات کر سکوں۔ اور انعام و اکرام دے سکوں۔ اس پر اعشیٰ نے کہا کہ میرے ساتھ اس وقت سب سے بڑا احسان یہ ہوگا کہ مجھے ایک اچھی اونٹنی دے دو، اور مجھے جانے دو۔ چنانچہ شریح نے اسے ایک تیز رفتار اونٹنی دی اور اس پر بیٹھ کر اعشیٰ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے یہاں سے جانے کے بعد کلبی کو پتہ چلا کہ وہ تو اعشیٰ تھا۔ تو اس نے شریح کے پاس اپنا آدمی بھیج کر یہ کہلایا کہ اس قیدی کو واپس میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اس کی خاطر مدارات کروں، اور انعام و اکرام دوں۔ اور جب شریح نے یہ کہلا بھیجا کہ وہ تو جا چکا ہے، تو کلبی نے اس کے پیچھے اپنے آدمی دوڑا دیے، لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔

اعشیٰ کو اس کی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے "فحل" یعنی سب سے بڑا نر کہتے تھے۔ اور عربوں کا دستور تھا کہ شعرا میں سے "فحل" اس کو کہتے تھے جس کے کسی شعر میں کوئی حکمت کی

---

[1] اس قصہ کی تفصیل سموٗل بن عادیا کے قصہ میں ملاحظہ کیجیے۔

بات ہو۔ چنانچہ اعشٰی کو محلّق اس کے اس شعر کی وجہ سے کہا جاتا ہے ؎۔

تـلـدلت الشعر یا سلامۃ ذا | فائش والشئ حیث ماجعلا

اس میں حکمت کی بات یہ کہی گئی ہے کہ کسی چیز کی قدر و قیمت مناسب جگہ اور مناسب موقع پر ہونے سے معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح میں نے ذو فائش کی تعریف اپنے اشعار میں کی ہے تو اس وجہ سے کہ وہی ایسی شخصیت ہے جسے مدحیہ قصیدہ زیب دیتا ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ گویا اس کی شخصیّت اتنی مکرّم و محترم ہے کہ مدحیہ قصیدہ کی بھی عزّت اس کی گردن میں ہار بن کر پڑنے کی وجہ سے بڑھ گئی ہے۔

اعشٰی نے، جیساکہ پہلے بیان ہوا، بڑی لمبی عمر پائی۔ اس طویل عرصہ میں اس نے اکثر اصناف شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ جن کی کچھ مثالیں اوپر پیش کی گئیں۔ ابو عمرو بن العلاء نے ٹھیک کہا تھا کہ اسلامی دور میں اس کا ہمسر جَریر تھا۔ وہ بھی جریر کی طرح ہر صنف میں طبع آزمائی کرتا تھا: مثلہ مثل البازی یضرب کبیر الطیر و صغیرہ[1] یعنی اعشٰی کی مثال اس باز کی طرح ہے جو چھوٹے بڑے سب پرندوں پر جھپٹتا ہے۔

۱ــ طبقات فحول الشعراء۔ ابن سلام الجمحی، ص ۵۵۔

اس روایت کو ابو زید القرشی نے، جمہرۃ اشعار العرب میں دوسرے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ ص ۴۳۔

ڈاکٹر شوقی ضیف نے لکھا ہے کہ گایر Geyer مشہور جرمن مستشرق نے اعشٰی کا دیوان چھ مخطوطات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور چالیس سال کی مسلسل تحقیق و تدقیق کے بعد سنہ ۱۹۲۸ء میں اسے شائع کیا تھا۔ اس میں اس نے دو ضمیمے شامل کئے تھے۔ ایک میں اس نے اعشٰی کا وہ کلام جمع کیا ہے جو اسے ادب اور تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملا ہے۔ اور دوسرے میں ان تمام کثیر التعداد شعراء کا کلام جمع کیا ہے جن کا نام اعشٰی تھا۔ بعد میں محمد حسین نے اس نسخہ کی مدد سے مصر میں اس کا دیوان شائع کیا۔ حاشیہ، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ۔ جرجی زیدان ۵ ۱، ص ۱۲۰۔

حوالہ جات:-

۱- الاغانی — لابی الفرج الاصفہانی ج ۸- و ۱۰ و ۱۶-

۲- جمہرۃ اشعار العرب — ابو زید القرشی

۳- البیان والتبیین — للجاحظ، جلد ۱، ۲، ۳ اور ۴

۴- طبقات فحول الشعراء — ابن سلام الجمحی

۵- الشعر والشعرا — لابن قتیبہ

۶- المعلقات العشر واخبار قائلیہا — احمد بن امین الشنقیطی

۷- شرح المعلقات السبع — للزوزنی

۸- شعراء النصرانیہ — لویس شیخو الیسوعی

۹- تاریخ آداب اللغۃ العربیہ — لجرجی زیدان اوّل

۱۰- فی الادب الجاہلی — ڈاکٹر طہ حسین

۱۱- الوسیط فی الادب العربی وتاریخہ، الشیخ الاسکندری

۱۲- تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام الدکتور شکری فیصل

۱۳- الوصف — سلسلۃ فنون الادب، دار المعارف، مصر

۱۴- تاریخ الادب العربی — احمد حسن الزیات-

۱۵- المفصل — احمد الاسکندری

۶۔ طَرَفہ بن العبد

(م۔ ۵۵۲ء/۵۵۰ء یعنی ۷۰ء قبل ہجرت)

طرفہ کا پورا نام عمرو طرفہ بن العبد ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب قبیلہ بکر بن وائل سے ملتا ہے جو قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ تھی۔ اس طرح سے طرفہ ربیعی شاعر ہے(۱) طرفہ مشہور جاہلی شاعر جریر بن عبد المسیح کا ۔ جسے عام طور سے المتلمس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ بھانجہ اور دوسرے مشہور جاہلی شاعر المرقش الاصغر کا بھتیجا تھا۔ طرفہ اپنی قوم کے ساتھ بحرین خلیج فارس میں رہا کرتا تھا۔ بچپنے ہی سے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس کے چچاؤں نے اس کے ساتھ بہت نازیبا سلوک کیا اور اس کی ماں "وَرْدَہ" کی جائداد وغیرہ بھی غصب کر لی۔ طرفہ کو یہ بات بہت بری لگی اور چڑھ کر ان کی ہجو میں مندرجہ ذیل اشعار کہدیئے۔

ماتنظرون بحق وردة فیکم ۔۔۔ صغر البنون ورھط وردة غیّبُ

قد یبعث الأمر العظیم صغیرہ ۔۔۔ حتی تظل لہ الدماء تصبّبُ

والظلم فرق بین حیّی وائل ۔۔۔ بکر تساقیھا المنایا تغلبُ

قد یورد الظلم المبیّن آجنا ۔۔۔ ملحاً یخالط بالذعاف ویقشبُ

چچا اور اپنے خاندان سے بگاڑ کر لینے کے بعد طرفہ گھر سے نکل پڑا اور شراب وکباب اور

۱۔ پورا سلسلہ نسب یوں ہے :۔ عمرو طرفہ بن العبد بن سعد بن مالک بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ بن عکابہ ابن صعب بن علی بن بکر بن وائل ۔

رندی و بدمستی میں دن رات گذارتا اور بے دریغ پیسہ خرچ کرتا۔ جب پیسہ ختم ہوگیا تو پھر اپنے گھر واپس آیا اور اپنے بھائی سے مدد مانگی۔ بھائی نے اسے کچھ پیسے دے دیئے اور اس نے پھر اسے اپنی عیاشانہ زندگی کی نذر کر دیئے۔ اب گھر جانے کی ہمت نہ تھی۔ چنانچہ اس نے حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کے دربار کا رخ کیا۔ کہتے ہیں کہ اس سفر میں اس کا ماموں المتلمس بھی ساتھ تھا۔ عمرو بن ہند اپنے زمانے کا بہت بڑا شاعر نواز اور علم و ادب کا قدردان بادشاہ گذرا ہے۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کی بڑی آؤ بھگت کی اور اپنے بھائی قابوس کے حاشیہ نشینوں میں انھیں شامل کر دیا۔ قابوس بہت خوش باش زندہ دل اور سیر و شکار کا رسیا نوجوان تھا۔ چنانچہ طرفہ اس کے سیر و شکار کی پارٹی کا ساتھی اور محفل شراب و کباب کا شریک و ندیم بن گیا۔ مگر اس مصاحبت اور یگانگت کے باوجود جتنی اپنائیت اور مراعات کی وہ توقع رکھتا تھا اسے نہ مل سکی کیونکہ اسے اب بھی حسب سابق شاہی محل کے دروازے پر ایک مدت تک کھڑے رہنے کے بعد اندر آنے کی اجازت ملتی تھی۔ اور بات چیت اور برتاؤ میں فرق مراتب کا پورا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ عرب کی آزاد فضا میں آزادی سے پلے بڑھے عرب نژاد نوجوان شاعر کے دل پر اس کا بہت برا اثر پڑا۔ اور جوں جوں دن گزرتے گئے، تعلقات میں اونچ نیچ اور برتاؤ میں بھید بھاؤ کا احساس بڑھتا گیا۔ طرفہ اس بجھی بجھی سی زندگی سے اوب گیا اور اس کے دل میں عمرو بن ہند اور اس کے بھائی کی طرف سے گرہ پڑگئی۔ اور اس نے عمرو بن ہند اور قابوس کی ہجو کہہ ڈالی۔ عمرو بن ہند کو اس کا علم ہوا تو اس نے بات دل میں رکھ لی اور موقع کی تلاش میں رہا۔

کچھ دنوں کے بعد عمرو بن ہند نے کہا کہ شاید اب تم دونوں اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہوگے۔ المتلمس اور طرفہ نے آمادگی ظاہر کی تو اس نے بحرین اور ہجر کے اپنے گورنر ربیعہ بن الحارث العبدی یا مکعبر کے نام ان دونوں کو ایک ایک خط دیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان میں انھیں انعام و اکرام دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ دونوں خط لے کر نکلے جب نجف یا حیرہ کے قریب ایک جگہ پہنچے تو متلمس کے جی میں آیا کہ وہ اس خط کو پڑھوا کر دیکھے تو کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک لڑکے سے اپنا خط پڑھوایا اس میں لکھا تھا کہ جب حامل خط تمہارے پاس پہونچے تو اس کا ایک ہاتھ ایک پاؤں کٹوا کر زندہ درگور کر دینا۔ متلمس نے جب یہ مضمون سنا تو خط کو ایک دریا میں جس کا نام کافر تھا ڈال دیا اور یہ شعر کہا

القیتھا بالثنی من بطن کافر   کذلک اقنو اکل قط مضلل

یعنی میں نے اس خط کو دریائے کافر میں ڈال دیا اور میں اس قسم کے گمراہ کرنے والے خط کا یہی حشر کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ طرفہ کے پیچھے لپکا لیکن اسے نہ پاسکا۔ بعض رواۃ کا خیال ہے کہ طرفہ

اسے مل گیا۔ اور جب متلمس نے اس سے کہا کہ تم بھی اپنے خط کا مضمون معلوم کر لو شاید اس میں بھی یہی حکم ہو تو طرفہ نے اس کا مذاق اڑایا اور بولا کہ میرے بارے میں ایسا حکم دینے کی ہمت عمرو بن ہند کو نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ بدستور اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا اور بحرین کے گورنر کو جا کر خط دے دیا۔ اس نے خط پڑھ کر حسب ہدایت طرفہ کو قتل کرا دیا۔ اس وقت طرفہ کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی۔

اس قصے کے بارے میں رواۃ میں شدید اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ متلمس اور طرفہ نے عمرو بن ہند کے دربار میں جانے سے پہلے اس کی ہجو کہہ رکھی تھی اور اس کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

لیت لنا مکان الملك عمرو — رغوثا حول قبتنا تخور

یعنی کاش عمرو بادشاہ کی جگہ ہمارے لیے ایک دودھ دینے والی گائے یا بکری ہوتی جو ہمارے گھروں کے ارد گرد ممیاتی رہتی۔

اس کی خبر عمرو بن ہند کو ہو گئی تھی لیکن اس نے دل میں بات رکھ لی تھی۔ اور جب یہ دونوں آئے تو اس نے بڑی آؤ بھگت کی اور ان پر ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ ان سے انتقام لینے کی سوچ رہا ہے۔ اور چلتے وقت مذکورہ بالا خط دیا۔ مگر متلمس نے اسے پڑھوا کر سن لیا اور وہاں سے بھاگ کر شاہان شام غسانیوں کے پاس چلا گیا۔ طرفہ نے اس کی بات نہ مانی اور بحرین کے گورنر کے پاس پہنچ گیا۔ اور اس نے طرفہ کے قبیلہ کے ڈر سے قتل کرنے کی جرأت نہیں کی تو عمرو بن ہند نے قبیلۂ بنو تغلب کے ایک شخص عبد ہند کو گورنر بنا کر بھیجا اور اس نے اسے قتل کرایا اور ہجر میں دفن کیا گیا۔

ابن قتیبہ نے الشعر والشعراء میں اس کے قتل کا سبب یہ بتایا ہے کہ طرفہ جن دنوں عمرو بن ہند کی حاشیہ نشینی میں تھا تو ایک دن عمرو کی بہن نے اوپر سے جھانک کر نیچے دیکھا تو اس کا عکس اس پیالہ میں پڑا جس میں طرفہ شراب پی رہا تھا چنانچہ اس نے اس کے حسن برق پاش کو دیکھ کر برجستہ یہ شعر کہا:

أَلا یا ثانی الظبی الذی برق شنفاہ — ولولا الملك القاعد قد أَلثمنی فاہُ

یعنی۔ اے ہرنی کی ہمسر جس کے دونوں آویزے بجلی کی طرح چمک رہے ہیں اگر سامنے بادشاہ نہ بیٹھا ہوتا تو وہ مجھے اپنے ہونٹوں کا بوسہ دیدیتی۔

اس کی یہ جسارت عمرو بن ہند کو بہت بری لگی اور اس نے بات دل میں رکھ لی اور پھر خط دے کر اسے حاکم بحرین کے پاس بھیجا جہاں اسے قتل کرا دیا گیا۔ طرفہ کے قتل کے بعد اس کی بہن نے اس کا مرثیہ کہا۔

نعمنا بہ خمسا وعشرین حجۃ — فلما توفاها استوی سیدا ضخما

فهنابہ لما استتم نخاسہ   علی خیر حال لا ولیداً ولا قحما

یعنی ہم اس کے ساتھ ۲۵ سال تک ہنسی خوشی رہے پس جب کہ اس نے ان برسوں کو پورا کر لیا تو جلیل القدر سردار بن گیا۔ لیکن جب طفلی کی منزل سے نکل کر اس طرح پروان چڑھا کہ نہ تو کچھ تھا نہ ہی سن رسیدہ بڈھا تو ہمیں اس کی موت کا دکھ اٹھانا پڑا۔ (۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طرفہ پچیس سال تک جیا۔ اس بیان میں اور دوسرے رواۃ کے بیان میں بظاہر بہت تضاد ہے۔ اکثر نے اس کے مرنے کی عمر بیس سال ہی بتائی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ بیس سال کی عمر میں اس نے عمرو بن ہند کی ہجو کی اور یہیں سے عمرو بن ہند کی رنجش شروع ہوتی ہے۔ اور وہ موقع کی تلاش میں رہا۔ اور یہ موقع اس کو پچیسویں سال ہاتھ لگا اور اس نے اسے قتل کرا دیا۔ ہمارے اس بیان سے رواۃ اور نقادوں کے سامنے اختلافات کی ایک ایسی تاویل ہو جاتی ہے جو بڑی حد تک قرین قیاس اور قابل قبول ہے کیونکہ راویوں یا تذکرہ نگاروں نے عمرو بن ہند سے اس کی رنجش کی تاریخ نہیں متعین کی ہے۔ البتہ یہ بات ثابت ہے کہ اس نے طرفہ کو قتل کرایا ہے۔ اپنی بہن کے واقعہ یا اپنی ہجو سننے کے بعد۔ اس میں سے جو بھی واقعہ رنجش کا سبب ہوا ہو۔ بہر حال قتل اس کے چند سال بعد ہوا۔ اور عین قرین قیاس ہے کہ چار پانچ سال اس میں گزر گئے ہوں تاکہ طرفہ کے دل سے یہ بات نکل جائے کہ عمرو بن ہند اس سے کینہ رکھتا ہے اور وہ اس سے بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ مل سکے اور اس طرح عمرو بن ہند کو انتقام لینے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عمرو بن ہند کا خط لے کر جب طرفہ چلا ہے تو باوجود متلمس کے کہنے کے اسے شبہ بھی نہیں ہوا کہ یہ خط درحقیقت اس کے قتل کا پروانہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمرو کی رنجش کی بات اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ طرفہ اس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو چکا تھا۔ اور اس کے لیے چار پانچ سال کا عرصہ کافی زمانہ ہے۔ اس طرح پچیس سال کی عمر میں قتل کیا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔

امتیازی خصوصیات

طرفہ کی مختصر سی زندگی کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے قدرت نے بلا کی

۱۔ جمہرۃ اشعار العرب میں صفحہ ۴۳ پر یہ شعریوں بھی نقل کیا گیا ہے۔

عددنا لہ ستا وعشرین حجۃ   فلما توفاھا استوی سیدا ضخما

فجعنا بہ لما رجونا إیابہ   علی خیر حال لا ولیداً ولا قحما

ابن قتیبہ نے بیس سال کی عمر میں مرنے کی روایت نقل کی ہے اور بعض شعراء نے بھی اسے ابن عشرین کہا ہے۔

ذہانت اور شاعری کا اعلا فطری ذوق بخشا تھا۔ اگر اس کی عمر وفا کرتی، تو شاید وہ دورِ جاہلی کے ممتاز ترین طبقۂ اولیٰ کے شعراء میں شمار ہوتا۔ رواۃ کہتے ہیں کہ اس نے بچپنے سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور بیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اس میں استادانہ مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس کی ذہانت اور زبان دانی میں استادانہ حیثیت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن عمرو بن ہند کے دربار میں اس کے ہمعصر شاعر المسیب بن علس نے قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے۔

وقد اتلافی الھم عند احتضارہ   بناج علیہ الصعیریۃ مکدم

تو طرفہ نے کہا کہ کیا خوب اونٹ کو اونٹنی بنا دیا۔ یہ اس وجہ سے کہ صیعریہ اونٹنیوں کی نشانی ہے۔ اونٹ کی نہیں۔ اس پر مسیب اس سے بہت خفا ہوا اور بولا کہ اس کی زبان ایک دن اس کی جان لے کر رہے گی۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ ہوا بھی یہی۔

اس کے قدرت کلام کی بہترین مثال اس کا وہ شہرۂ آفاق معلقہ ہے جس میں ایک سو پانچ شعر ہیں۔ (۱) اور ان میں سے ۳۵ اشعار صرف اس کی اونٹنی کی تعریف میں ہیں۔ اس کا یہ معلقہ پرگوئی، دقتِ فکر و نظر اور رفعتِ تخیل اور ندرتِ تشبیہ اور نزاکتِ وصف کی ایسی مثال ہے جس کی نظیر کسی جاہلی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ اس کے ساتھ معنی کی گہرائی، پیرایۂ بیان کی گیرائی اور حکمت و فلسفہ کی چاشنی نے اس کے معلقہ کو دورِ جاہلی کے معجزنما کلام کی حیثیت دے دی ہے اور جہاں تک وصف کا تعلق ہے تو طرفہ کا اس صنف میں مشکل سے کوئی ہمسر ملے گا۔ اس میں حقیقت کے ساتھ قابلِ فہم مبالغہ کی چاشنی اور معنی کو رازوروں پردہ بنا کر پیش کرنے کی صنعت نے بڑی جان ڈال دی ہے۔ اس موقع پر بعض جگہ ترکیب میں تعقید اور الفاظ میں ثقل اور معانی میں گھماؤ یا الجھاؤ کا احساس ہوتا ہے لیکن ندرتِ تخیل اور رفعتِ پرواز کا لطف اس بے مزگی کو دھو دیتا ہے۔

طرفہ کا معلقہ

طرفہ سے منسوب شاعری کا جتنا ذخیرہ ہم تک پہنچ سکا ہے اس میں سب سے زیادہ صحیح قابلِ اعتبار اور اس کی فنی مہارت کا آئینہ دار اس کا معلقہ ہے۔(۲) خیال یہ ہے کہ اس نے اپنا یہ معلقہ اس زمانہ میں کہا تھا جب باپ کے مرنے کے بعد عزیز و اقارب کے ظلم اور زیادتی سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ کر اس

۱۔ اشعار کی تعداد کے بارے میں رواۃ میں سخت اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک سو پانچ سے لے کر بروایت ابو زید محمد القرشی، جمھرۃ اشعار العرب۔ ۱۱۳ شعر ہیں۔ (۲) طرفہ کی طرف اس معلقہ کے علاوہ دوسرے قصیدے اور اشعار بھی منسوب کئے جاتے ہیں۔

نے ہر قید و بند سے آزاد زندگی گزارنی شروع کی ہے اور اس کے نتیجہ میں جب سب پیسے ختم ہو گئے تو پھر اپنی قوم کے پاس قلاش اور مفلس ہو کر واپس آیا ہے۔ اس زمانے میں غالباً یہ واقعہ پیش آیا کہ اس کے بھائی معبد کے کچھ اونٹ گم ہو گئے اور بہت تلاش و جستجو کے بعد بھی نہ ملے تو خیال ہوا کہ شاید کوئی قبیلہ انہیں ہنکالے گیا ہے۔ چنانچہ طرفہ اپنے چچازاد بھائی مالک کے پاس گیا کہ اونٹوں کی تلاش اور ان کے واپس لانے میں اس کے بھائی کی مدد کرے لیکن اس نے اسے جھڑک دیا اور یہ کہہ کر بھگا دیا کہ "فرطت فیھا ثم اقبلت تتعب فی طلبھا" پہلے تو تم نے ان کی طرف سے لاپرواہی برتی اور اب جب سب کھو گئے تو بلا وجہ ان کی تلاش اور جستجو میں پریشان ہونے کے لیے آ گئے ہو۔ یہ بات اس کو بہت بری لگی اور جذبات میں ہیجان برپا ہو گیا۔ اور نتیجہ کے طور پر اس نے یہ معلقہ کہا۔

معلقہ کا موضوع اس کی اپنی ذات اور زندگی سے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے۔ اور نیکی بدی طلذت کوشی کے متعلق اس کا فلسفہ ہے۔ اس میں نہ کسی کی تعریف ہے اور نہ غزل بحیثیت فن۔ شروع میں جو غزلیہ اشعار ہیں وہ دستور کے مطابق محض تشبیب ہے۔ ورنہ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں چنانچہ اپنی محبوبہ خولہ کے دیار کے ذکر سے اس کا آغاز کرتا ہے۔ مطلع ہے:

لخولۃ أطلال ببرقۃ ثھمد تلوح کباقی الوشم فی ظاھر الید
وقوفاً بھا صحبی علی مطیھم یقولون لا تھلک أسی وتجلد

مطلع فراق سے شروع ہوتا ہے۔ کہتا ہے ـــــ ثہمد کی کنکریلی زمین میں پائے جانے والے میری محبوبہ کے گھر کے نشانات باوجود زمانہ گزر جانے کے ابھی تک اس طرح چمک رہے ہیں جس طرح ہاتھ کے اوپر مٹتے ہوئے گدنے کے نشانات ہوں۔

اس جگہ میرے دوست میرے پاس اپنی سواریاں روک کر مجھ سے کہتے ہیں کہ ذرا صبر سے کام لو۔ اس طرح اپنے آپ کو ہلکان نہ کر ڈالو۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا وہ اپنی قوم کے ساتھ خلیج فارس کے علاقے میں جہاں موجیں مارتا سمندر اور اس میں تیرتی کشتیاں اور ان کے ناخدا اور ملاح تھے پلا بڑھا تھا۔ چنانچہ اس کے ماحول کا عکس اس کے معلقہ میں بھی پوری طرح ملتا ہے۔ اس نے اپنی محبوبہ خولہ کی سواری کی تشبیہ کشتی سے دی ہے اور اپنی اونٹنی کی چال اور کبھی کبھی بھٹک جانے کی مثال اس کشتی سے دی ہے جس کا ملاح راستہ بھول کر کبھی ادھر جائے اور کبھی ادھر۔ اور اس طرح وہ اس مضمون میں شعرائے جاہلیت میں منفرد ہے۔ کہتا ہے۔

كان حدوج المالكية غدوة[1]	خلايا سفين بالنواصف من دد
عدولية أو من سفين ابن يامن	يجور بها الملاح طورًا و يهتدى
يشق حباب الماء حيزوم بها	كما قسم الترب المفايل[2] باليد

یعنی فراق کی صبح کو میری معشوقہ کی سواری جو قبیلہ بنو مالک سے تعلق رکھتی ہے وادی ددمیں[1] طرح دکھائی دے رہی تھی جیسے کہ بڑے بڑے جہاز ہوں یعنی جن اونٹوں پر بیٹھ کر محبوبہ جا رہی تھی وہ اتنے دیو پیکر ہیں کہ دیکھنے میں بڑے جہاز معلوم ہوتے ہیں۔

یہ جہاز یا تو قبیلہ عدولی کے یا ابن یامن کے معلوم ہوتے ہیں کہ جنھیں کبھی ملاح بھٹک کر اس سمت لے کر جاتا ہے اور کبھی دوسری طرف کو تاکہ راستہ مختصر ہو جائے۔

یہ ملاح ان جہازوں کے سینوں سے پانی کو اس طرح بیچ سے کاٹتا ہے جس طرح اس کھیل میں ریت کو نصف سے بانٹ دیتے ہیں جس میں کوئی چھلہ ریت میں چھپا دیتے ہیں پھر اس ریت کو دو حصہ کر کے چھلہ کو ڈھونڈھتے ہیں۔

خولہ کے ناقہ کے وصف کے بعد اپنے ناقہ کا وصف شروع کرتا ہے اور اس میں اس قدر تطویل سے کام لیتا ہے کہ اس کے ہر ہر عضو کی تفصیل سے تشریح کرتا ہے اور ایسی ایسی تشبیہیں لاتا ہے جن کی مثال مشکل سے ملے گی۔ چنانچہ اس کی چوڑی ہڈیوں کی تشبیہ اران کے تختوں سے دیتا ہے۔ اران وہ تابوت کہلاتا تھا جس میں عرب اپنے بزرگوں، سرداروں اور جلیل القدر ہستیوں کی لاشوں کو لے جاتے تھے۔ اسی طرح اس کی دم کے بالوں کی تشبیہ اس گدھ کے بازوؤں سے دیتا ہے جس کی سیاہی میں سفیدی جھلکتی ہے۔ اور اس کی رانوں اور رکھڑے ہونے پر محراب نما جو شکل بنتی ہے اس کی تشبیہ ایک عظیم الشان محل کے دروازے سے دیتا ہے۔ اس کے قد و قامت کی بلندی کی تشبیہ رومی پل سے دیتا ہے اور اٹھی ہوئی گردن کی اس کشتی کے مستول سے جو دریائے دجلہ میں چل رہی ہو۔ چنانچہ کہتا ہے کہ اس کی رانیں ایسی ہیں جیسے عظیم الشان محل کے دو دروازے۔

---

(۱) اشارہ خولہ کے قبیلہ بنو مالک کی طرف ہے جو قبیلہ کلب کی ایک شاخ ہے۔

(۲) فایل۔ یفایل ۔ یہ ایک کھیل تھا۔ اس میں ریت کے ایک ڈھیر میں کوئی چھلہ یا انگوٹھی چھپا دیتے تھے پھر اس ڈھیر کو دو برابر حصوں میں بانٹ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ بوجھو چھلہ یا انگوٹھی کس ڈھیر میں ہے۔ جو بتا دیتا سو وہ جیت جاتا (الزوزنی)

لها فخذان أكمل النحض فيهما   كأنهما بابا منيف ممرد

اور لمبی گردن جیسے مستول۔

وأتلع نهاض إذا صعدت به   كسكان بوصى بدجلة مصعد

اور اسی طرح ۲۸ اشعار میں اس کے انگ انگ کا سراپا بڑے دلکش انداز میں کھینچتا ہے۔[1] اس کے بعد اصل مطلب پر آتا ہے۔ اور اپنی ذات اور اپنی صفات پر فخر کرتا ہے اور اس کے ساتھ زندگی سے متعلق اپنا فلسفہ اور نظریہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب کوئی یہ آواز لگاتا ہے کہ ہے کوئی جیالا نوجوان تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ وہ مجھ ہی کو پکار رہا ہے۔ تو پھر میں نہ کاہلی کرتا ہوں اور نہ تذبذب کرتا ہوں۔ کیونکہ میں ایک شیر دل نوجوان ہوں۔

إذا القوم قالوا من فتى خلت أنني   عنيت، فلم أكسل ولم أتبلد

شجاعت و بہادری کے اوصاف کے ساتھ وہ سخی داتا بھی ہے۔ اور ایسا زیرک و عقلمند کہ لوگ اس سے مشورہ لیتے ہیں۔ پھر حسب نسب میں بھی عالی مقام۔

ولست بحلال التلاع مخافة   ولكن متى يسترفد القوم أرفد

وإن تبغني في حلقة القوم تلقني   وإن تقتنصني في الحوانيت تصطد

متى تأتني أصبحك كأسا روية   وإن كنت منها غانيا فاغن وازدد

وإن يلتق الحي الجميع تلاقني   إلى ذروة البيت الرفيع المصمد

یعنی۔ اور میں کھلانے پلانے کے ڈر سے ٹیلوں پر نہیں بھاگ جاتا۔ بلکہ جب لوگ مصیبت میں مجھ مانگتے ہیں تو میں ان کی مدد کو دوڑتا ہوں۔

اگر تم (محترم اور معزز شخصیتوں) لوگوں کی انجمن میں مجھے ڈھونڈو گے تو میں تمہیں وہاں ملوں گا

---

(۱) ڈاکٹر طہٰ حسین نے اپنی کتاب ـــ حدیث الاربعاء۔ جلد اول۔ صفحہ ۵۹ پر ناقہ کے اس وصف کا جو اثر عام طور پر ہوتا ہے اس کا بہت دلکش منظر کھینچا ہے۔ اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کی غرابت الفاظ اور تعقید، غموض اور ابہام اس بات کی دلیل ہے کہ اس قصیدہ میں اس وصف کو بعد میں بڑھا دیا گیا ہے۔ درحقیقت اسے طرفہ نے کہا نہیں ہے کیونکہ طرفہ نے اپنے رائیہ قصیدہ میں بھی اپنی اونٹنی کی تعریف کی ہے لیکن دو تین شعر سے زیادہ نہیں کہا ہے۔ اور وہ بھی ایسا ہے کہ پڑھ کر لطف آتا ہے۔ اسی طرح اس معلقہ میں بھی صرف دو تین ہی شعر ناقہ کے وصف میں کہہ تے

دیسی میں اتنا معزز اور محترم ہوں اتنا سمجھدار اور معاملہ فہم ہوں کہ سرداران قوم کی محفلوں میں شریک ہوتا ہوں) (اور اتنا زندہ دل خوش باش نوجوان ہوں کہ) اگر تم شراب خانوں میں میری تلاش کرو تو میں تمہیں وہاں بھی مل جاؤں گا۔ اور جب تم مجھ سے ملنے کے لیے آؤ گے تو میں تمہارا استقبال ایک چھلکتے جام سے کروں گا۔ اور اگر تمہیں اس کی ضرورت نہ بھی ہوگی تو (کوئی ہرج نہیں) تم اس سے مستغنی رہو بلکہ خدا تمہیں اور زیادہ دے۔

اور اگر مختلف قبیلے اپنے اپنے فضائل بیان کرنے کے لیے کسی جگہ جمع ہوں تو تم دیکھو گے کہ میں شریف اور لوگوں کو پناہ دینے والے گھرانے کی چوٹی سے تعلق رکھتا ہوں یعنی ایسے ملجا اخلاق قبیلوں میں بھی سب سے اونچے قبیلہ کا میں ایک فرد ہوں۔"[1]

مذکورہ بالا اشعار میں طرفہ نے اپنا پورا تعارف بے کم وکاست کرایا ہے۔ یہ نقشہ اس بدوی نوجوان کا ہے جو صاف دل، پاک خیال، بلند اخلاق، بہادر جری اور سخی داتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ زندگی اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا جانتا ہے۔ لیکن اعتدال، وقار اور شرافت کے ساتھ اسے اپنے فرائض کا پورا احساس ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی قوم اس پر بھروسہ کرتی ہے اسی لیے مصیبت کے وقت وہ اسے بلائے یا نہ بلائے اسے اس کے کام آنا ہے۔ لہذا وہ بغیر سستی اور کاہلی کیے ایسے موقعوں پر دوڑ پڑتا ہے۔ پھر جب امن وامان کا زمانہ آتا ہے تو محتاجوں اور فقیروں کو خوب کھلاتا پلاتا ہے۔ مانگنے والوں سے منہ چرا کر چھپ نہیں جاتا۔ اور اگر کوئی گمبھیر موقع ہوتا ہے اور سرداران قوم مل جل کر اس سلسلہ میں کوئی مشورہ کرتے ہوتے ہیں تو وہ بھی اس مجلس میں پورا شریک ہوتا ہے۔ اس سے اس کی اصابت رائے۔ معاملہ فہمی اور عزت ووقار کا اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود کم سن ہونے کے وہ بزرگوں اور سن رسیدہ لوگوں کے ساتھ مجلس مشاورت میں شریک ہوتا ہے جب وہ اپنی قوم اور غیروں کے حقوق پورے پورے ادا کرتا ہے تو پھر اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نفس کا بھی حق ادا کرے۔ چنانچہ وہ شراب خانوں کی زینت بنتا ہے۔ لیکن تنہا خوری اس کی عادت نہیں۔ اس کے ساتھ اس کے ہمجولی، بے فکرے لیکن نکھرے نوجوان بھی ہیں۔ اگر کوئی اس مجلس رندان باصفا میں آجائے تو ایک چھلکتا جام اسے بھی پیش کرتا ہے، اور کہتا ہے۔ پیو! جام لنڈھا کر پینا ہی زندگی ہے۔ اپنے پائے جانے کی جگہوں کی نشاندہی کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ اگر تم لوگوں سے پوچھ کر میرے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ میں شریف خاندانوں میں سب سے اونچے خاندان کا فرد ہوں۔

اس کے بعد شراب کے اپنے ساتھیوں اور اپنی مطرب دلنواز کا بڑے خوبصورت انداز سے ذکر کرتا ہے جس میں بتاتا ہے کہ اس کے ندیم کوئی گرے پڑے اوباش نوجوان نہیں ہیں۔ بلکہ شریف گھرانوں کے شریف نوجوان ہیں۔ جن کے چہرے ستاروں کی طرح دمکتے ہیں۔ یہ لوگ یہ شراب رندی و بدمستی کی خاطر نہیں پیتے بلکہ زندگی کو پر لطف بنانے کے لیے۔ اسی لیے شائستہ انداز سے پیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مغنیہ سامعہ نواز بھی ہے جس کی آواز میں بڑا رس بڑی موسیقیت اور بڑا سوز ہے جس کا حسن بڑا نکھرا، جسم بڑا گداز اور اس پر بڑی دلنواز اور ہر وقت مائل بہ کرم رہتی ہے۔ غرض بدیما حسن وجمال کا دلفریب پیکر ہے۔

ندامای بیض کالنجوم وقینة ... تروح علینا بین برد ومجسد

رحیب قطاب الجیب منها رقیقة ... بجس الندامی بضة المتجرد

إذا نحن قلنا أسمعینا انبرت لنا ... علی رسلها مطروفة لم تشدد

إذا رجعت فی صوتها خلت صوتها ... تجاوب أظآر علی رُبع ردی

اس کے بعد شراب وکباب اور عیش ومستی میں بے دریغ پیسہ خرچ کرنے کا ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ لوگوں نے بغیر مجھے سمجھے صرف اس عادت کی وجہ سے کس طرح قطع تعلق کرکے خاندان سے اس طرح الگ کردیا جیسے خارش زدہ اونٹ کو گلے سے الگ کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کو جواب دیتا ہے جو اس طرز زندگی کے مخالف ہیں۔ اور ان سے کہتا ہے کہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس میں کھالی لو، عیش وعشرت کرلو کہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

مازال تشرابی الخمور ولذتی ... وبیعی وإنفاقی طریفی ومتلدی

الی أن تحامتنی العشیرة کلها ... وأفردت إفراد البعیر المعبد

اس کے بعد زندگی کے متعلق اپنا نظریہ اور فلسفہ بتاتا ہے کہ میرے لیے حاصل زندگی مندرجہ ذیل تین چیزیں ہیں۔

ایک شراب، دوسری کمزور بے کس اور ڈرے ہوئے آدمی کی مدد کرنا اور تیسری یہ کہ جب پانی برس رہا ہو موسم سہانا اور خوشگوار ہو تو پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانہ میں چلی۔"

۔ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

(۱) ان اشعار کا ڈاکٹر طہٰ حسین نے جو تجزیہ کیا ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ ملاحظہ کیجئے: حدیث الاربعاء جلد اول۔ صفحہ ۶۰۔

ولولا ثلاث من عيشة الفتى / وجدّك لم أحفل متى قام عُوّدی

فمنهن سبقی العاذلات بشربة / کمیت متى ما تعل بالماء تزبد

وکری إذا نادى المضاف مجنبا / کسید الغضا نبهته المتورد

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب / ببهکنة تحت الخباء المعمد

پھر دوسروں کو نصیحت کرتا ہے کہتا ہے کہ بلا وجہ بخل سے کام لے کر لطف زندگی سے محروم رہتے ہو۔ موت تو بخیل اور سخی دونوں کو آنی ہے۔ پھر کیوں دو روزہ زندگی میں تکلیف اٹھائیے۔ پھر کتنے بلیغ انداز میں تشبیہ دیتا ہے کہ مرنے کے بعد بخیل اور سخی دونوں مٹی کے ڈھیر کے نیچے ہوں گے دیکھنے والے یہ نہ جان سکیں گے کہ ان میں سے بخیل کون تھا اور سخی کون۔ اس لیے کیوں بخل کیجئے۔

اری قبر نحام بخیل بماله / کقبر غوی فی البطالة مفسد

تری جثوتین من تراب علیهما / صفائح صم من صفیح منضد

ألا أیها الزاجری أحضر الوغی / وأن أشهد اللذات هل أنت مخلدی

فان کنت لا تستطیع دفع منیتی / فدعنی أبادرها بما ملکت یدی

یعنی اے وہ شخص جو مجھے جنگ میں شریک ہونے اور زندگی کی لذتوں سے لطف لینے سے روکتا ہے کیا تو مجھے حیات جاوداں بخش سکتا ہے۔ تو جب یہ حالت ہے کہ تو میری موت کو دور نہیں کر سکتا تو پھر مجھے عیش و عشرت کی زندگی اپنے مال و دولت سے گزار لینے دے کہ اس خشک اور بے روح اور ظالم زندگی سے جب دنیا وی عیش و آرام اور لذائذ چھین لیے جائیں تو پھر جینے کا کیا مقصد ؟

جام شراب اور جمال شباب دوست / یہ دور تا ابد نہ سہی عمر بھر تو ہو

اس کے بعد ایک بڑے پتے کی بات کہتا ہے۔ زندگی اس خزانہ کی طرح ہے جو ہر رات گھٹتا جاتا ہے۔ مگر زمانہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ اس کو فنا نہیں۔ پھر قسم کھاتا ہے کہ اگر کوئی نوجوان موت سے بچا بھی رہتا ہے تو اس کی مثال اس رسی کی سی ہے جسے ڈھیل دے دی گئی ہو لیکن اس کے سرے موت کے ہاتھ میں ہوں۔ اور جب چاہے اسے گھسیٹ کر ختم کر دے۔ اور وہ چوں نہ کر سکے کہ جو موت کی رسی سے بندھا ہو وہ بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔

أری الموت یعتام الکرام ویصطفی / عقیلة مال الفاحش المتشدد

أری العیش کنزاً ناقصاً کل لیلة / وما تنقص الایام والدهر ینفد

لعمرك إن الموت ما أخطى الفتى　　لكا لطّوَل المُرخى وثِنياه باليد

متى ما يشأ يوماً يقده لحتفه　　ومن يك فی حبل المنية ينقد

اس کے بعد بڑے دکھ درد سے عزیز و اقارب کی زیادتی کا شکوہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی ایذا رسانیوں کی تکلیف تیز تلوار کی ضرب کاری سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور سخت ہوتی ہے۔ اس شعر میں اپنے چچازاد بھائی سے خفگی کا اظہار کرتا ہے جس نے اس کے بھائی معبد کے اونٹوں کو دشمنوں سے نہیں بچایا تھا۔

وظلم ذوی القربی أشد مضاضة　　على المرء من وقع الحسام المهند

لیکن وہ ان باتوں سے ہمت نہیں ہارتا اور نہ مایوس ہوتا ہے۔ بلکہ فخریہ کہتا ہے کہ میں بہت پھرتیلا تیز آدمی ہوں اور ہمیشہ اپنی تیز تلوار کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہوں یعنی اتنا بہادر ہوں کہ کبھی بھی تلوار کو اپنے سے جدا نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے اپنی اور دوسرے مدد مانگنے والوں کی مدد کرتا ہوں۔

اور زہیر ابن ابی سلمی کی طرح معلقہ کو حکمت و فلسفہ کی باتوں پر ختم کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ موت لوگوں کے لیے گھاٹ کی طرح سے ہے۔ ہر ایک کو اس پر جانا پڑتا ہے۔ آج ایک آدمی بچ گیا تو کل مر جائے گا۔ اور آج و کل کے درمیان فاصلہ ہی کتنا ہے۔ پھر زمانہ جن چیزوں کو تم نہیں جانتے ہو خود ہی تمہیں بتا دے گا۔ اور تمہیں خود بخود حقیقتوں کا علم ہو جائے گا۔

ستبدی لك الأيام ما كنت جاهلا　　ويأتيك بالاخبار من لم تزود

ويأتيك بالأنباء من لم تبع له　　بتاتا ولم تضرب له وقت موعد

طرفہ کا مذکورہ بالا شعر عربی ادب میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لاکھ چھپاؤ بات کھل کر رہے گی۔ حقیقت چھپائے نہیں چھپتی۔ "جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے"۔

طرفہ کا یہ قصیدہ عرب کے خوش باش و بے فکر اور عیش و عشرت اور شراب و کباب کے رسیا نوجوانوں کی زندگی کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ جو مال و متاع کو عیش کوشی، شراب و کباب کی نذر کر دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے کیونکہ موت سب کے لیے برحق ہے۔ جب یہ صورت ہے تو پھر رو رو کے جینے سے کیا فائدہ۔

لفظی اور معنوی اعتبار سے چونکہ اس میں ایسے نئے معانی اور ایسے نئے تجربوں کا ذکر ہے جو اس سے پہلے نہیں ملتے۔ اسی کے ساتھ اسلوب بیان کی دلکشی اور اثر آفرینی میں بھی اس کو امتیازی شان

حاصل ہے۔ اسی لیے اس قصیدہ کو بہترین قصائد میں شمار کیا جاتا ہے البتہ اپنی اونٹنی کی تعریف میں جس طویل اور دقت نظری کا اظہار کیا ہے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں اکتا دینے والی طوالت کے علاوہ بڑا ابہام اور تعقید معنوی پیدا ہو گئی ہے۔

معلقہ کے علاوہ طرفہ کی طرف چند اور ایسے قصیدے منسوب کیے جاتے ہیں جن میں ایک کا مطلع ہے:

أصحوت اليوم أم شاقتك هر ومن الحب جنون مستعر

یعنی آج تم اپنے ہوش و حواس میں ہو یا اب بھی ہرہ نے تمہیں اپنا مشتاق بنا رکھا ہے سچ ہے محبت بھسم کر دینے والے جنون کا نام ہے۔

ایک دوسرا قصیدہ بھی جس کے متعلق بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس کا نہیں ہے۔ اس کا مطلع ہے:

سائلوعنا الذی یعرفنا بخزاز یوم تحلاق اللمم

ہماری بہادری اور شجاعت کے بارے میں ان لوگوں سے پوچھو جو ہمیں جانتے ہیں کہ خزازی کی جنگ میں لمبی زلفیں تک کاٹ دی گئی تھیں (اس جنگ میں اس کے قبیلہ بکر نے تغلب پر فتح پائی تھی اور وہ اسی پر فخر کرتا ہے)

طرفہ کے بہت سے اشعار ضرب المثل کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں جن کے ذکر کرنے کی یہاں گنجائش نہیں

یہ تھا طرفہ اور اس کا کلام۔ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اپنی کم عمری کے باوجود اس نے شعر و شاعری میں اس کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے کہ بڑے شعراء بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ اسی لیے اس کو عربی ادب میں "ابن العشرین" یعنی بیس سال کی عمر کا نوجوان کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اس کے اس شعر سے "بعیدا غدا ما اقرب الیوم من غد۔ سے ایک موقع پر مثال پیش کی تھی۔ اس کا کلام اور اس کی شخصیت بڑی پر زور، فکر انگیز اور عربی فکر و ذہن کی آئینہ دار ہے۔ بقول طہ حسین۔ " یہ شخصیت ایک ایسے انسان کا نقشہ اور تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس نے غور و فکر سے کام لیا ہو مگر اسے کامیابی نہ ہوئی ہو" اسی لیے وہ اپنے رنج اور مایوسی اور زندگی کی لذتوں کی طرف میلان رکھنے میں حق بجانب تھا۔ (1)

---

(1) (فی الادب الجاہلی) ڈاکٹر طہ حسین

حوالہ جات :۔ (۱) طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی (اس نے صرف دو شعر ذکر کئے ہیں)۔ صفحہ ۱۱۰ ۔ (۲) الشعر والشعراء ۔ لابن قتیبہ ۔ (۳) البیان والتبیین للجاحظ جلد اول ، دوم چہارم ۔ جاحظ نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں کہا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمرؓ کے سامنے طرفہ کا وہ شعر پڑھا جس میں کہتا ہے کہ ۔" فلولا ثلاث ھن من عیشۃ الفتی ۔ الخ تو آپ نے فرمایا کہ لولا أن أسیر فی سبیل اللہ ۔ وأضع جبھتی للہ وأجالس أقواما ینتقون أطایب الحدیث الخ (صفحہ ۱۹۰ ج دوم) ۔ (۴) جمھرۃ اشعار العرب لابی زید محمد الخطاب القرشی ۔ (۵) المعلقات العشر وأخبار قائلیھا لاحمد بن أمین الشنقیطی ۔ (۶) شرح المعلقات السبع للزوزنی ۔ (۷) دیوان طرفہ ۔ (۸) تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ۔ جرجی زیدان جلد اول ۔ (۹) تاریخ الادب العربی ۔ احمد حسن الزیات ۔ (۱۰) الوسیط فی ادب العربی ۔ احمد الاسکندری ۔ (۱۱) المفصل فی تاریخ الادب العربی ۔ أحمد الاسکندری وغیرہ (۱۲) حدیث الأربعاء اول (۱۳) فی الأدب الجاھلی ۔ ڈاکٹر طہ حسین ۔ (۱۴) الوصف (سلسلۃ فنون الادب العربی) ۔ (۱۵) تطور الغزل بین الجاھلیۃ والاسلام ۔ الدکتور شکری فیصل (ڈاکٹر فیصل نے اپنی اس کتاب میں طرفہ بن العبد کے محبوبہ کے دیار پر وقوف ۔ محبوب کے سراپا اور وصف ، کوچ اور سفر سے متعلق اشعار کا بڑا پر مغز اور جامع تجزیہ کیا ہے ۔ اور ساتھ ہی ان اصناف میں دوسروں کے ساتھ اس کا موازنہ بھی کیا ہے ۔ دیکھئے ۔ صفحہ ۲۱ ۔ ۴۳ ۔ ۱۳۳)

۷۔ عَمرو بن کُلثوم التغلبی

م ۵۲ قبل ہجرت ۵۷۰ء

عمرو نام۔ کنیت ابو الأسود۔ باپ کا نام کلثوم بن مالک تھا۔[1] عمرو بن کلثوم قبیلہ تغلب کا شاعر، بہادر شہسوار اور نامور سردار تھا۔ اس کی طاقت اور عرب قبایل پر اس کی ہیبت اور رعب کا یہ عالم تھا کہ اسے "فَتَّاکُ العَرَبْ" یعنی شیرِ عرب" کہتے تھے۔ اس کا باپ بھی اپنی قوم کا سردار رہ چکا تھا اور قیادت و سیادت اور شان و شوکت میں ضرب المثل تھا۔ اسی طرح اس کی ماں لیلیٰ بھی بڑے باپ یعنی مُہَلْہَل بن ربیعہ کی بیٹی اور کُلَیْب وائل، عربوں میں سب سے معزز اور پرہیبت اور باوقار سردار کی بھتیجی اور کلثوم بن عتاب جیسے نامور شہسوار کی بیوی تھی۔ یہ وہی مہلہل ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے شاعری کی ابتدا کی تھی۔ غرض کہ عمرو بن کلثوم ماں اور باپ دونوں طرف سے عرب کے ممتاز مشہور طاقتور اور با اثر قبیلہ کا فرد تھا۔

قبیلۂ تغلب جزیرۂ عرب میں رہتا تھا۔ اور قبائل عرب میں اپنی طاقت و سطوت شان و شکوہ اور عزت و سیادت میں نہ صرف ممتاز و مشہور تھا بلکہ سارے قبایل پر اس کی اتنی دھاک جمی ہوئی تھی کہ لوگ کہتے تھے کہ "لو أبطأ الاسلام لأكلت بنو تغلب الناس" یعنی اگر اسلام آنے میں ذرا اور دیر کر دیتا تو بنو تغلب لوگوں کو ہڑپ کر جاتے۔[2]

عمرو بن کلثوم نے اس شاہانہ اور شان و شکوہ کے ماحول میں پرورش پائی اور بہادری، اولوالعزمی، اور علم و فضل میں وہ کمال حاصل کیا کہ پندرہ برس کی عمر ہی میں قبیلہ کا سردار چن لیا گیا

---

(۱) پورا سلسلہ نسب یوں ہے۔ عمرو بن کلثوم بن مالک بن عتاب بن سعد بن زہیر بن جشم بن بکر بن حبیب بن عمرو بن غنم بن تغلب بن وائل۔

(۲) یعنی سب پر چھا جاتے۔

عمرو نے مختلف جنگوں اور معرکوں میں اپنے قبیلے قیادت کرکے، اپنی شجاعت ہمت اور سمجھ بوجھ کے سہارے مشکل ترین معرکوں کو سر کرکے اپنی اور اپنے قبیلے کا سکہ سارے عرب میں بٹھا دیا ان صفات کے ساتھ قدرت نے اسے ایسی قادر الکلامی اور ایسا ذہن رسا اور ایسی طبع موزوں عطا کی تھی کہ اپنے زمانہ کا نامور مقرر اور صرف ایک قصیدہ کی بدولت فخریہ شاعری کا امام بن کر چمکا۔

عمرو بن کلثوم کے اپنے قبیلہ تغلب اور اس کی دوسری شاخ بکر بن وائل کے درمیان مدتوں سے اس منحوس لڑائی کا سلسلہ چلا آرہا تھا جسے "حرب البسوس" کہتے ہیں (1) اس لڑائی میں دونوں طرف سے سینکڑوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ آخر میں حیرہ کے بادشاہ المنذر بن ماء السماء کی کوششوں سے دونوں قبیلوں میں صلح ہوگئی۔ المنذر نے دونوں قبیلوں میں سے کچھ غلام بطور ضمانت کے اپنے پاس رکھ لیے تھے کہ اگر کسی نے معاہدہ توڑا تو پہل کرنے والے قبیلے کے غلاموں کو مظلوم قبیلہ کو تاوان میں دے دیا جائے گا۔ المنذر بن ماء السماء کے بعد اس کا بیٹا عمرو بن ہند تخت پر بیٹھا اور اس نے بھی اپنے باپ کی ریت نباہی۔ ایک دفعہ عمرو بن ہند نے دونوں قبیلوں کے ان غلاموں کو کسی کام سے قبیلہ طئی کے پہاڑوں میں بھیجا۔ یہ غلام بنو شیبان کے — جو قبیلہ بکر کی ایک شاخ تھی۔ کنویں پر اترے اور انھوں نے مل کر بنو تغلب کے غلاموں کو بھگا دیا۔ یہ بیچارے صحرا میں پانی کے بغیر پیاسے مر گئے۔ اس خبر کا پھیلنا تھا کہ بنو تغلب میں آگ لگ گئی اور انھوں نے بکریوں سے خون بہا دینے کا مطالبہ کیا۔ اس پر بات بڑھ گئی اور معاملہ عمرو بن ہند کے سامنے پیش ہوا۔ چنانچہ بنو تغلب کی طرف سے عمرو بن کلثوم اور بنو بکر کی طرف سے ان کا مشہور شاعر الحارث بن حلزہ الیشکری نمائندہ بن کر گئے۔ اور دونوں نے اپنے اور اپنی قوم کے کارنامے گنا کر فخر کرنا شروع کیا۔ اس موقع پر الحارث بن حلزہ نے فی البدیہ یا پناوہ فخریہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

آذنتنا ببینہا اسماء   رب ثاوٍ یمل منہ الثواء

یعنی اسماء نے اپنی جدائی کی خبر ہمیں سنا دی۔ بسا اوقات مقیم آدمی سے اقامت خود ہی اکتا جاتی ہے۔

جس میں اپنے اور اپنی قوم پر فخر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ الحارث بن حلزہ کے برص کے داغ تھے چنانچہ عمرو بن ہند

---

(1) حرب بسوس کے لیے ملاحظہ کیجئے اس کتاب کا صفحہ ۲۴۳

نے اسے دو رسات پردوں کے پیچھے بٹھادیا اور کہا کہ وہاں سے اپنا قصیدہ سناؤ۔ کیونکہ برص والے کو دیکھنا یا پاس بیٹھنے کو عرب مضر سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب حارث نے اپنا قصیدہ شروع کیا اور جوں جوں آگے بڑھتا گیا بادشاہ متاثر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے پردے اٹھواتا گیا اور آخر میں قصیدہ اتنا پسند آیا کہ اس کو اپنے پاس بٹھالیا۔ اور جب پورا سن چکا تو اس کی ساری ہمدردیاں بکریوں کی طرف ہوگئیں۔ حالانکہ اس سے قبل وہ تغلبیوں کی طرف مائل رہتا تھا یہ بات عمرو بن کلثوم کو بہت بری لگی اور وہاں سے واپس آکر اس نے اپنا وہ شہرۂ آفاق معلقہ کہا جس کا مطلع ہے

أَلا هبی بصحنك فاصبحینا ولا تبقی خمور الأندرینا

اے محبوبہ اپنا جام شراب لے کر اٹھ اور صبح سویرے ہمیں شراب پلا اور اندرین کے بہترین شراب کو بچا کر مت رکھ۔

بعض تذکرہ نگاروں اور نقادوں کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا قصیدہ کی شان نزول یہ ہے کہ الحارث بن حلزہ کے واقعہ کے بعد عمرو بن کلثوم غصہ میں بھرا ہوا اپنے وطن واپس آیا ہے تو عمرو بن ہند نے اپنے ہمنشینوں سے پوچھا کہ عرب میں وہ کون شخص ہے جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے سے انکار کر دے گی۔ درباریوں نے کہا کہ ہمیں اس کا تو علم نہیں البتہ عمرو بن کلثوم کی ماں لیلی وہ عورت ضرور ہے جو آپ کی ماں کی خدمت کرنے سے صاف انکار کر دے گی۔ کیونکہ اس کا باپ مہلہل بن ربیعہ اور اس کا چچا کلیب وائل ہے جو عرب کی معزز ترین شخصیتیں تھیں پھر اس کا شوہر عرب کا مشہور شہسوار کلثوم بن عتاب تھا۔ اور اس کا بیٹا عمرو بن کلثوم ہے جو اپنی قوم کا سردار ہے۔ (۱)

چنانچہ عمرو بن ہند نے عمرو بن کلثوم کے پاس پیغام بھیجا کہ ایک دن میری ضیافت قبول کرو اور اپنی ماں کو میری ماں سے ملانے کے لیے ساتھ لاؤ۔ عمرو بن کلثوم نے حیرہ کے بادشاہ کی یہ دعوت قبول کر لی اور اپنا لاؤ لشکر لے کر اپنی ماں کی معیت میں ملنے کے لیے روانہ ہوا۔ ادھر عمرو بن ہند کو

۱۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ "ولیلی بنت مہلہل ام عمرو بن کلثوم (وھی) بنت اخی فاطمہ بنت ربیعہ ام امری القیس اور عمرو بن ہند کی ماں "ہند" کے بارے میں بیان کیا ہے کہ "وھند ام عمرو بن ہند عمۃ امری القیس" الشعر والشعراء صفحہ ۱۱۸)

جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس کے اعزاز و اکرام کی خاطر حیرہ سے فرات تک زنانہ اور مردانہ خیمے لگوا دیئے اور شاہانہ تکلف سے انھیں سجادیا۔ اور اس کی پیشوائی کے لیے امراء روساء اور آس پاس کے سرداروں اور شیوخ کو بھی جمع کر لیا۔ ادھر اپنی ماں سے کہدیا کہ اندر جب دسترخوان لگ جائے تو نوکروں کو اشارہ سے ذرا دور ہٹا دینا اور پھر عمرو بن کلثوم کی ماں سے کسی کام کی فرمائش کرنا۔ چنانچہ جب عمرو بن کلثوم اپنے آدمیوں کی معیت میں اور اس کی ماں اپنے خواصوں کے ساتھ عمرو بن ہند کے یہاں پہنچے ہیں تو اس نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور خود عمرو کو لے کر شاہی خیمہ میں لے گیا۔ اور اس کی ماں عمرو کی ماں کو زنانہ خیمہ میں لے گئی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دسترخوان چن دیا گیا۔ حسب پروگرام عین موقع پر سارے ملازمین غائب ہوگئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عمرو بن ہند کی ماں نے عمرو بن کلثوم کی ماں لیلا سے کہا کہ بہن ذرا وہ پلیٹ اٹھا دینا۔ لیلا نے کہا کہ جس کو ضرورت ہے وہ خود ہی کیوں نہ لے لے۔ لیکن جب عمرو بن ہند کی ماں نے ذرا تیزی اور اصرار سے پلیٹ اٹھانے کو کہا تو وہ برداشت نہ کر سکی اور زور سے چلائی۔ ہائے یہ ذلت . . . کہاں ہو اے تغلبیو۔ یہ آواز جب عمرو بن کلثوم کے کان میں پڑی تو غصہ سے اس کا منہ لال ہوگیا۔ عمرو بن ہند نے موقع کی نزاکتوں کو تاڑ لیا۔ لیکن جب تک وہ کچھ سوچ سکے عمرو بن کلثوم نے خیمہ میں ٹنگی عمرو بن ہند کی تلوار اٹھالی اور اسی سے اس کی گردن ماردی۔ اور اپنے آدمیوں کو حکم دیدیا کہ سب کچھ لوٹ لو۔ چنانچہ ان لوگوں نے سارا قیمتی ساز و سامان لوٹ لیا اور خوشی کے شادیانے بجاتے اپنے جزیرہ کو واپس آگئے۔ وطن واپس آکر عمرو بن کلثوم نے وہ قصیدہ کہا جو اس کے معلقہ کے نام سے مشہور ہے۔ جس کا مطلع اوپر بیان ہوا ــــ اس معلقہ میں اس نے عمرو بن ہند کے ساتھ اپنی بات چیت کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اپنے قبیلہ کی طرف سے بدگمان ہونے اور ذلیل سمجھنے کی وجہ پوچھی ہے۔ اور اپنے قبیلہ کی جنگوں، ان کے کارناموں، اپنی بہادری، شجاعت اور اولوالعزمی کا ذکر کر کے بے انتہا فخر کیا ہے۔ معلقہ کو مکمل کرنے کے بعد سوق عکاظ میں اس کو بڑے فخریہ انداز سے سنایا اور اس سال حاصل شاعری سمجھا گیا۔ بنو تغلب نے اس قصیدے کو زبانی یاد کر لیا اور قومی ترانے کی طرح ہر گلی کوچے میں اس کو گاتے پھرتے تھے۔ چنانچہ قبیلہ بکر کے ایک شاعر نے چڑھ کر اس کے متعلق یہ شعر کہہ ڈالے۔

الھی بنی تغلب عن جل أمرھم   قصیدة قالھا عمرو بن کلثوم

یفاخرون بھا مذ کان أولھم   یاللرجال لشعر غیر مسئوم

بنو تغلب کو عمرو بن کلثوم کے ایک قصیدہ نے اتنا مگن کر دیا ہے کہ اب وہ اپنے سارے کام کاج چھوڑ

اسی کے ہو کے رہ گئے ہیں (ہر وقت) اس قصیدے کی بدولت اب وہ اپنے پرکھوں پر فخر کرتے رہتے ہیں۔ ذرا لوگو دیکھنا اس شعر کو کہ جس سے جی ہی نہیں اکتاتا۔

معلقہ عمرو بن کلثوم

عمرو بن کلثوم دورِ جاہلی کے ان شعراء میں سے ہے جنہیں صرف ایک قصیدہ کی وجہ سے شہرتِ دوام حاصل ہو گئی۔ اس قصیدہ میں ۱۰۶ اشعار ہیں اور اس کا موضوع اپنے اور اپنے بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرنا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ عمرو بن کلثوم کا یہ معلقہ درحقیقت دو مختلف زمانوں اور دو مختلف موقعوں پر کہا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ تو اس وقت کہا گیا ہے جب بنو تغلب اور بنو بکر عمرو بن ہند کے پاس غلاموں کے واقعہ کے بعد فیصلے کے لیے گئے ہیں۔ اور اس نے بظاہر بنو بکر کا ساتھ دیا ہے اور دوسرا حصہ اس واقعہ کی یادگار ہے جس میں عمرو بن ہند نے عمرو بن کلثوم کو ذلیل کرنے کے خیال سے اس کی ماں سے اپنی ماں کے ذریعہ کام کروانے کی ترکیب چلی تھی اور جس کے نتیجہ میں عمرو بن کلثوم نے اسے قتل کر دیا تھا۔

اس قصیدے کو اس نے دورِ جاہلی کے شعراء کی عادت اور رواج کے خلاف تشبیب کے بجائے ساغر و ساقی کے ذکر سے شروع کیا ہے۔ چنانچہ مطلع میں ساقی کو مخاطب کر کے جو اس کی محبوبہ بھی ہے کہتا ہے کہ اے ساقی گلفام صراحی اٹھا اور صبح کو اندرین کی بہترین شراب کے ساغر بھر بھر کے دے اور آج خست سے کام نہ لے۔ اس کے بعد اس شراب کی خوبیوں کا ذکر کرتا ہے کہ وہ اتنی تیز ہے کہ جب پانی ملایا جاتا ہے تو گرم ہو جاتی ہے اور اتنے مزے کی ہے کہ کنجوس مکھی چوس بھی اس کی خاطر اپنا مال بے دریغ خرچ کر دیتا ہے اور ایسی تیز کہ بڑے بڑے دل پھینک سخت خو لوگ بھی صرف اس کو چکھ کر ہی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ شراب و ساقی کے ذکر کے بعد غزل کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ اے محبوبہ جدا ہونے سے پہلے ذرا ٹھہرنا ہم تمہیں یقینی بات بتا دیں اور تم ہمیں۔

قفی قبل التفرق یا ظعینا   نخبرک الیقین وتخبرینا

اس کے بعد اپنی محبوبہ کا سراپا اس طرح کھینچتا ہے کہ اس کے انگ انگ کی تصویر اتار کر رکھ دیتا ہے۔ اور مفاتن جسمانی کی تشبیہ دینے میں نازک خیالی کے ساتھ بڑی حقیقت بینی سے کام لیتا ہے۔ اس کے بعد معلقہ کے اصل موضوع یعنی فخر کی طرف آتا ہے۔

معلقہ کے فخریہ حصہ کو غور سے پڑھا جائے تو صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ دو مختلف موقعوں پر کہا گیا ہے۔ چنانچہ شروع کا حصہ صاف بتاتا ہے کہ یہ عمرو بن ہند کے دربار میں الحارث بن حلزہ اور عمرو بن کلثوم کے درمیان منافرت کے بعد کی یادگار ہے۔ چنانچہ عمرو بن ہند کو مخاطب

کرکے کہتا ہے کہ۔

أبا هند فلا تعجل علينا وانظرنا نخبرك اليقينا

بأنا نورد الرايات بيضا ونصدرهن حمراً قد روينا

یعنی اے ابو ہند ذرا دھیرج دھرو۔ جلد بازی سے کام نہ لو۔ ہمیں تھوڑی دیر مہلت دو تو ہم تمہیں صحیح بات بتادیں کہ ہم اپنے جھنڈوں کو جب میدان جنگ میں لے جاتے ہیں۔ تو وہ سفید ہوتے ہیں لیکن جب وہاں سے واپس لاتے ہیں تو وہ دشمنوں کے خون سے سیراب ہو کر لال ہوتے ہیں۔

اس کے بعد اپنے بزرگوں کے کارناموں اور جنگوں میں ان کی بہادری اور شجاعت اور بادشاہوں سے بھی نبرد آزمائی کرنے کے واقعات کو گنتا ہے پھر اپنے قبیلہ کی جودوسخا اور مہمان نوازی اور اپنی طاقت وسطوت کا بڑی تعلی سے اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قبیلہ معد جانتا ہے کہ ہمیں یہ عزت وشرف اپنے پرکھوں سے ورثہ میں ملا ہے۔ اور اس کی خاطر ہم اپنے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں یہاں تک کہ یہ عزت وشرف کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

ورثنا المجد قد علمت معد نطاعن دونه حتى يبينا

پھر اپنے قبیلے کی قتل وغارت گری کی شدت کو بیان کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ خبردار اگر کسی نے ہم سے جہالت برتی تو ہم اس سے بھی بڑھ کر جہالت برتیں گے۔

ألا لا يجهلن أحد علينا فنجهل فوق جهل الجاهلينا

اس کے بعد معلقہ کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ اسے اس نے عمرو بن ہند کو قتل کرنے کے بعد کہا ہے۔

بأي مشيئة عمرو بن هند تطيع بنا الوشاة وتزدرينا

بأي مشيئة عمرو بن هند نكون لقيلكم فيها قطينا

تهددنا وتوعدنا رويداً متى كنا لامك مقتوينا

فإن قناتنا يا عمرو أعيت على الأعداء قبلك أن تلينا

یعنی آخر ہم نے وہ کون سا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے اے عمرو بن ہند تم چغل خوروں کی بات مان کر ہمیں ذلیل وخوار سمجھتے ہو۔ پھر ہم کس گناہ کی پاداش میں تمہارے ماتحت سرداروں کی چاکری کرتے رہا کریں۔ بلاوجہ ہمیں ڈراتے دھمکاتے ہو۔ ذرا نرمی سے کام لو۔ ہم کب تمہاری ماں کے نوکر رہے

ہیں۔ اے عمرو ہمارے نیزے اتنے مضبوط ہیں کہ تم سے قبل جو ہمارے دشمن تھے ان کے سامنے بھی وہ نرم نہ پڑے۔ (عرب نیزوں سے عزت مراد لیتے تھے) یعنی تم سے پہلے ہمارے کتنے دشمن گزرے ہیں جو ہمیں بے عزت نہ کر سکے تو تمہاری کیا حیثیت ہے۔

اس کے بعد اپنے آباد اجداد پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ علقمہ بن سیف، مہلہل اور زہیر، عتاب، کلثوم، کلیب وائل جیسے اولوالعزم شریف بہادر سرداروں کے ہم وارث ہیں۔ ہمارا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟

ونحن غداة أوقد في خزاز   رفدنا فوق رفد الرافدينا

وكنا الأيمنين إذا التقينا   وكان الأيسرين بنو أبينا

فصالوا صولة فيمن يليهم   وصلنا صولة فيمن يلينا

فآبوا بالنهاب وبالسبايا   وابنا بالملوك مصفدينا

یعنی جب بنی نزار اور یمنیوں میں جنگ برپا ہوئی تو ہم نے بنی نزار کی دل و جان سے مدد کی اور جب دشمنوں کے مقابلہ میں ہم نکلے، تو میمنہ ہم نے سنبھالا اور ہمارے بھائی (یعنی بنو بکر) نے میسرہ سنبھالا تو وہ لوگ اپنے سے قریب غنیم پر حملہ آور ہوئے اور ہم اپنے سے قریب دشمن پر۔ وہ لوگ یعنی بنو بکر مال غنیمت اور لونڈیاں لے کر واپس آئے اور ہم بادشاہوں کو قید کر کے پابجولاں لائے ـــــ اس کے بعد اپنے بھائیوں بنو بکر سے مخاطب ہو کر ان سے کہتا ہے کہ ہم سے خواہ مخواہ مت جھگڑو۔ تم تو ہماری بہادری اور جنگی کارناموں کو اچھی طرح سے جانتے ہو۔ پھر اپنی عورتوں کی بہادری، عفت اور حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے۔ اور آخر میں فخر اور اپنی قوم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے کہتا ہے کہ ہماری تعداد تو اتنی ہے کہ زمین میں ہمارے آدمی نہیں سما پاتے اور سمندروں میں ہمارے جہاز نہیں آپاتے۔ یہی نہیں بلکہ دنیا اور اس میں بسنے والے سب ہمارے مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ اور جس پر جس وقت چاہتے ہیں ہم اپنا ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ اور آخری شعر میں تو فخر کی انتہا کر دی ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارے رعب و دبدبہ اور ہیبت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے بچے جب ماں کا دودھ چھوڑتے ہیں تو اسی عمر سے ان کے سامنے بڑے بڑے جابر اور سرکش سبھی لوگ سجدے کرنے لگتے ہیں۔

ملأنا البر حتى ضاق عنا   وماء البحر نملأه سفينا

لنا الدنيا ومن أمسى عليها   ونبطش حين نبطش قادرينا

إذا بلغ الفطام لنا صبيٌّ　　تخرّ له الجبابر ساجدينا

خصوصیات کلام

عمرو بن کلثوم۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بسیار گو شاعروں میں سے نہیں ہے۔ اگرچہ راویوں نے اس کی طرف اس معلقہ کے علاوہ کچھ اور اشعار بھی منسوب کئے ہیں لیکن فن شاعری میں شہرت اور قادر الکلامی میں ناموری اور عزت اس کو صرف اس کے اس معلقہ سے ملی ہے۔ اس کے معلقہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمرو بن کلثوم کو موقع محل کے لحاظ سے مناسب الفاظ کو انتخاب کر کے اس طرح نظم کرنے میں ملکہ تامہ حاصل تھا کہ معنی صاف اور واضح طریقہ سے ذہن میں آجائیں۔ اسلوب بیان بڑا پیارا اور طرز ادا بڑا دلنشیں اور موثر ہے۔ جہاں تک فخر، اپنی اور اپنی قوم کی تعریف اور ان پر ناز کرنے کا سوال ہے تو اس میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ ایسے موقعوں پر عام طور سے بڑے مبالغہ سے کام لیتا ہے اور زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ لیکن انداز اتنا دلکش ہوتا ہے اور کلام میں اتنی سلاست اور روانی ہوتی ہے کہ طبیعت پر نہ بار ہوتا ہے اور نہ ذوق پر گراں گذرتا ہے۔

اپنی قوم کی تعریف میں مندرجہ ذیل اشعار بھی عمرو بن کلثوم سے منسوب کئے جاتے ہیں۔[1]

معاذ الإله أن تنوح نساؤنا　　على هالك أو أن نضج من القتل

قراع السيوف بالسيوف أحلنا　　بأرض براح ذي إراك وذي أثل

فما أبقت الأيام مِلمال[2] عندنا　　سوى جذم أذواد محذفة النسل

یعنی نہ ہماری عورتیں کسی مرنے والے کا نوحہ کرتی ہیں اور نہ ہم قتل کے خیال سے روتے دھوتے ہیں مستقل تلوار بازی کرتے رہنے کی وجہ سے ہمیں سنسان اور چٹیل زمینوں میں جہاں صرف اراک اور اثل کے درخت اگتے ہیں رہنا پڑتا ہے اور ہمارے پاس مال میں صرف چند اونٹ رہ گئے ہیں جن کے بڑھنے کی بھی امید نہیں رہ گئی ہے۔

ابو حجر الغسانی کو دھمکی دیتے ہوئے یوں کہتا ہے:

ألا فاعلم أبيت اللعن إنا　　على عمد سنأتي ما نريد

تعلم أن محملنا ثقيل　　وأن زياد كبتنا شديد

وإنا ليس حي من معد　　يوازننا إذا لبس الحديد

---

۱. حماسہ۔ ابو تمام صفحہ ۶۶۔ مطبوعہ قاسمی دیوبند۔　۲۔ ململ یعنی من المال

یعنی تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہم جو کرنا چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں گے، اور یہ بھی جان لو کہ ہماری سواریاں بہت بھاری ہیں اور یہ کہ ہماری جماعت کی مدافعت کرنا آسان نہیں ہے اور جب ہم ہتھیاروں سے لیس ہو کر تیار ہو جائیں تو پھر معد کا کوئی قبیلہ بھی ہم سے ہمسری کا دعوی نہیں کر سکتا۔

کہتے ہیں کہ عمرو بن کلثوم نے بڑی لمبی عمر پائی اور ڈیڑھ سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ "یا بنی قد بلغت من العمر مالم یبلغه أحد من آبائی۔ ولا بد لی أن ینزل بی ما نزل بهم من الموت۔ الخ" یعنی اے میرے بیٹو۔ میری عمر اتنی لمبی ہوئی کہ میرے آباؤ اجداد میں سے کسی کو اتنی نہ ملی۔ اور یہ ضرور ہے کہ جس طرح وہ موت سے نہ بچ سکے میں بھی نہ بچوں۔۔۔۔۔۔(1) اس کے بعد انھیں چند بہت ہی قیمتی اور مفید نصیحتیں کی ہیں جو خوشگوار اور بے داغ زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بات کی طرف اشارہ کر دیا جائے وہ یہ کہ بعض اہل نظر نقادوں نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ دیگر جاہلی شعراء کے کلام کی طرح عمرو بن کلثوم کے کلام میں بھی بہت زیادہ من گھڑت اور وضع کردہ اشعار بڑھا دیئے گئے ہیں۔ عمرو بن کلثوم کے مذکورہ معلقہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات کم از کم اس کے کلام کی حد تک قطعی طور پر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ معلقہ کا مطالعہ کرنے والا جیسے ذرا سا بھی جاہلی شاعری، اس کے اسلوب بیان۔ اس کے الفاظ اور اس کی تراکیب استعمال کا اندازہ اور علم ہے خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے، کیونکہ بقول طہ حسین " اس کے اس قصیدے میں ایسے آسان اور ہلکے پھلکے الفاظ ہیں کہ ہمارے زمانہ میں اگر کسی کو تھوڑا بہت بھی عربی زبان کا علم ہے، اسے سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی مگر عرب تو چھٹی صدی عیسوی کے نصف اور اسلام کے ظاہر ہونے سے تقریباً نصف صدی پہلے تک ایسی زبان ہرگز نہیں بولتے تھے۔ اسی طرح (قبیلہ) ربیعہ بھی۔ اور خاص طور سے اس زمانہ میں جبکہ (قبیلہ) مضر کی زبان کو سیادت ابھی حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ وہ شعر کی زبان بن سکی تھی (معلقہ جیسی) زبان بولتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ الاخطل التغلبی بھی (اموی دور کا شہرہ آفاق شاعر) جو اموی دور میں گزرا ہے یعنی عمرو بن کلثوم کے تقریباً ایک صدی بعد، یہ زبان نہ بولتا تھا" واقعی عمرو کے اس معلقہ میں بعض حصے ایسے ہیں

1۔ پوری تفصیل کے لیے دیکھئے۔ المعلقات العشر واخبار قائلیہا۔ احمد بن الامین الشنقیطی۔ الطبعۃ الثانیہ مطبوعہ مصر۔ سنہ ۱۳۳۱ھ

جو کسی طرح بھی جاہلی شاعری کے انداز بیان پر نہیں ہیں وہ اتنے آسان، اتنے سیدھے سادے اور بعض جگہ اتنے رکیک اور بعض جگہ اس قدر مبالغہ آمیز ہیں کہ جاہلی شاعری کا ذوق انہیں ہرگز قبول نہیں کرتا۔ ایسے حصوں میں خاص طور سے یہ حصے قابل ذکر ہیں۔

ونحن التارکون لما سخطنا　　ونحن الأخذون لما رضینا

سے لے کر بعد کے چار پانچ شعر۔ اسی طرح اس حصہ میں یہ اشعار:

وقد علم القبائل من معد　　إذا قبب بأبطحها بنینا

سے — ونشرب إن وردنا الماء صفواً　　ویشرب غیرنا کدرا وطینا

تک۔ اور یہ حصہ —

إذا ما الملك سام الناس خسفًا　　أبینا أن نقر الذل فینا

سے معلقہ کے آخری شعر یعنی۔

إذا بلغ الفطام لنا صبی　　تخر له الجبابر ساجدینا　　تک۔

معلقہ عمرو بن کلثوم کے ان ٹکڑوں کو پڑھ کر واقعی یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کے اشعار نہیں ہو سکتے۔ جس زمانہ میں بھاری بھرکم موٹے اور ثقیل الفاظ استعمال کرنے کا رواج تھا۔ ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جاہلی دور کے نہیں بلکہ اسلامی دور کے کسی بہت ہی معمولی شاعر نے کہے ہیں اور اس کے نام سے منسوب کر دیئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جاہلی شعرا کے کلام میں حشو و زیادتی کا عمل ہوا ہے۔ بعض موقعوں پر سیاسی قبائلی اور معاشرتی اغراض کے ماتحت اور بعض موقعوں پر محض تفنن طبع اور قدرت زبان و بیان دکھانے کی خاطر ایسے اشعار کی گہرے مطالعہ اور تحقیق و جستجو کرنے کے بعد نشاندہی کی جا سکتی ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ بہر حال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان شعرا کے کلام میں اسلامی دور میں بہت کچھ بڑھایا گیا ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

حوالہ جات — ۱۔ الأغانی ج۔ ۱۹　　۲۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی: اس نے عمرو کو شعرائے جاہلیہ کے چھٹے طبقہ میں شمار کیا ہے اور اس کے معلقہ کا صرف پہلا شعر نقل کیا ہے۔ صف ۱۲۷۔

۳۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔

۴۔ جمهرة أشعار العرب: ابوزید محمد القرشی۔ محمد القرشی نے جمہرہ میں بروایت ابو عمرو بن العلا لکھا ہے کہ

بقیہ حاشیہ

عمرو بن کلثوم نے عمرو بن ہند کے دربار میں اپنا یہ شعر پڑھا۔

وإني لأمضي الهم عند احتضاره بناج عليه الصيرية مكدم

تو طرفہ نے کہا کہ۔ "اونٹ کو اونٹنی بنا دیا" حالانکہ یہ شعر "المسیب بن العلس" کا ہے عمرو کا نہیں کیونکہ صحیح معنوں میں طرفہ کا ہمعصر مسیب تھا عمرو بن کلثوم نہیں۔ طرفہ عمرو بن کلثوم سے ۲۰ سال پہلے ہی مر چکا تھا اور اگرچہ زندگی کے ایک حصہ میں دونوں معاصر رہے لیکن کسی جگہ ایک ساتھ رہنے یا کسی موقع پر ایک ساتھ ہونے کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا ہے اور نہ ہی کسی نے مذکورہ شعر کو اس سے منسوب کیا ہے اس لیے جمہرہ کی مذکورہ روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ مزید تفصیل کے لیے طرفہ کے حالات ملاحظہ کیجیے۔

۵۔ المعلقات العشر واخبار قائليها۔ احمد بن الامين الشنقيطي۔

۶۔ شرح المعلقات السبع للزوزني تحقيق علی حمد اللہ مطبوعہ دمشق

۷۔ تطور الغزل بين الجاهلية والإسلام۔ دکتور شکری فیصل۔

۸۔ تاریخ آداب اللغة العربية۔ جرجی زیدان۔ جلد اول۔

۹۔ في الأدب الجاهلي۔ ڈاکٹر طہ حسین۔

۱۰۔ دیوان الحماسه۔ ابو تمام

۱۱ تاریخ الأدب العربي۔ احمد حسن الزيات۔

۸۔ الحارث بن حِلّزَہ الیَشکُری

م۔ ۵۲ قبل ہجرت۔ ۵۷۰/۵۶۰ء (۱)

نام الحارث اور کنیت ابوظلیم تھی۔(۱) حلزہ قبیلہ بکر کا شاعر تھا۔ اس کو بھی اصحاب معلقات میں شمار کیا جاتا ہے۔۔ اس نے بھی عمرو بن کلثوم اور طرفہ بن العبد کی طرح صرف ایک قصیدہ کی بدولت شہرت دوام حاصل کی۔ فی البدیہہ شعر کہنے اور فخر و حماسہ کے مضامین میں ممتاز شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اپنے قبیلہ بکر بن وائل میں اس کی وہی حیثیت تھی جو عمرو بن کلثوم کو قبیلہ تغلب میں حاصل تھی۔ معلقہ کے علاوہ اس کی طرف دوسرے بہت سے اشعار بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔

معلقہ کہنے کا سبب

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے بنو بکر اور بنو تغلب آپس میں بھائی بھائی تھے لیکن ان کے درمیان عرصہ سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اور اس کی وجہ سے دونوں قبیلوں میں اس منحوس لڑائی کا سلسلہ جاری تھا جسے "حرب البسوس" کہتے ہیں۔ حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کے باپ المنذر بن ماء السماء نے بڑی مشکل سے ان دونوں قبیلوں میں صلح کرائی تھی۔ اور ہر قبیلہ سے سو سو غلام بطور ضمانت کے لیے تھے۔ کہ اگر کسی قبیلہ نے ظلم و زیادتی کی تو مظلوم قبیلہ کو ظالم قبیلہ کے غلام دے دیئے جائیں گے۔ منذر کا بیٹا عمرو بن ہند جب تخت پر بیٹھا تو اس نے بھی باپ کے عہد و پیمان کو برقرار رکھا۔ یہ ضمانتی غلام عمرو بن ہند

---

(۱) سن وفات میں بہت اختلاف ہے۔ ۵۴۰ء سے لے کر ۵۸۰ء تک کی تاریخیں آتی ہیں۔

حِلِّزَة: ح مہملہ زیر کے ساتھ۔ اور "ل" مشددہ کے نیچے بھی زیر۔ لغوی معنی ایک کیڑا۔ اُلّو کو بھی کہتے ہیں۔ مذکر بغیر "ۃ" کے آتا ہے۔ مثل ہے امرأۃ حلزۃ یعنی پستہ قد عورت۔ رجل حلز۔ بداخلاق آدمی۔ پورا سلسلۂ نسب یوں ہے: الحارث بن حلزہ بن مکروہ بن یزید بن عبداللہ بن مالک بن عبد بن سعد بن جشم بن عاصم بن ذبیان بن کنانہ بن یشکر بن بکر بن وائل۔

کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ عمرو نے ان غلاموں کو ایک مہم پر روانہ کیا۔ بنوشیبان کے ایک کنویں پر پہنچ کر تغلبی غلاموں کو بکری غلاموں نے مار بھگایا۔ بیچارے بھوک، پیاس اور لوسے صحرا میں مرگئے اور بکر کے غلام بچے رہے۔ اس پر تغلبیوں کو شبہ ہوا کہ بکریوں نے جان بوجھ کر ہمارے غلاموں کو ایسی جگہ ڈھکیل دیا کہ جہاں پانی نہ ملے اور یہ پیاسے مرجائیں۔ چنانچہ انھوں نے ان غلاموں کا خون بہا مانگا جسے دینے سے بکریوں نے انکار کردیا۔ معاملہ عمرو بن ہند تک گیا۔ اس مقدمہ میں تغلبیوں کا وکیل عمرو بن کلثوم اور بکریوں کا النعمان بن ہرم تھا جو بنو ثعلبہ بن (غنم) بن یشکر کا فرد تھا۔ بادشاہ کے سامنے جب مقدمہ پیش ہوا تو اس میں النعمان بن ہرم نے کچھ جملے تہذیب سے گرے ہوئے کہہ دیئے۔ جن کی وجہ سے عمرو بن ہند بہت خفا ہوا۔ وہ پہلے ہی سے بنو تغلب کی طرف مائل تھا۔ نعمان کی اس بدتمیزی نے معاملہ اور بھی خراب کردیا۔ اور اب اس کا پورا خطرہ تھا کہ فیصلہ بنو تغلب کے حق میں ہو جائیگا۔ اتنے میں الحارث بن حلزہ جو اس موقعہ پر دربار میں موجود تھا کھڑا ہوا اور اس نے فی البدیہہ اپنا مشہور معلقہ کہنا شروع کیا جس کا مطلع ہے:

آذنتنا ببينها أسماء رب ثاو يمل منه الثواء

جس میں اپنی اور اپنے قوم کی تعریف و توصیف اور ان کے کارناموں پر فخر کیا ہے اور عمرو بن ہند کی تعریف کے ساتھ عمرو بن کلثوم کے دعووں کو بھی جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اغانی نے ابن الکلبی سے روایت کی ہے کہ الحارث بن حلزہ کے جسم پر برص کے داغ تھے اس لیے جب وہ پڑھنے کھڑا ہوا تو عمرو بن ہند نے اپنے سامنے (سات) پردے ڈلوا دیئے کیوں کہ وہ اس قسم کے بیماروں کو عربوں کی ریت کے مطابق دیکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ جب الحارث نے اپنا معلقہ پڑھنا شروع کیا تو عمرو بن ہند اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ایک ایک کرکے ساتوں پردے اٹھوا دیئے اور اس کو اپنے پاس بلاکر اپنے برابر بٹھالیا۔ اور جب وہ معلقہ ختم کرچکا تو اپنے ساتھ بٹھاکر کھانا کھلایا۔ اور اس کی بڑی آؤ بھگت کی[1]۔ عمرو بن ہند کے اس رویے سے عمرو بن کلثوم کے دل میں آگ لگ گئی اور وہ غصہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور اپنے معلقہ کا وہ حصہ کہا جس کی طرف اس کے تذکرہ میں اشارا کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ الحارث نے جس وقت یہ قصیدہ کہا ہے وہ بہت بوڑھا تھا اور بقول اصمعی

۱۔ اس قصہ کے سلسلہ میں اس کتاب کے صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجئے۔

کے اس وقت اس کی عمر ۱۳۵ سال کی ہو چکی تھی۔ بہر حال الحارث کے اس قصیدہ سے سارے عرب میں بکریوں کی دھوم مچ گئی اور ایک زمانے تک تغلبی دبے رہے۔ لیکن جب عمرو بن کلثوم نے اپنا مشہور معلقہ کہا تو دونوں کا پلڑا تقریباً برابر ہو گیا۔ اگرچہ بعض رواۃ کا خیال ہے کہ فخر میں مبالغہ کی وجہ سے عمرو بن کلثوم کے معلقہ کا جو اثر ہوا وہ الحارث کے معلقہ کا نہیں ہو سکا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عمرو بن کلثوم نے اپنے معلقہ میں اپنی اور اپنے قبیلہ کی تعریف اور ان کے کارناموں پر فخر کرنے میں اتنا مبالغہ برتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے مقابلہ میں الحارث نے اپنے معلقہ میں اپنی بزرگی، اپنی بڑائی، وقار اور حلم کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ اس نے عمرو بن کلثوم کا جواب بڑے متین اور سنجیدہ انداز میں دیا ہے۔ چبھتی ہوئی بات بھی بہت شیریں انداز میں کہی ہے۔ قبیلہ تغلب کے برے کاموں اور ان کی بری عادتوں کا ذکر پورے اخلاقی دائرہ میں رہ کر کرنے کے بعد بادشاہ کی تعریف شروع کی ہے اور بڑی چالاکی سے بادشاہ کو غیر شعوری طور پر اپنے قبیلہ کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں پوری طرح کامیاب ہوا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں بادشاہ نے تغلبیوں کے خلاف بکریوں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

کلام کی خصوصیات

الحارث نے بھی جاہلی شعرا کے دستور کے مطابق اپنا معلقہ تشبیب سے شروع کیا ہے اور آگے چل کر بنو تغلب کی برائیاں گنانے کے سلسلہ میں بہت سے ایام عرب اور دور جاہلیت کے بہت سے واقعات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا معلقہ ان واقعات اور جنگوں کی ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ نقادوں کا اتفاق ہے کہ الحارث کا یہ معلقہ فنی نقطۂ نظر سے بندش کی چستی، پیرایہ بیان کی صفائی، اغراض و معانی کی وضاحت اور متعدد فنون پر مشتمل ہونے کی وجہ سے "منفرد قصیدوں" میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اور الحارث کی قادر الکلامی اور موزونی طبع کا لوہا اس لیے بھی مانا جاتا ہے کہ اس نے یہ معلقہ ایک مجلس میں فی البدیہہ اور ارتجالاً کہا ہے۔ جس کی مثال دور جاہلیت میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اس قصیدے میں فخر کا جو حصہ ہے وہ رواۃ کے قول کے مطابق اتنا اونچا ہے کہ جس کی وجہ سے فخر میں حارث ضرب المثل بن گیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ " افخر من الحارث بن حلزہ" یعنی الحارث سے بڑھ کر کوئی فخر گو نہیں ہو سکتا۔

الحارث کے اس معلقہ میں زوزنی کی روایت کے مطابق ۸۲ شعر ہیں۔ معلقات کے بعض مجموعوں میں ۸۵ اشعار تک نقل کیے گئے ہیں۔ معلقہ کا مطلع ہے:

اذنتنا ببینها اسماء　　رب ثاوٍ یمل منه الثواء

یعنی اسماء نے ہمیں اپنے جدا ہونے کی ارادہ کی اطلاع کرادی ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پاس ٹھہرے ہوئے آدمی سے طبیعت اکتا جاتی ہے لیکن اسماء ان لوگوں میں سے نہیں ہے۔

اس کے بعد ذکر کرتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ کن کن جگہوں میں رہا ہے اور حسن وعشق کے کتنے حسین لمحات اس کے ساتھ گزارے ہیں۔ اور اب جبکہ فراق کی گھڑی آگئی ہے تو میں بھی اپنی تیز گام اونٹنی پر بیٹھ کر غم غلط کرنے کے لیے صحرا و بیاباں میں نکل جاؤں گا۔ اس اونٹنی کی چال اس تیز رو مادہ شتر مرغ کی سی ہے جس کے چھوٹے چھوٹے بچے گھونسلے میں اکیلے ہیں۔ یہ چگتے چگتے دور نکل آئی ہے اور اس کو یک بیک شکاری دکھائی دے پڑے ہیں۔ ادھر شام کا وقت قریب ہے۔ اس لیے وہ بہت تیزی سے اپنے بچوں کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ ایسی ہی تیزی سے میری اونٹنی بھی دوڑتی ہے۔

اس کے بعد جاہلی شعرا کی ریت کے مطابق اپنی اونٹنی کا وصف بیان کرنا شروع کرتا ہے:
غزل اور ناقہ کی تعریف کے بعد ۱۵ دیں شعر سے تغلب اور بنو بکر کے دعوی کا ذکر شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے پاس ایسی خبریں اور ایسے قصے پہنچے ہیں جن کو سن کر ہم کو بہت دکھ اور رنج ہوا ہے۔ ان سے پتہ چلا کہ بنو أراقم نے جو تغلب کی ایک شاخ ہے ہمارے قبیلہ کے لوگوں پر بڑی زیادتی کی ہے اور ہمارے خلاف بہت بری اور تکلیف دہ باتیں کہی ہیں اور اپنی اس تہمت تراشی میں بے گناہوں کو بھی لپیٹے ہوئے ہیں۔

أتانا من الحوادث والأنباء　　خطب نعنی بـه و نساء
إن إخواننا الأراقم یغلو　　ن علینا فی قیلهم إحفاء
یخلطون البریٔ منا بذی الذنـ　　ـب ولا ینفع الخلی الخلاء

اس کے بعد عمرو بن کلثوم کو جواب دیتا ہے اور اسی ضمن میں اس کا اظہار کرتا ہے کہ جس بادشاہ سے تم ہماری برائی کرتے ہو وہ کان کا کچا نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے کہا اس کو بغیر سوچے سمجھے مان کر ہمیں ذلیل و خوار سمجھنے لگے گا۔ بلکہ وہ ان الزاموں کی تحقیق کرے گا اور جب وہ جھوٹے ثابت ہونگے تو سوچو کہ کیا انجام ہوگا؟ اس کے بعد اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ تم سے پہلے لوگوں نے بھی ہماری اس طرح شکایتیں کی تھیں لیکن اس سے ہمارا کچھ نہ بگڑا بلکہ ہماری عزت اور وقعت حسب سابق بدستور قائم رہی۔

أيها الناطق المرقش عنا — عند عمرو وهل لذاك بقاء
لا تخلنا على غراتك إنا — قبل ما قد وشى بنا الأعداء
فبقينا على الشناءة تنمينا — حصون وعزة قعساء

پھر عمرو بن ہند۔ شاہ حیرہ کی تعریف شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے اپنے شاندار کارناموں اور بہادری و شجاعت کی وجہ سے لوگوں پر حکومت کی یہاں تک کہ المنذر بن ماء السماء بادشاہ ہوئے۔ یہ ایسے بادشاہ تھے کہ انھوں نے ساری مخلوق کو تابع فرمان کر لیا تھا اور عزت وفضل اور کمال میں اتنی ترقی کی کہ ان جیسا صاحب کمال وفضل پھر لوگوں میں پیدا نہ ہو سکا۔

فملكنا بذلك الناس حتى — ملك المنذر بن ماء السماء[1]
يملك اضرع البرية لا يوجد — فيها لما لديه كفاء

اس کے بعد اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ ہم بکریوں نے ملوک حیرہ کی مصیبت کے وقت ساتھ دیا تھا اور تم تغلبیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور اس طرح غیر شعوری طور پر بڑی چابکدستی سے عمرو بن ہند کے دل میں پرانی کدورت کو جگانے میں کامیاب ہو گیا۔ کہتا ہے کہ ہم نے تین موقعوں پر اس کی مدد کی ہے۔ اور پھر ان موقعوں کو ۴۹ ویں شعر سے گنا تا ہے۔

ايها الناطق المبلغ عنا — عند عمرو وهل لذاك إنتهاء
ملك مقسط وأفضل من يمشي — ومن دون ماالديه الثناء
من لنا عنده من الخير آيات — ثلاث في كلهن القضاء

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے الحارث کے اس معلقہ کی ایک تاریخی قیمت یہ ہے کہ اس میں عربوں کی بعض جنگوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جن سے ان کی واقعیت اور صحت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے ایک جگہ وہ ہے جہاں پر عمرو بن ہند کے باپ نے بنو بکر اور بنو تغلب کو جمع کر کے ان میں صلح کرائی تھی۔ اور ان سے ضمانت میں غلام لیے تھے۔ اس جگہ کا نام ذی المجاز ہے۔

واذكروا حلف ذي المجاز وما قدم — فيه العهود والكفلاء
حذر الجور والتعدي وهل ينقض — ما في المهارق الأهواء

فخر ومباہات اور وصف کے علاوہ اس معلقہ میں قبیلہ کے سفر کی تیاری کا جو نقشہ

۱۔ زوزنی نے اس شعر کو نہیں نقل کیا ہے۔

کھینچا ہے وہ دوسرے شاعروں کے یہاں بہت کم ملتا ہے۔ رات کو سفر کی بات طے ہوئی۔ صبح ہوتے ہوتے تیاری کا شور وغل برپا ہوگیا۔ کوئی کسی کو پکار رہا ہے۔ کہیں گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ اور انہیں کے درمیان کہیں اونٹ بلبلا رہے ہیں:

اجمعوا امرهم عشاء فلما   اصبحوا اصبحت لهم ضوضاء

من مناد ومن مجيب ومن تصهال   خيل خلال ذالك رغاء

المفضل (محمد بن الضبی) نے الحارث بن حلزہ کے دو مزید قصیدوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک کا مطلع ہے۔

لمن الديار عفون بالحبس   آیاتها كمهارق الفرس

یعنی "حبس" (جگہ کا نام) میں وہ گھر کس کے ہیں جو اب مٹ چکے ہیں۔ لیکن ان کی نشانیاں ابھی تک اسی طرح چمک رہی ہیں جیسے کہ ایرانیوں کے دبیز کاغذ پر تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔

یہ قصیدہ الحارث نے قیس بن شراحیل بن ہمام بن ذہل بن شیبان کی شان میں کہا تھا۔ اس میں ۱۴ شعر ہیں۔ مطلع سے لے کر تیسرے شعر تک جاہلی شعرا کی عادت کے مطابق "حبس" میں اپنی محبوبہ کی نگری کی ویرانی اور بربادی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اب یہاں بجائے میری مخبوبہ دلنواز کے نیل گایوں کے غول رہتے ہیں اور یہ نقشہ آنکھوں کے سامنے آتے ہی گزشتہ دنوں کی محبت اور پیار کی زندگی جو یہاں گزری تھی یاد آجاتی ہے۔ چنانچہ جاہلی شعرا کی ریت کے مطابق (۱) وہ دوستوں کے سمیت ٹھہر کر خوب غور سے دیار محبوبہ کو دیکھتا ہے اور تخیل و تصور کی آنکھوں سے بیتے ہوئے پر بہار دنوں سے لطف لیتا ہے اور خیالوں ہی خیالوں میں محبوبہ کا منتظر رہتا ہے۔

فحبست فيها الركب أحدس فى   كل الامور وكنت ذا حدس

مگر جب محبوبہ نہیں آتی، مایوسی چھا جاتی ہے تو اپنی تیز رفتار، قدآور اونٹنی کا سہارا لیتا ہے۔ مگر جاتا کہاں ہے، ممدوح کی طرف۔ اور یہاں سے گریز کر کے قیس بن شراحیل کی مدح شروع کرتا ہے۔

أفلا تعديها إلى ملك   شهم المقادة ماجد النفس

یعنی کیا تم اس اونٹنی کو ایک ایسے بادشاہ کی طرف نہ موڑو گے جو بڑا ذی شان، پر رعب اور دل کا پاکیزہ اور شریف النفس ہے۔ اور نویں شعر سے قیس کی تعریف شروع کرتا ہے اور

۱۔ جیسے امرؤ القیس کا قول ہے: وقوفا بها صحبى على مطيهم يقولون لا تهلك اسى وتجمل

(وطبع ص ۱۳)

کہتا ہے کہ وہ بڑا سخی داتا ہے وہ صرف دوہری بنی ہوئی زرہیں اور اصیل نسل کے تنومند گھوڑے ہی نہیں بخشتا بلکہ سونا چاندی اور خوبصورت لونڈیاں بھی انعام واکرام میں دیتا ہے۔ اور اس سے بالکل نہیں ڈرتا کہ اس طرح مال کو بے دریغ خرچ کرنے سے غریبی یا تنگ دستی آجائے گی اور یہیں پر قصیدہ ختم کر دیتا ہے۔

لا یرتجی للمال یہلکہ　　　سعد النجوم إلیہ کالنحس

فلہ ھنا لك لاعلیہ إذا　　　دنعت انوف القوم للتعس

مفضل نے ایک دوسرا قصیدہ بھی الحارث بن حلزہ کا نقل کیا ہے جس کا مطلع ہے۔

طرق الخیال ولا کلیلۃ مدلج　　　سدکا بأرحلنا ولم یتعرج

یعنی رات کی تنہائیوں میں محبوبہ کا خیال بغیر کسی روک ٹوک کے سیدھا میرے پاس پہنچ گیا اور مجھے اس پر سخت حیرت ہے کہ اس طرح اس کا خیال کیسے آگیا۔

اس کے بعد اپنی محبوبہ سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم تو بہت کمزور نازک اندام تھیں۔ آخر تم اس اندھیری رات میں سج جیسے دشوار گزار علاقوں کو طے کر کے میرے خیالوں میں کیسے آگئیں۔

أنی اھتدیت وکنت غیر رجیلۃ　　　والقوم قد قطعوا متان السجسج

اس قصیدہ میں کل دس شعر ہیں آخری دو شعروں میں اپنی محبوبہ کو مخاطب کر کے اپنی سخاوت اور اپنی مہمان نوازی پر فخر کر کے کہتا ہے کہ جب شدید سردی کا زمانہ ہوتا ہے اور قحط پڑا ہوتا ہے اور سردی سے بچانے کے خیال سے اونٹوں کو شام کے وقت جلدی سے باڑے میں لے آتے ہیں کہ ان کو پیٹ بھر چارا تو ملا نہیں کہیں سردی بھی نہ لگ جائے۔ ایسی بھوک مری کی حالت میں جبکہ اونٹنیوں کے تھن سوکھ چکے ہوتے ہیں ہم لوگ مہمان کی خاطر ان اونٹنیوں پر تیر کے ذریعے قرعہ ڈالتے ہیں اور جس اونٹنی کا نام نکلتا ہے اسے ذبح کر کے مہمانوں کو کھلا دیتے ہیں۔

وإذا اللقاح تروحت بعشیۃ　　　رتك النعام الی کنیف العرفج

الفیتنا للضیف خیر عمارۃ　　　ان لم یکن لبن فعطف المدمج

الحارث کا یہ آخر الذکر قصیدہ اس کی غزل اور فخر کا بہترین نمونہ ہے۔ رات کی تاریکیوں میں دبے پاؤں محبوبہ کے خیال کے آنے کا ذکر اور پھر اس ذکر سے اپنی محبوبہ کا مختصر سا سراپا کھینچ

قصیدہ ۲۵ دیوان المفضلیات صفحہ ۲۶۳

کا انداز بہت اچھوتا ہے۔ مہمان نوازی کی ریت عربوں کے یہاں عام ہے اور اپنے جانوروں کو ذبح کرکے مہمانوں کو کھلا دینا کوئی نئی بات نہیں لیکن الحارث اور اس کے قبیلہ کی مہمان نوازی کی شان بالکل نرالی ہے۔ یہ لوگ اپنی بہترین اونٹنیوں پر قرعہ ڈالتے ہیں اور جس کا نام نکل آتا ہے مہمانوں کے لیے ذبح کرکے ان کے گوشت سے ان کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اور یہ بڑی بات ہے کہ ان سخت حالات میں لے دے کے صرف اونٹ رہ گئے تھے مگر انھیں بھی مہمان پر قربان کردینے میں دریغ نہیں کرتے۔

ان اشعار کے علاوہ الحارث کی طرف کچھ اور شعر بھی منسوب کئے جاتے ہیں۔

الغرض الحارث بن حلزہ کا معلقہ جہاں اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ دشمن کو ایک بادشاہ کے سامنے کس طرح طلاقت لسانی، حکمت عملی اور شیریں زبانی سے زیر کیا جاسکتا ہے وہاں اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ الحارث نے اپنی لمبی عمر سے زندگی کے جو بہت سے سبق سیکھے تھے اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا تھا انھیں بھی کھول کر بیان کیا ہے۔ عمرو بن کلثوم کے کلام میں زور بیان اور اعلا قسم کا فخر تو ہے لیکن حکمت عملی، موقع شناسی کی شان نہیں ہے۔ اس لیے اسے الحارث کے مقابلہ میں زک اٹھانی پڑی۔ اسی طرح الحارث کے مذکورہ دونوں قصیدوں میں فخر، در غزل کے جو مضامین آئے ہیں اگرچہ وہ مختصر اور مجمل ہیں لیکن بڑے دل آویز اور موثر ہیں۔ اور اس کی قدرت زبان اور قادر الکلامی کی دلیل ہیں۔

کہتے ہیں کہ الحارث بن حلزہ نے ڈیڑھ سو سال کی عمر کو پہنچ کر انتقال کیا۔

حوالے :-

۱۔ الاغانی للاصفہانی ۱۷۷/۹ ۔ ۲۔ شرح القصائد العشر للشنقیطی

۳۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ ۔ ۴۔ شعراء النصرانیہ للشیخ یسوعی

۵۔ طبقات الشعراء لابن سلام الجمحی ۔ ۶۔ المفضلیات رقم ۲۵، ۶۲

۷۔ المعجم للمرزبانی ۔ ۸۔ فی الادب الجاہلی لطہ حسین

۹۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ۱۲۴/۱ ۔ ۱۰۔ الوسیط للاسکندری ص ۸۳

۱۱۔ تاریخ الادب العربی لاحمد حسن الزیات ص ۶۶ ۔ ۱۲۔ المفصل لاحمد الاسکندری وغیرہ ص ۶۶

اس کا دیوان عمرو بن کلثوم کے دیوان کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

اصحابُ المجمہرات

اصحاب المجمہرات میں عام طور سے چھ شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ عَبَیدُ ابن الأبرص : م ۵۵۵ء
۲۔ بِشر بن أبی خَازِم : م ۵۳۰ء
۳۔ أُمیة بن أبی الصَلت : م ۶۲۴/۹ھ
۴۔ عَدِی بن زَید بن حمّاد : م ۶۰۴ء
۵۔ خِدَاش بن زُہیر : م ۵۷۰ء
۶۔ النَمِر بن تَولب : ۵۴۵ء

ہم اس موقع پر ان میں سے صرف دو شاعروں کا ذکر کریں گے اور وہ ہیں :

۱۔ عبید بن الابرص
۲۔ أمیة بن أبی الصَلت

عَبید بن الأبرص

عبید بن الأبرص کو ابن سلام الجمحی نے "طبقات فحول الشعراء" میں جاہلی شعراء کے چوتھے طبقے میں شمار کیا ہے اور ابوزید القرشی نے "جمہرۃ اشعار العرب" میں اصحاب المجمہرات کے ضمن میں اسے پہلے نمبر پر ذکر کیا ہے اور یہیں سے ان لوگوں کی نظر میں اس کی جلالت قدر، اپنے ہمسر شعراء میں اس کی امتیازی شان اور شعر و شاعری کے اس خاص موضوع میں تفوق، مہارت اور چابکدستی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ عبید کا سلسلۂ نسب بنو اسد بن خزیمہ بن مدرکہ سے جا ملتا ہے۔ [1] جیسا کہ

پورا سلسلہ نسب یوں ہے ــ عبید بن الابرص بن جشم بن مالک بن الحرث بن سعد بن ثعلبہ بن دودان بن اسد بن خزیمہ بن مدرکہ۔

پہلے بیان ہو چکا ہے امرؤ القیس کے باپ حجر کی بنو اسد پر حکمرانی تھی - کہتے ہیں کہ حجر بہت سخت کوش اور ٹیکس وصول کرنے میں بڑا سخت اور برتاؤ کرنے میں بڑا سنگدل تھا۔ جس کی وجہ سے بنو اسد اس کے سخت مخالف اور اس کی جان کے دشمن تھے۔

عبید بن الابرص شروع میں حجر کے حاشیہ نشینوں میں تھا لیکن اس کی زیادتیوں کی وجہ سے وہ بھی آخر میں اس کا دشمن ہو گیا تھا - چنانچہ بنو اسد کی پہلی بغاوت میں جن قیدیوں کو حجر نے سیاسہ کے جیل میں قید کیا تھا ان میں عبید بن الابرص بھی تھا۔ جوں جوں حجر کی سختیاں بڑھتی گئیں اسی قدر بنو اسد کے غصہ، مخالفت اور ریشہ دوانیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور آخر کار ان لوگوں نے موقعہ پا کر اسے ایک دن قتل کر دیا۔

امرؤ القیس شروع سے آزاد اور بگڑا نوجوان تھا۔ چنانچہ وہ بنو اسد کی لڑکیوں پر بھی بری نظریں ڈالتا تھا۔ اس کی بدنگاہی، عیاشی اور آوارگی کی وجہ سے عبید بن الابرص شروع سے امرؤ القیس کا سخت مخالف رہا اور موقع پر اس کی کاٹ کرنے، اس کو رسوا و ذلیل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ (1)

کہتے ہیں کہ عبید کو بچپن میں شعر و شاعری سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے نتیجہ میں وہ باکمال شاعر بن گیا - ایک دفعہ وہ اپنی بہن ماویہ کے ساتھ اپنی بکریوں کا گلہ لے کر گھاٹ پر پانی پلانے کے لیے آیا۔ قبیلہ مالک کے ایک شخص نے اسے گھاٹ پر جانے سے روک دیا اور برا بھلا کہا۔ اس واقعہ سے ملول ہو کر وہ ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور اس کے قریب اس کی بہن بھی لیٹ گئی۔ اتنے میں مالک قبیلہ کا وہی آدمی وہاں سے گزرا اور اس نے ایک شعر پڑھا جس میں عبید کو اپنی بہن کے ساتھ تہمت لگائی۔ عبید نے اسے یہ شعر پڑھتے سن لیا۔ اسے اپنی بے کسی اور مظلومیت پر بڑا دکھ ہوا چنانچہ اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خداوندا اگر میں مظلوم ہوں تو اس مالکی کے مقابلہ میں میری مدد فرما اور مجھے غالب فرما۔ یہ کہہ کر پھر لیٹ گیا اور سو گیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک آدمی بالوں کا ایک گولا لے کر آیا اور اسے اس کے منہ میں ڈال کر کہا کہ اٹھو۔ چنانچہ عبید نیند سے بیدار ہوا تو اس کی زبان پر بنی مالک

1۔ عبید بن الابرص اور امرؤ القیس کی مخالفت کے قصوں کے لیے دیکھئے کتاب: الملک الضلیل، محمد فرید ابوحدید۔ مطبوعہ دارالمعارف و مکتبہا۔ مصر۔

کے متعلق یہ شعر تھا۔

أیا بنی الزینة ماغرکو   فلکم الویل بسربال حجر

اور اس کے بعد اس میں شاعری کا ایسا ملکہ پیدا ہو گیا کہ بنو اسد کا سب سے بڑا اور مشہور شاعر بن کر چمکا۔ اس نے ایک لمبا قصیدہ بھی کہا جس میں ۴۸ شعر تھے اس کا مطلع ہے۔ :

اقفر من أهله ملحوب   فالقطبیات فالذنوب

اس قصیدہ کو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ابوزید قرشی نے جمہرہ میں مجمہرات کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ اور صرف ۴۳ شعر دیئے ہیں اور مطلع کے طور پر اس شعر کو درج کیا ہے۔

عیناك دمعهما السروب   كأن شانیهما شعیب

تبریزی نے شرح القصائد العشر میں اور احمد بن الامین الشنقیطی نے المعلقات العشر واخبار قائلیہا میں اسی معلقہ کے ۴۸ شعر نقل کئے ہیں۔ مگر ابن سلام الجمحی نے طبقات فحول الشعراء میں کہا ہے کہ مجھے عبید کے اس شعر کے علاوہ کسی اور شعر کا علم نہیں۔

اقفر من أهله ملحوب   فالقطبیات فالذنوب

آگے چل کر اس نے کہا ہے کہ راویوں نے طرفہ اور عبید کے بہت کم قصائد روایت کئے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے صحیح قصائد کی تعداد دس تک پہنچتی ہے (۱)

بہر حال تذکرہ نگاروں نے باتفاق رائے مذکورہ بالا قصیدہ کو اس کا معلقہ تسلیم کیا ہے۔ اس معلقہ میں کوئی خاص بات نہیں کہی گئی ہے۔ جاہلی شعرا کے دستور کے مطابق اس قصیدہ کو دیار محبوب کے ویران ہو جانے سے شروع کرتا ہے۔ اور کہتا ہے ـــــ جن وادیوں، پہاڑوں اور مرغزاروں ایک دن محبوبہ مست خرام تھی۔ اب وہاں ویرانی، تباہی اور موت کا ڈیرا ہے جنگلی جانوروں نے اسے اپنا مسکن اور بسیرا بنا رکھا ہے۔ یہ انجام دیکھ کر اس کی آنکھوں سے گنگا جمنی بہنے لگتی ہے۔ لیکن پھر اسے ہوش آتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہر کمانے را زوالے اس کے بعد چند حکمت و فلسفہ کی باتیں بتاتا ہے جن میں اہم یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے سہارے ہر بھلائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور یہ کہ خدا کا کوئی شریک نہیں۔ اور وہ دلوں کی چھپی ڈھکی باتوں کو بھی جانتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ جو شخص زمانے کو دیکھ کر نصیحت حاصل نہیں کرتا اسے کسی آدمی کی نصیحت سے

۱۔ طبقات فحول الشعراء۔ صف ۲۳

فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ پھر اپنی اونٹنی کی تعریف کرتا ہے اور اس کی تیز رفتاری، طاقت اور تحمل و برداشت کو بیان کر کے اس کی تشبیہ ایک ایسے عقاب سے دیتا ہے جو اتنا تیز، سبک، طاقتور اور تیز نگاہ ہے کہ دور سے ایک لومڑی کو دیکھتا ہے۔ اس پر جھپٹتا ہے۔ اسے پکڑ کر زمین پر کئی پٹخنیاں دیتا ہے۔ آخر کار اسے اس طرح اپنے چنگل میں دبوچ لیتا ہے کہ بیچاری لومڑی چیختی رہتی ہے اور اس کے ناخون اس کی پسلی اور سینے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

یضغو و مخلبھا فی دفــہ لا بد حیزومہ منقوب

فنی اعتبار سے یہ قصیدہ بہت کمزور ہے اور اس کے بہت سے اشعار وزن اور قافیہ کے اعتبار سے غیر موزوں بھی ہیں۔ اس کی اس خامی کی طرف ابوالعلا المعری نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

قد یخطی الرائی امرؤ و ھو حـازم کما اختل فی وزن القریض عبیـد

یعنی آدمی عقلمند اور دانا ہونے کے باوجود کبھی کبھی رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتا ہے جس طرح عبید نے شعر کے وزن میں غلطی کی تھی۔

کامل کیلانی نے اس کمزوری کی یہ توجیہ کی ہے کہ ممکن ہے کہ عبید کسی مخصوص وزن یا لے پر اپنے اشعار کہتا ہو جس پر عام طور سے شعرائے جاہلیت طبع آزمائی نہ کرتے ہوں۔ اگر ہم اس کے منھ سے اس کے اشعار سنتے تو مجھے یقین ہے کہ اس کے وزن اور قافیہ میں کوئی نقص نہ محسوس کرتے لیکن یہ توجیہہ خود بہت کمزور ہے۔ آخر صرف عبید ہی کے کلام میں یہ خامی کیوں پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اس کے علاوہ بہت سے کم گو جاہلی شعرا گذرے ہیں اور ان میں سے بیشتر ان پڑھ اور غیر مہذب تھے۔ لیکن ان کا جتنا کلام ہم تک پہنچا ہے وزن و قافیہ اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس میں کوئی خامی نہیں نظر آتی۔ درحقیقت کامل کیلانی ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں قدماء کے کلام سے خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ معیار پر پورا اترتا ہو یا نہ اترتا ہو، بڑی وابستگی ہے اور ان کی فروگزاشتوں کیوں اور خامیوں کی کوئی نہ کوئی وجہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ چاہے وہ توجیہہ کتنی ہی کمزور اور لچر پوچ کیوں نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ عبید سے جتنا کلام منسوب کیا جاتا ہے اولا تو وہ خود مشکوک ہے اور اسے امرؤالقیس کی کہانی میں یمنی اور مضری قبائلی عصبیت کی بنا پر رنگ دینے کے لیے وضع کیا گیا ہے پھر اس کے کلام میں اتنی فنی کمزوریاں ہیں جو کسی جاہلی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔ مثلاً اس کا وہ قصیدہ پڑھئے جسے عبید نے اس وقت کہا ہے جب اس کی قوم بنو اسد نے امرؤالقیس کے باپ حجر کو قتل کر دیا ہے اور امرؤالقیس نے اس کی دیت لینے سے انکار کر دیا ہے اور بنو اسد سے "ثار"(1) لینے کی

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دھمکی دی ہے۔ اس موقع پر عبید نے کہا ہے کہ

یاذ المخوقنا بقتل أبیہ ذلالا وحبنا

وزعمت أنك قد قتلت سراتنا کذبا ومینا

اس پورے قصیدے میں اتنی فنی خامیاں، زبان اور بیان کی اتنی غلطیاں ہیں جو کسی شاعر کے متعلق تصور میں نہیں آسکتیں۔ کیونکہ جاہلی شعرا کا جو کلام ہم تک پہنچا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح ہے یا غلط اس میں زبان و بیان کی وہ غلطیاں نہیں ہیں جو عبید کے اشعار میں ملتی ہیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں یہ سب اشعار من گھڑت ہیں اور انہیں گھڑا بھی ہے کسی گھٹیا اور ادنا درجے کے شاعر نے ورنہ ان میں وہ فاش غلطیاں نہ ہوتیں جو ہمیں اس قصیدے میں ملتی ہیں۔

رواۃ نے اس کی شخصیت کو پراسرار بنانے کے لیے اس کا رشتہ ایک جن سے جس کا نام "ہبید" بتایا گیا ہے جوڑا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک مثل بھی بنالی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "لولا ہبید ماکان عبید" یعنی اگر ہبید جن نہ ہوتا تو عبید (شاعر) نہ پیدا ہو پاتا۔ چنانچہ اس کا قصہ ابو زید قرشی نے جمہرۃ اشعار العرب کے مقدمہ میں تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح یہ جن "ہبید" عبید کی طرف سے شاعری کر کے اس کے نام سے منسوب کر دیتا تھا اور اس کی زبان سے القا کرتا تھا۔ چنانچہ عبید کا وہ مشہور قصیدہ جسے اس نے امرؤ القیس کے باپ حجر کو اپنی مصاحبت کے زمانہ میں سنایا تھا جس میں وہ کہتا ہے۔

طاف الخیال علینا لیلۃ الوادی — من ام عمرو ولم یلم بمیعاد

أنی اھتدیت الی من طال لیلہم — فی سبسب ذات وکذات واعقاد

ہبید نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ جب سامع (المروزی) نے یہ کہا کہ یہ اشعار تو عبید کے ہیں۔ تو ہبید نے کہا کہ میں نے ہی اس پر ان کا القا کیا تھا۔ (۱)

غرض عبید کی طرف جتنے قصیدے منسوب کیے جاتے ہیں ان میں سے اکثر من گھڑت ہیں اور یمنیوں پر مضریوں کے اور مضریوں پر یمنیوں کے تفوق کو ثابت کرنے کے لیے بعد میں وضع کئے گئے ہیں۔ کیونکہ امرؤ القیس کا باپ حجر یمنی نسل کا تھا اور بنو اسد جن پر وہ حکومت کرتا تھا، مُضَری النسل تھے۔ اور دونوں قبائل بڑے نامور اور مشہور قبائل میں سے تھے اور ہر ایک کے افراد اپنوں کی فضیلت

ا۔ "ثار" خون کے بدلے میں خون۔

تفصیل کے لیے جمہرۃ اشعار العرب۔ ابو زید القرشی کا مقدمہ صفحہ ۳۲ اور اس کے آگے ملاحظہ کیجیے۔

ثابت کرنے کے لیے اشعار۔ قصے کہانیاں وضع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ رواۃ نے نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ عبید کی ملاقات امرؤالقیس سے ہوگئی۔ عبید نے امرؤالقیس سے کہا کہ "الاوابد (جنگلی جانوروں) کے متعلق بھی کچھ جانتے ہو۔" امرؤالقیس نے جواب دیا کہ "جو چاہو پوچھو۔" چنانچہ عبید نے امرؤالقیس سے اشعار میں آٹھ پہیلیاں بجھائیں جن کا جواب امرؤالقیس نے بالکل صحیح صحیح دیا ہے۔ عبید نے کہا:

ماحیۃ میتۃ أحیت بمیتہا　　　درداء ما أنبتت سنا و أدراسا[1]

یعنی وہ کون سی زندہ اور مردہ چیز ہے جو اپنے مردہ جسم کے سہارے زندہ رہتی ہے اور چھونے میں کھردری ہے۔ جس کے نہ دانت ہیں اور نہ ڈاڑھ۔؟

اس کی بوجھ امرؤالقیس نے یہ بتائی:

تلک الشعیرۃ تسقی فی سنابلہا　　　فأخرجت بعد طول المکث أکداسا

یعنی وہ جو کا پودا ہے جس کی بالیوں کو مستقل سیراب کیا جاتا ہے تو ایک زمانے تک پڑے رہنے کے بعد بڑی مقدار میں پیداوار دیتا ہے:

پھر عبید نے کہا کہ اچھا:

ما السود والبیض والأسماء واحدۃ　　　لا یستطیع لهن الناس تمساسا

یعنی وہ کون سی چیز ہے جو کالی بھی ہے اور سفید بھی۔ پر اس کا نام ایک ہی ہے۔ اور انسان اسے چھو نہیں سکتا۔

اس کی بوجھ امراؤالقیس نے یہ بتائی:

تلک السحاب إذا الرحمان أرسلہا　　　روّی بہا من محول الأرض أیباسا

یعنی وہ کالی اور سفید چیز بادل ہے کہ جب خدا اسے بھیجتا ہے تو سوکھی اور چٹیل زمین کو اس سے سیراب کرتا ہے۔

ظاہر ہے یہ مقابلہ محض من گھڑت کہانی ہے۔ اس کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے

---

(1) سر چارلس لائل SIR CHARLES LYAL نے عبید بن الابرص اور عامر بن الطفیل الغنوی کا ایک مشترکہ دیوان شائع کیا ہے۔ اسے دارالمعارف۔ مصر نے چھاپا ہے۔ اس میں فاضل مرتب کے قلم سے انگریزی میں ایک سیر حاصل مقدمہ بھی ہے۔ دیوان کے صفحہ ۳۴ پر مذکورہ شعر کے دوسرے مصرعہ میں "ادراسا" کی جگہ پر "اضراسا" لکھا ہے۔ "ادراسا" کو الامین الشنقیطی نے کتاب "بدائع البدائہ" مولفہ علی بن ظافر سے نقل کیا ہے۔

قصے صرف قبائلی تفوق کو ظاہر کرنے کے لیے وضع کئے گئے ہیں۔ کیونکہ انداز بیان الفاظ اور بعض اصطلاحات ایسی ہیں جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھیں ہی نہیں۔ ۴

خصوصیت کلام۔

ہمارے سامنے عبید بن الابرص کا جو کلام ہے اور اس کی زندگی کے متعلق جو قصے بیان کئے گئے ہیں ان سے اس کی شخصیت اور کلام کا صحیح نقشہ نہیں بنتا۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کے ردعمل کے طور پر اس میں یک بیک شاعری کا ملکہ پیدا ہو گیا اور اس نے اسی دن سے شعر کہنا شروع کیا۔ ان اشعار میں ندرت خیال، رفعت معانی اور حسن الفاظ کی بڑی کمی ہے۔ اسلوب بیان بھی جاہلی شعرا کے برخلاف بڑا ڈھیلا ڈھالا اور کمزور ہے۔ البتہ اس کا وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے:

لمن دمنة أقوت بجوة مرغد   تلوح كعنوان الكتاب المجدد

جاہلی شعراء کے خیال، اسلوب بیان اور معانی کے مطابق ہے اور اس کو اس کے کلام کا بڑا اچھا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس قصیدہ میں اس نے حکمت و فلسفہ، فخر و حماسہ کے مضامین بھی باندھے ہیں۔

عبید کی موت کا قصہ

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ عبید نے بڑی لمبی عمر پائی۔ یہاں تک کہ بعض نے تین سو سال تک کی عمر بتائی ہے۔ اس کی موت کے بارے میں بھی ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ المنذر بن ماء السماء قبیلہ بنو اسد کے اپنے دو حاشیہ نشینوں سے ایک دن خفا ہو گیا اور غصہ میں انہیں قتل کرا دیا۔ بعد میں جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے اپنے کئے پر افسوس ہوا۔ چنانچہ تلافی کے خیال سے اس نے ان دونوں کی قبریں بنوائیں اور ان کا نام "غریین" رکھا۔ اور سال میں دو دن ان قبروں کے پاس بیٹھتا تھا۔ ان دونوں میں سے ایک کا نام "یوم نعیم" بخشش کا دن اور دوسرے کا نام "یوم بؤس" سزا کا دن رکھا۔ چنانچہ بخشش کے دن جو اس کے پاس سب سے پہلے آتا اسے وہ ایک سو اونٹ انعام میں دیتا اور سزا والے دن کو جو سب سے پہلے اس سے ملتا اسے قتل کرا دیتا اور اس کے خون سے دونوں کی قبروں کو پوتاتا۔ اتفاقاً عبید سزا والے دن کو اس سے ملنے کے لیے آ گیا۔ چنانچہ اس نے حسب عہد اسے قتل کرا دیا اور اس طرح عبید ۵۵۵ء یا ۵۶۵ء میں اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔

حوالے۔ ———————

۱۔ عبید کے سلسلہ میں دیکھیے: الاغانی۔ جلد ۱۹۔ صفحہ ۸۴۔ ۴ جیسے لفظ رحمٰن

۲- طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی۔ مطبوعہ دارالمعارف۔ مصر

۳- جمہرۃ اشعار العرب۔ ابو زید محمد بن ابی الخطاب القرشی

۴- الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔

۵- مجمع الامثال للہمدانی للمیدانی

۶- العمدۃ لابن رشیق القیروانی

۷- معجم الادباء لیاقوت الحموی، ج ۸

۸- معجم ما استعجم للبکری

۹- امالی علی القالی۔ جلد ۳

۱۰- فی الادب الجاہلی۔ طٰہٰ حسین

۱۱- حاشیہ رسالہ الغفران۔ تحقیق کامل کیلانی۔

۱۲- المعلقات العشر واخبار قائلیہا۔ الشیخ احمد بن الامین الشنقیطی۔

۱۳- تاریخ آداب اللغۃ العربیہ لجرجی زیدان۔ ج/اوّل

اُمیۃُ بن أبی الصَلت

م۔ ۶۲۴ء مطابق ۹ ہجری

اصحاب المجمہرات میں دوسرا قابل ذکر شاعر امیہ بن ابی الصلت ہے۔ یہ قبیلہ ثقیف کا شاعر اور اس کی عظمت و عزت کا نشان تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں جن لوگوں کو حق کی تلاش تھی ان میں امیہ کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔(۱) اس کی کنیت ابوعثمان تھی۔ پورا سلسلہ نسب یوں ہے۔ ابوعثمان امیہ بن ابی الصلت بن عبداللہ بن ابی ربیعہ بن عوف الثقفی۔

ابن سلام الجمحی نے اسے طائف کے شعراء میں شمار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کے کلام میں ایسی بہت سی عجیب و غریب باتیں ملتی ہیں جو اس سے پہلے کے شعراء نے نہیں کہی ہیں۔ جیسے زمین و آسمان کی پیدائش یا ملائکہ وغیرہ کا ذکر یا مرنے کے بعد حشر یا جنت و دوزخ وغیرہ کا تصور۔ اس نے تورات وغیرہ کے مطالعہ سے پچھلی قوموں کے بہت سے واقعات کا علم حاصل کیا تھا اور ان کو اپنے کلام میں اپنے خاص رنگ میں بیان کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے کلام میں سدوم کے کھنڈرات اور حضرت ابراہیم و اسحٰق علیہما السلام کے قصے بھی ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امیہ فطرتاً حق پسند و حق جو تھا۔ چنانچہ جب اس نے گوش و ہوش کی آنکھیں کھولیں اور کائنات اور اس کا نظام، زندگی اور اس کی بوقلمونی دیکھی تو اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے۔ کون کر رہا ہے اور اس کا مقصد اور حاصل کیا ہے۔ اس نے اس کا جواب مختلف مذاہب میں تلاش کیا اور اہل کتاب کے علماء سے پوچھا اور سمجھنے کی کوشش

۱۔ جیسے ورقہ بن نوفل اور زید بن عمرو بن نفیل: زید نے بت پرستی چھوڑ رکھی تھی اور بت پرستوں کا ذبیحہ بھی نہیں کھاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے عقائد بالکل مسلمانوں جیسے تھے۔ اور عین ممکن تھا کہ وہ اسلام لے آتا لیکن بعثت نبوی سے ۵، سال پہلے ہی مرگیا۔ اس کا بیٹا سعید بن زید ان دس صحابیوں میں سے ہے جنہیں رسول اللہ نے جنت کی بشارت دی تھی اور جنہیں "عشرہ مبشرہ" کہا جاتا ہے۔

کی۔ مذہب عیسوی اور یہودیت کا مطالعہ کیا اور یہودیوں اور عیسائیوں کے بہت سے قصوں اور اسفار کی روایت بھی کی۔ ملت ابراہیمی اور سنت اسماعیل میں سے جو کچھ اس زمانے کے بڑے بوڑھوں کو یاد تھا ان سے معلوم کیا۔ پھر اپنی سمجھ بوجھ، غور و فکر اور مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں ان سوالات کے جواب تلاش کئے اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس آسمان اور زمین کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے۔ یہ نظام کائنات یوں ہی اپنے آپ ہی نہیں چل رہا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک کارساز کا ہاتھ کار فرما ہے۔ اس کارساز نے نظام کائنات اور زمین پر انسانوں کے رہنے کے لیے ایک ضابطۂ حیات بخشا ہے جس کے ذریعہ انسان نے ایک صالح اور پاک زندگی گزارنے کے اصول بنائے ہیں تاکہ جس طرح نظام کائنات بغیر کسی رکاوٹ اور اکھاڑ پچھاڑ کے سکون اور اطمینان کے ساتھ چل رہا ہے۔ انسانوں کی زندگی بھی سکون اور اطمینان کے ساتھ چل سکے۔ اور اس مقصد کو حاصل کر سکے جس کی خاطر اس کی آفرینش ہوتی ہے۔ یہ اصول اور زندگی گزارنے کا یہ طریقہ انبیا اور رسول لے کر آئے جنھوں نے اس کارساز کی نشاندہی کی اور لوگوں کو بتایا کہ وہ ایک ہے اور مر کر ہر ایک کو اس کے پاس واپس جانا ہے۔ ان مسائل میں غور و فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ امیہ کی زندگی کا ڈھنگ بدل گیا۔ اس نے کملی اوڑھنی شروع کر دی۔ بتوں کی کار فرمائی اور طاقت پر یقین نہیں رہا۔ اور راگ و رنگ کی محفلوں سے دل اچاٹ ہو گیا۔ شراب و کباب اپنے اوپر حرام کر لی اور تلاش حق و حقیقت میں کھو گیا۔

تذکرہ نگاروں نے روایت کی ہے کہ مختلف مذاہب کے مطالعہ سے امیہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ایک نبی عنقریب پیدا ہونے والا ہے اور اسے امید تھی کہ وہ نبی میں ہی ہوں گا۔ مگر جب آنحضرت نبی ہو گئے تو اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور آپکی طرف سے اس کے دل میں حسد و کینہ بیٹھ گیا چنانچہ اس نے نہ صرف آپ کا اور آپ کے دین کا انکار کیا بلکہ اہل مکہ کو بھی آپ کی مخالفت پر ابھارنے لگا۔ اور جب غزوہ بدر ہوا تو اس نے مقتولین قریش کا مرثیہ بھی کہا۔ آپ کو جب ان اشعار کی خبر ہوئی تو آپ نے ان کی روایت کرنے اور پڑھنے کو منع فرمادیا۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت ۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيْ آتَيْنَاهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ اس کے بارے میں اتری تھی۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ آنحضرت جب امیہ کے ایمان و یقین اور توحید و رسالت سے بھرے اشعار کو

ا۔ یعنی اس شخص کی خبر ان لوگوں کو تلاوت کر کے سنا دیجئے جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں مگر اس نے ان سے روگردانی کی تو شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا اور یہ نتیجہ ہوا کہ وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا۔

(سورۃ الاعراف۔ پارہ نہم۔ آیت۔ ۱۷۵)

سنتے تھے تو فرماتے تھے کہ "اس کی زبان تو ایمان لے آئی مگر اس کا دل منکر رہا"

مگر یہ خیال غالباً صحیح نہیں ہے کہ امیہ آخر تک اپنے آپ کو نبی موعود سمجھتا رہا اور یہ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوگئے تو وہ محض کینہ اور حسد کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اسلام نہیں لایا۔ بلکہ آپ کی مخالفت کرتا رہا اور قریش کو بھی آپکے خلاف ابھارتا رہا۔ ہمارے اس خیال کی بنیاد مفسرین کا وہ اختلاف ہے جو اس آیت سے مراد شخصیت کے بارے میں ان کے یہاں ملتا ہے۔ اور وہ عقلی اور نقلی دلائل ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آیت مذکورہ امیہ کے بارے میں نہیں اتری تھی بلکہ کسی اور شخصیت کے بارے میں۔

مفسرین نے اس آیت کی شان نزول بتاتے ہوئے اس آیت سے متعلق مختلف نام بتائے ہیں اور انہیں میں سے ایک امیہ بن ابی الصلت کا نام بھی ہے۔ ان مفسرین نے اپنے اس خیال کی تائید میں چند روایتیں بھی نقل کی ہیں جن کے راویوں میں بعض بہت ہی اہم اور جلیل القدر شخصیتوں کا نام آتا ہے جیسے عبداللہ بن عمر اور سعید بن المسیب وغیرہ۔ مگر یہ بات معرض بحث ہے کہ ان جلیل القدر شخصیتوں کے بعد جو روات ہیں وہ کس پائے کے ہیں۔ کہیں اس سلسلہ روایت میں غیر ثقہ اور وضع سے متہم روات تو نہیں شامل ہوگئے ہیں۔

حضرات مفسرین نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے اس آیت سے مراد جس شخصیت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے وہ بلعم بن باعورا ہیں۔ اس کے بعد بعض نے امیہ بن ابی الصلت کا اور بعض نے ابو عامر راہب اور بعض نے اہل کتاب کے منافقین اور بعض نے بغیر نام بتائے "بنی اسرائیل کے ایک عالم" کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ ان ناموں پر غور کیجئے تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی کوئی وجہ مشابہت نہیں ہے۔ نہ نسلی اعتبار سے نہ ہی وطنی، تہذیبی اور فکری اعتبار سے چنانچہ ان میں سے ایک کنعانی ہے اور ایک عرب، ایک یہودی اور کچھ منافقین اہل کتاب، جن سے مراد یہودی اور عیسائی دونوں ہو سکتے ہیں کیونکہ دونوں ہی اہل کتاب ہیں۔ اور جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اگر آپ ان شخصیتوں کے پائے جانے کے زمانے پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بعض کے درمیان سینکڑوں سال کا فرق ہے۔ چنانچہ انہی مفسرین کے قول کے مطابق بلعم بن باعورا حضرت موسیٰ کے زمانے میں تھے اور امیہ بن الصلت آنحضور کے زمانے میں۔ اور ان دونوں رسولوں کے درمیان ہزاروں سال کا فرق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی ان مل بے جوڑ شخصیتوں کو جن کے پائے جانے کے زمانے میں کئی ہزار

سال کا فرق ہے کس طرح ایک ہی آیت سے متعلق کہا جا سکتا ہے اور پھر جب ایک خاص خبر کی نسبت ان سے کی گئی ہو؟

اس رائے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قدیم تذکرہ نگاروں میں سے نثر نگار ادباء اور نقادوں نے اس آیت کا ذکر نہیں کیا ہے جیسے ابن سلام الجمحی، جاحظ اور ثعالبی وغیرہ نے۔ ابن سلام الجمحی نے امیہ کا وہ شعر ضرور نقل کیا ہے جو اس نے مقتولین بدر کے مرثیہ میں کہا ہے۔ مگر اس شعر کے علاوہ اور کوئی شعر اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ ابو الفرج اصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی میں اس آیت اور اس کی شان نزول کے طور پر امیہ کا ایک پورا واقعہ نقل کیا ہے لیکن اصفہانی کی روایت پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں رطب و یابس ہر قسم کی روایات جمع ہیں کہ وہ نہ تو مستند سیرت کی کتاب ہے اور نہ تاریخ کی۔ پھر اب یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ اغانی میں بہت سی روایات اور بہت سے قصے محض من گھڑت اور جھوٹے ہیں۔ خود ابو الفرج نے اس بات کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے جو کچھ لوگوں کو کہتے سنا ہے بغیر تحقیق و تدقیق کے نقل کر دیا ہے۔[1] عرب تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابیں عام طور سے اغانی کی روایات سے مرتب کی ہیں چنانچہ بعد کے جتنے تذکرہ نگار آئے انہوں نے بغیر تحقیق و تدقیق کے اغانی کے بیان کو نقل کر دیا اور اس کی مطلق پرواہ نہیں کی کہ قرائن اور عقل سلیم کی روشنی میں یہ باتیں صحیح ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ متاخرین میں اس کی ابتدا جرجی زیدان نے اپنی کتاب۔ تاریخ ادب اللغۃ العربیہ میں کی ہے اور انہیں کے نقش قدم پر چل کر دوسرے مصنفین نے بھی ان باتوں کو جوں کا توں نقل کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے یہ غلط فہمی بلکہ غلط بیانی آج تک ہماری عربی ادب کی تاریخ میں چلی آرہی ہے۔[2]

۱۔ اغانی کی روایات کے بارے میں ملاحظہ کیجئے۔ ڈاکٹر محمد احمد خلف اللہ کی کتاب ۱ " صاحب الاغانی۔ ابو الفرج الاصفہانی الراویۃ ۔ ۲۔ حل العیر کا مضمون۔ مع ابی الفرج الاصفہانی فی کتاب الاغانی۔ مطبوعہ مجلۃ العرب۔ الریاض۔ ماہ رجب ۱۳۸۶۔ جو/اکتوبر ۱۹۶۹ء

۳۔ دراستۃ الاغانی ؛ ڈاکٹر داؤد سلوم، مطبوعہ بغداد

۴۔ منہج الاغانی ، شفیق جبری ، مطبوعہ لبنان

۲۔ آیت کی شان نزول کے بارے میں تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کا مضمون:" امیہ بن ابی الصلت۔ ایک حکیم شاعر" مطبوعہ رسالہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء

امیہ بن ابی الصلت نے عبداللہ بن جدعان کی شان میں بڑے شاندار مدحیہ قصیدے کہے ہیں۔ عبداللہ سرداران قریش میں ایک نامور سردار اور بہت ہی سخی داتا امیر تھا۔ کہتے ہیں کہ امیہ نے اس کی اسی طرح مدح کی ہے جس طرح زہیر بن ابی سلمی ہرم بن سنان کی تعریف کیا کرتا تھا۔

امیہ کی پیدائش طائف میں ہوئی تھی۔ یہیں اس کے باپ نے جو خود بھی بہت بڑا شاعر تھا اس کی تعلیم و تربیت کی۔ بڑا ہو کر اس نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور کبھی شام اور کبھی یمن مال تجارت بیچنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ انھیں سفروں میں اس کی راہبوں اور پروہتوں سے ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ اور وہ ان سے دین و ایمان کی باتیں کرتا جنہوں نے آگے چل کر اس کی زندگی کا نقشہ بدل دیا۔ مختلف ادیان کے مطالعہ نے اسے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ تمام ادیان باطل ہیں۔ صرف دین ابراہیمی ہی صحیح ہے۔

کل دین یوم القیامۃ عند اللہ إلا دین الحنیفۃ زور

یعنی اللہ کے نزدیک قیامت کے دن تمام دین جھوٹے ثابت ہوں گے سوائے دین حنیف (ابراہیمی) کے۔ اس دین ابراہیمی کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے۔

رب الحنیفۃ لم تنفد خزائنہ مملوءۃ طبق الآفاق سلطانا

یعنی وہ دین حنیف کا مالک ہے اس کے خزانے کبھی خالی نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ بھرے رہتے ہیں۔ اور جس نے اپنی بادشاہی اور کار فرمائی سے سارے آفاق کو گھیر رکھا ہے۔

امیہ کی امتیازی خصوصیات

امیہ بن ابی الصلت جزیرۂ عرب کے قصبات کے شعرا میں سب سے ممتاز اور مشہور شاعر شمار کیا جاتا ہے۔ زبان اسلوب بیان اور معانی و مطالب میں ندرت، دلکشی اور فنی اعتبار سے کسوٹی پر پورے اترنے کے باوجود بعض علمائے لغت اس کو زبان میں سند نہیں مانتے اگرچہ وہ خالص عرب تھا۔ اور اس کے کلام سے مثال نہیں پیش کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کلام میں عبرانی اور سریانی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں جن کا تعلق عربی زبان سے نہیں۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ امیہ پہلے تو تجارت کی غرض سے اور بعد میں حق کی تلاش کی راہ میں عجمیوں اور دوسری غیر عرب اقوام سے اکثر ملتا جلتا رہتا۔ ان کی کتابیں پڑھتا رہتا اور ان کی باتیں سنتا۔ چنانچہ ان کی زبان کے بعض الفاظ اس کی زبان پر چڑھ گئے اور پھر اس کے کلام میں بھی غیر شعوری طور پر در پا گئے۔ چنانچہ وہ آسمان کو صاقورہ کہا کرتا تھا۔ اور چاند کو الساہور۔ اس کا خیال تھا کہ جب چاند گرہن پڑتا

ہے تو درحقیقت چاند ایک غلاف کے اندر چھپ جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا خیال تھا کہ سورج جب ڈوب جاتا ہے تو پھر دوبارہ طلوع ہونے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایسے لوگوں پر طلوع نہیں ہوں گا جو اللہ کو چھوڑ کر مجھے پوجتے ہیں۔ اس پر اس کے کوڑے لگتے ہیں، دھکے دیئے جاتے ہیں۔ تب وہ دوبارہ طلوع ہوتا ہے۔ چنانچہ امیہ کہتا ہے۔

یلست بطالعة لهم فی رسلها الا معذبة والا تجلد

اسی طرح اس نے اپنے اشعار میں اللہ کو "السلطیط" اور "التغرور" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کے علاوہ امیہ ایسی انوکھی باتیں بھی کہتا تھا جنہیں عام طور سے عرب نہیں جانتے تھے۔ ان باتوں کو وہ گذشتہ مقدس کتابوں سے اخذ کرکے عربی میں بیان کرتا تھا۔ اس کی مثال اس کا یہ شعر ہے۔

بآیة قام ینطق کل شئی وخان أمانة الدیک الغراب

کہتے ہیں کہ ایک مرغ ایک کوے کا جگری دوست اور یار غار تھا۔ مگر کوئے نے شراب کی خاطر ایک شراب بیچنے والے کے یہاں اسے گروی رکھ دیا۔ پھر اسے چھڑانے کے لیے لوٹ کر کبھی نہیں آیا۔ شراب بیچنے والا جب انتظار کرکے تھک گیا تو اپنی رقم کے عوض اس نے مرغ کو اپنی دوکان کا چوکیدار بنا دیا۔ اسی طرح ہد ہد کے بارے میں بھی اس کے چند اشعار مروی ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ ہد ہد کے سر پر جو کلغی ہے درحقیقت اس کی ماں کی لاش ہے جسے اس نے مرنے کے بعد اپنے سر پر رکھ لیا تھا اور دفن کرنے کے لیے مناسب جگہ نہ ملی تو اس کی لاش مستقل طور سے اس کے سر پر جم کر رہ گئی۔ اور جب لاش سڑی تو اس کی بدبو اس کے رگ وپے میں سرایت کر گئی یہی وجہ ہے کہ ہد ہد کے جسم سے ایک خاص قسم کی بو آیا کرتی ہے۔(۱)

امیہ کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کلام تعقید معنوی اور تعقید لفظی دونوں سے ایک حد تک پاک ہے۔ البتہ ابتدائی زمانے کی شاعری میں جاہلی رنگ پورا پورا جھلکتا ہے۔ یعنی الفاظ تو وہی شان وشکوہ اور گمبھیرپن ہے جو امرؤ القیس کے یہاں ملتا ہے۔ مگر معانی میں وہ رفعت اور ندرت نہیں جو ایسے الفاظ کا تقاضہ ہے۔ بلکہ معانی ومطالب بالکل سادہ اور معمولی ہیں جیسے اس کے یہ اشعار۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیئے۔ کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔ صفحہ ۲۰۹۔ اور اس کے آگے اور "الاصابة فی تمییز الصحابة لابن حجر العسقلانی" رسول اللہ کی امیہ کے بارے میں رائے کے لیے جس میں آنحضرت نے خود اس کا شعر نقل فرما کر اپنی رائے دی ہے کہ اس کا شعر ایمان لے آیا مگر اس کا دل کافر ہے۔

دمایبقی علی الحــدثان غفـر — بشاهقة لـه ام ردؤم
تبیت اللیل حانیــة علیــه — مایجنو مّس الارخ الأطوم
تصدی کلما طلعت لـنشـز — وردت انـها منـه عقیـو

یعنی مصائب زمانہ (یعنی موت) سے پہاڑی بکری کا وہ بچہ بھی نہیں بچ سکتا جو پہاڑی کی چوٹی پر ہو اور اس کے پاس اس کی شدید محبت کرنے والی ماں ہو جو اس کی نگہداشت اور دیکھ ریکھ میں راتوں کو جاگ کر اس طرح گزار دیتی ہو جس طرح کہ ایک نیل گائے جو اپنے بچے پر جان دیتی ہے۔ چپ چاپ دائیں بائیں اس خیال سے بار بار مڑ کر دیکھتی ہے کہ اس کے بچے کو نقصان پہنچانے والا کوئی جانور تو کہیں آس پاس نہیں ہے۔ چنانچہ اپنے بچے کو بری طرح چاہنے والی یہ گائے جب بھی کسی بلند ٹیلے پر چڑھتی ہے تو سب سے پہلے کان لگا کر سنتی ہے کہ کہیں اس کے بچے کو مار کر داغ جدائی دینے والا کوئی جانور ادھر ادھر تو نہیں ہے اور اس طرح بچے کی خاطر بے چین اور پریشانی کی تکلیف سے عاجز آ کر یہ چاہتی ہے کہ کاش اس نے اسے جنم ہی نہ دیا ہوتا۔

مذکورہ بالا اشعار میں ایسے بھاری بھرکم اور غریب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو عام طور سے شعراء کے یہاں نہیں ملتے۔ اسی طرح اس کے یہ اشعار بھی جو اس نے مقتولین بدر کے مرثیہ کے لیے کہے تھے۔ موٹے موٹے الفاظ لیکن سطحی معنی کے مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ماذا ببدر فـالعقنقـ — ل مـن مرازبـة جحاجح
ھلا بکیت عـلی الـکـرا — م بنی الکرام اولی الممادح

یعنی بدر اور اس کے ریت کے ٹیلے پر بڑے بڑے بہادروں، سرداروں اور شہ سواروں پر کیا کچھ نہ گزری۔ تم شریف اور شریف زادوں اور اخلاق و عادات میں بلند ترین اشخاص پر روئے نہیں۔
لیکن اس کا کچھ کلام ایسا بھی ہے جس میں سہل الفاظ اور دلکش اسلوب بیان پایا جاتا ہے۔ غالباً یہ اس دور کا کلام ہے جب اس کا دل معرفت حقیقت سے معمور ہو چکا تھا اور اس میں جلا پیدا ہو گئی تھی۔ اس قسم کے اشعار میں اس نے مابعد الطبیعیات اور عام ڈگر سے ہٹی ہوئی باتیں کہی ہیں۔ جیسے دنیا کی پیدائش اور اس کا ایک دن فنا ہو جانا۔ یا قیامت کے حالات، خالق اور اس کی صفات اور شان اور پھر اس سے تعلق جوڑنے کی وہ باتیں جو اس سے پہلے کسی شاعر نے نہیں کہیں جیسے اس کے یہ اشعار۔

الحمد للّٰہ ممسانا ومصبحنا — بالخیر صبحنا ربی ومسانا
رب الحنیفة لم تنفد خزائنـه — مملوۃ طبق الآفاق سلطانا

وقد علمنا لو أن العلم ينفعنا — أن سوف تلحق اخرانا باولانا

یعنی شکر اس خدا کے لیے سزاوار ہے جو ہماری شامیں اور صبحیں لاتا ہے۔ اے میرے رب خیر اور بھلائی سے ہماری صبحیں اور شامیں لا۔

وہ ملت ابراہیمی کا رب ہے اس کے خزانے ہمیشہ بھرے رہتے ہیں کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اس نے ساری کائنات کو اپنی طاقت اور کارفرمائی سے گھیر رکھا ہے۔

اگر ہمیں علم سے کوئی فائدہ پہنچ سکے تو ہمیں یہ خوب معلوم ہے کہ ہمارے پچھڑے لوگ آگے جانے والوں سے عنقریب مل جائیں گے یعنی "بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"

یا اپنے بیٹے سے ناراض ہو کر اس کو ڈانٹتے ہوئے جو شعر اس نے کہے ہیں۔

غذوتك مولودا وعلتك يافعا — تعل بما اجني عليك وتنهل

إذا ليلة نابتك بالشجو لم أبت — لشكواك الا ساهرًا أتململ

كأني أنا المطروق دونك بالذي — طرقت به دوني فعيني تهمل

تخاف الردى نفسي عليك وإنني — لأعلم أن الموت حتم موجل

فلما بلغت السن والغاية التي — إليها مدى ما كنت فيك أومل

جعلت جزائي غلظة وفظاظة — كأنك أنت المنعم المتفضل

تیری پیدائش کے وقت تجھے میں نے کھلایا پلایا اور پالا پوسا اور جب تو سیانا ہوا تو تیری جملہ ضرورتیں پوری کیں۔ چنانچہ تو میری کمائی سے گل چھرے اڑاتا رہا اور جی بھر کر مزے کرتا رہا۔

(۲) اگر کسی رات کو تجھے کوئی تکلیف ہوئی تو میں پوری رات تیری تکلیف کی وجہ سے بے کل ہو کر آنکھوں میں کاٹ دیتا۔

(۳) گویا کہ جو تکلیف تجھے ہو رہی ہے وہ تجھے نہیں بلکہ مجھے ہو رہی ہے۔ اور اس وجہ سے میری آنکھیں گنگا جمنی بہاتی تھیں۔

(۴) میرے دل کو ہر وقت تیری موت کا دھڑکا لگا رہتا تھا حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے اور وہ اس دن آ کر رہے گی۔

(۵) مگر جب تو اس عمر اور اس منزل کو پہنچ گیا جس سے میں اپنی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھا تو

(۶) تو نے اس کا صلہ سنگدلی اور درشتی سے دیا گویا کہ تم ہی میرے کرم فرما اور محسن تھے۔

عبداللہ بن جدعان جو زمانہ جاہلیت میں اپنی جود و سخا میں بہت مشہور تھا امیہ کا ممدوح

تھا۔ اس کی تعریف میں اس نے وہ مدحیہ قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے:

أأذکر حاجتی أم قد کفانی   حیاؤک إنّ شیمتك الحیاء

یعنی کیا میں اپنی ضرورت کو کھول کر آپ سے بیان کروں (تب مجھے اپنے انعام واکرام سے نوازیں گے) یا میرے لیے آپ کی خوئے شرم ہی کافی ہے۔ آپ کی صفت ہی لحاظ و شرم کرنا ہے۔ قصیدے کے دوسرے اشعار اس کے دیوان میں ہیں۔

اغانی نے روایت کی ہے کہ جب اس نے عبداللہ بن جدعان کی تعریف میں وہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

عطاؤك زین لامرئ قد حبوته   بخیر وما کل العطاء یزین

یعنی آپ کی بخشش مانگنے والے کے حق میں زیب وزینت بن جاتی ہے حالانکہ تمام قسم کے عطیات آدمی کے لیے زیب وزینت نہیں بنتے ہیں۔ یعنی جس کو آپ دیتے ہیں تو اتنے اعزاز واکرام سے دیتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اس کو اپنے لیے عزتی سمجھے عزت کا تمغہ سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن جدعان اتنا خوش ہوا کہ اپنی دو پسندیدہ لونڈیاں جن کا نام جرادتان تھا، اسے انعام میں دے دیں۔

امیہ بن ابی الصلت کے اس قصیدہ کا جسے مجمہرات میں شمار کیا جاتا ہے، مطلع ہے:

عرفت الدار قد أقوت سنینا   لزینب إذ تحل بها قطینا

یعنی میں نے زینب کی وہ جائے رہائش پہچان لی جس میں وہ رہا کرتی تھی اور جواب ویران وسنسان پڑی ہوئی ہے۔

اس کے بعد اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم لوگ اتنے طاقتور اور رعب ودبدبہ کے مالک ہیں کہ جس جگہ چاہتے ہیں اتر پڑتے ہیں اور اتنے بہادر ہیں کہ جب دشمنوں سے مقابلہ ہوتا ہے تو خوب تلوار کے جوہر دکھاتے ہیں اور جس وقت ہم چاہتے ہیں لوگوں کو روک دیتے ہیں اور اگر ہمیں مدد کے لیے بلایا جائے تو ہم مہربانی کا سلوک کرتے ہیں اور جب آزمانے کے لیے خاندان پر مصیبتیں آن پڑتی ہیں تو ہم لوگ بڑھ کر ان مصیبتوں کو اٹھا لیتے ہیں۔

بأنا النازلون بکل ثغر   وإنا الغادرون إذا التقینا
وإنا المانعون إذا أردنا   وإنا العاطفون إذا دعینا
وإنا الحاملون إذا أناخت   خطوب فی العشیرة تبتلینا

اس کے بعد لڑائی میں اپنی قوم کی بہادری کے کارناموں کو بیان کرنے کے بعد اس قصیدہ کو ختم کر دیتا ہے۔ امیہ کے اس قصیدہ کے بہت سے اشعار معنی اور وزن دونوں میں عمرو بن کلثوم کے مشہور معلقہ سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

اوپر کی مثالوں سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ امیہ بن ابی الصلت بلاشبہ قادر الکلام شاعر ہے۔ لیکن اسلوب بیان اور معانی و مطالب کے اعتبار سے اس کو کوئی امتیازی شان نہیں حاصل ہے کیونکہ مابعد الطبیعیاتی تصورات کو چھوڑ کر عام معانی و مطالب پٹے ہوئے ہیں۔ بعض علماء نے اسے جاہلی شعراء کے طبقہ اولی تک میں شمار کیا ہے لیکن اس کے کلام کو دیکھ کر اس میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی کہ ہم اسے طبقہ اولی میں شامل کر سکیں۔ امیہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے اس زمانہ میں مذہب اور مابعد الطبیعیاتی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جو جاہلی شاعری میں ناپید تھے۔ اس لیے بعض علماء کا خیال ہے کہ امیہ نے ان مسائل پر خود تو کم کہا ہے لیکن بعد میں آنے والوں نے ان مسائل سے متعلق اشعار کہہ کر اس کے نام سے مشہور کر دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے اکثر اشعار ناموزوں رکیک اور معنی مطالب کے اعتبار سے بہت گھٹیا ہیں۔ بعض علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ اس قسم کے نامانوس اور جاہلی معاشرہ میں غیر معروف خیالات وافکار کو اس نے دوسرے مذاہب کی کتابوں سے اخذ کر کے عربی کا جامہ پہنا دیا تھا اور چونکہ یہ خیالات عام رجحانات اور سماجی حالات سے میل نہیں کھاتے تھے اور شاید ان سے متعلق خود اس کا ذہن بھی صاف نہیں تھا اس لیے ان اشعار میں تعقید، ژولیدہ بیانی اور ابہام پیدا ہو گیا ہے اور اس ژولیدگی اور ابہام کو بڑھانے میں ان تعبیرات، اصطلاحات اور ناموں کو بھی دخل ہے جنہیں وہ دوسری کتابوں سے اخذ کر کے عربی میں بیان کرتا تھا۔ اور لوگ انہیں نہ اچھی طرح سمجھتے تھے اور نہ ان کے صحیح معنے اور مفہوم کو جانتے تھے۔

کہتے ہیں کہ جب امیہ پر نزع کی کیفیت طاری ہوئی اور مرنے سے تھوڑی دیر پہلے اسے ہوش آیا تو وہ فضا میں دیکھ کر کہنے لگا کہ "یہ لو میں تم دونوں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ تم دونوں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ یہ دیکھو تمہارے پاس ہی یہ میں ہوں۔ اب تو مال نہ مجھے چھٹکارا دلا سکتا ہے اور نہ خاندان مجھے بچا سکتا ہے۔ خداوندا اگر تو بخشندہ ہے تو میرے تمام گناہوں کو بخش دینا کیونکہ تیرا کون سا بندہ ایسا ہے جس سے گناہ سرزد نہ ہوئے ہوں۔ پھر اس نے اپنے پاس کے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور یہ شعر اس کی زبان سے رواں ہو گئے۔

کل عیش وإن تطاول دھرا — منتھی أمرہ إلی أن یزولا

لیتنی کنت قبل ما قد بدا لی — فی رؤس الجبال أرعی الوعولا

اجعل الموت نصب عینیك واحذر — غولۃ الدھر إن للدھر غولا

ہر زندگی خواہ اس کی مدت کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو اس کا انجام یہ ہے کہ ایک دن اسے زوال آکر رہے گا۔ کاش کہ اس حقیقت کے منکشف ہونے سے پہلے میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنگلی بکروں کو چرایا کرتا۔ تو موت کو اپنا مقصد اور مرکز بنائے رکھ اور آفات زمانہ سے ہمیشہ ہوشیار رہا کر کیونکہ زمانہ کی مصیبتیں یکایک آجاتی ہیں۔

اس کے بعد اس نے آنکھیں موندلیں اور دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کی وفات ۶۲۴ء مطابق ۹ ہجری میں ہوئی۔

حوالے:-

۱۔ الاغانی، جلد ۳ و ۱۶ — ۲۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی

۳۔ سیرت ابن ہشام — ۴۔ الہلال السنۃ التاسعہ۔

۵۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ۱۵۲/۱

۶۔ الوسیط۔ احمد الاسکندری

۷۔ تاریخ الأدب العربی — احمد حسن الزیات

۸۔ تاریخ العرب قبل الاسلام۔ جواد علی جلد ۵

۹۔ البیان والتبیین۔ جلد اول صفحہ ۲۴، ۲۹۱۔

۱۰۔ حاشیہ الدر المنثور للسیوطی — ۱۱۔ تفسیر امام رازی

۱۲۔ تفسیر امام بیضاوی — ۱۳۔ مفردات القرآن۔ امام راغب اصفہانی

۱۴۔ کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔

۱۵۔ جمہرۃ اشعار العرب: ابوزید القرشی۔ ۱۶۔ سیرت النبی علامہ سید سلیمان

۱۷۔ صاحب الاغانی ابو الفرج الاصفہانی: دکتور محمد احمد خلف اللہ۔

۱۸۔ مع ابی الفرج الاصفہانی فی کتاب الاغانی: علی العمیر

۱۹۔ فی الادب الجاہلی: ڈاکٹر طہ حسین۔

۲۰۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ لابن حجر العسقلانی

أصحاب المنتقيات (١)

المرقّش الاکبر: م ۵۵۲ء

نام عمرو بن سعد بن مالک تھا اور المرقش الاکبر کے لقب سے مشہور ہوا۔[۲] اس کی ماں کا نام قلابہ بنت الحارث بن قیس بن الحارث بن ذہل الیشکری تھا۔ المفضل الضبی نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں کہا ہے کہ "المرقش الاکبر" کا نام عوف تھا۔ اور عوف اس کے چچا کا بھی نام تھا۔ جس کی کنیت "ابو اسماء" تھی۔[۳] جاہلی شعراء میں مرقش نام کے دو شاعر گزرے ہیں۔ ایک ہمارا یہ شاعر جس کا تذکرہ ہم لکھ رہے ہیں۔ اسے المرقش الاکبر (بڑا مرقش) کہتے تھے۔ اور دوسرا "المرقش الاصغر" (چھوٹا مرقش)۔ المرقش الاصغر، المرقش الاکبر کا بھتیجا اور مشہور جاہلی شاعر طرفہ العبد کا چچا تھا۔[۴] مرقش کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا۔

هل بالديار ان تجيب صمم　　　لو كان رسما ناطقا كلم

یعنی کیا محبوبہ کے دیار بہرے آدمی کے سوالات کے جوابات دے سکتے ہیں (ظاہر ہے کہ نہیں) اگر دیار کی نشانی بول سکتی تو یقیناً میرے محبوبہ کے دیار کی نشانی بھی بولتی۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ:

الديار قفر والرسوم كما　　　رَقَّشَ فی ظهر الأديم قلم

یعنی محبوبہ کی نگری ایسی اجاڑ پڑی ہوتی ہے اور اس کے نشانات اس طرح دکھائی دے رہے ہیں جیسے

---

(۱) اس طبقہ میں حسب ذیل کو شمار کیا جاتا ہے: المسیب بن علس (۲) المرقش الاکبر (۳) المتلمس (۴) عروۃ بن الورد (۵) المہلہل (۶) دُرَید بن الصمۃ (۷) المتنخل

۲۔ پورا سلسلہ نسب یوں ہے۔ عمرو بن سعد بن مالک بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ بن عکابہ بن عدنان

۳۔ المفضلیات صف۔ ۴۵۷ تحقیق کارلوس یعقوب لائل۔ مطبوعہ بیروت ۱۹۲۰ء

۴۔ تفصیل طرفہ بن العبد کے تذکرہ میں ملاحظہ کیجئے۔　　　اَلمُرَقَّش۔ م پر پیش، ر پر زبر، ق پر تشدید

کہ زمین پر قلم سے حسین نقش دنگار بنا دیئے گئے ہوں۔(۱)

جاہلی شعراء میں مرقش کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ بنیادی طور پر اسے غزل گو شاعر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی واردات قلبی کا مرکز اور اس کے دنیائے دل کی ملکہ اس کی چچازاد بہن اسماء تھی۔ جو اس کے چچا عوف بن مالک کی لڑکی تھی جس کے نام پر کہتے ہیں کہ مرقش نے بھی اپنا نام عوف رکھ لیا تھا۔ بچپن میں دونوں ساتھ پلے بڑھے ساتھ کھیلے اور جب جوان ہوئے تو مرقش نے دیکھا کہ کھیل ہی کھیل میں وہ اپنا دل اسماء سے ہار بیٹھا ہے۔ عربوں کو اور خاص طور سے غزل گو شعراء کو ایسی محبت کم ہی راس آتی تھی چنانچہ مرقش کو بھی راس نہ آئی۔ اور آخر ہجر و فراق کے ہاتھوں اسماء کا غم لئے اس کو بغیر اپنی بنائے اس دنیا سے چل بسا۔

مرقش کو جاہلی شعراء میں دوسرا امتیاز یہ حاصل ہے کہ اسے لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ اس کے باپ سعد بن مالک نے اسے اور اس کے بھائی حرملہ کو حیرہ کے ایک عالم کے پاس بٹھا دیا تھا کہ وہ دونوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ چنانچہ اس طرح دونوں بھائیوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ یہ بات اس زمانے میں بہت اہم سمجھی جاتی تھی کیونکہ عام طور سے شعراء اور شرفائے عرب اپنے حافظہ اور راویوں پر ہی بھروسہ رکھتے تھے۔ لکھ کر کسی چیز کو یاد رکھنا یا لکھائی پر بھروسہ کرنا بہت عام بات نہ تھی۔

مرقش الاکبر مشہور جاہلی شعراء کے مقابلہ میں نسبتاً کم گو شاعر ہے۔ المفضل بن محمد الضبی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "المفضلیات" میں چھوٹے بڑے ملا کر مرقش کے ۱۴ قصیدوں کا ذکر کیا ہے۔ بعض مقطوعے الاغانی نے بھی نقل کئے ہیں۔

کلام کی امتیازی خصوصیات

ہمارے سامنے المرقش کا جو کلام موجود ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ مرقش نے فخر و حماسہ اور مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ہر جگہ اس میں غزل کا رنگ غالب ہے۔ جاہلی شعراء کی ریت پر اس نے بھی اپنے تمام قصیدوں کو تشبیب سے شروع کیا ہے۔ جن کی ابتدا عام طور سے اس کی محبوبہ اسماء کے حقیقی یا مجازی نام اور اس سے ہمکلامی سے ہوتی ہے۔ چونکہ وہ محبت میں ناکام رہا تھا، دل زخم خوردہ تھا اس لیے اس کی غزل میں بڑا سوز و درد اور اثر پایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ پوری موسیقیت اور نغمگی بھی موجود ہے۔ مرقش کے کلام میں عام طور سے بھاری بھرکم الفاظ ملتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے کلام کی سلاست و روانی اور موسیقیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ جہاں تک معانی و مطالب کا تعلق ہے وہ بہت واضح صاف اور

۱- البیان والتبیین۔ الجاحظ۔ ج ۱ ص ۲۰۵۔ پورا قصیدہ مفضلیات صفحہ ۲۰۵ پر ملاحظہ کیجئے۔

دل لگتے ہیں۔ افکار و خیالات میں ندرت اور گہرائی نہیں ہے۔ لیکن سچائی اور واقعیت ضرور ہے۔ چونکہ اس نے اپنے کلام میں اپنا درد دل بیان کیا ہے اس لیے قدرتی طور پر دل پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ پھر جب یہ احساس بھی قاری کو رہے کہ یہ سب کچھ شاعر کی اپنی آپ بیتی ہے۔ جگ بیتی نہیں تو قدرتی طور پر تاثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ مرقش کے ندرت کلام کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنا وہ قصیدہ جس کی وجہ سے اس کا لقب "مرقش" پڑ گیا۔ خلیل بن احمد کی بحروں سے ہٹ کر کہا تھا اور نقادوں کی رائے میں اس میں کہیں جھول یا غیر موزونیت نہیں ہے۔ غالباً اس کی انہیں امتیازی خصوصیات کی وجہ سے لبید نے کہا تھا کہ

والشاعرون الناطقون اراهم سلکوا طریق مُرَقِّش ومهلهل

یعنی جتنے پرگو شاعر ہیں انھیں میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے مرقش اور مہلہل کے راستے کی پیروی کی ہے۔

البرخت ایک فارسی نژاد شاعر نے اپنے ایک حریف کا جس کی عادت تھی کہ وہ شعراء کی زبان کی غلطیاں پکڑا کرتا تھا یہ کہہ کر مذاق اڑایا ہے کہ تمہاری بے وقوفی کا تو یہ عالم ہے کہ تم مرقش جیسے شاعر کے کلام میں زبان کی غلطیاں ڈھونڈا کرتے ہو۔ حالانکہ تمہارا اپنا وجود سرتاپا تمام غلطی ہے۔

تتبع لحنا فی کلام مرقش وخلقک مبنی علی اللحن أجمع

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرقش کو زبان پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ دوسرے شعراء کے لیے نہ صرف مشعل راہ تھا بلکہ اگر کوئی اس کے کلام پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت کرتا تو لوگ اسے صرف خام خیال ہی نہیں بلکہ سرتاپا غلطی سمجھتے تھے۔

المرقش الاکبر کو اپنی چچازاد بہن اسماء بنت عوف بن مالک بن ضبیعہ سے عشق تھا۔ ایک تو یہ اس کی چچازاد بہن تھی دوسرے بچپن میں اس کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے اس کو اس سے بڑا قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور آخر اس کی راہ میں اس نے اپنی جان بھی دے دی۔

مرقش اور اسماء

رواۃ نے بیان کیا ہے کہ جب دونوں جوان ہو گئے تو مرقش نے اپنے چچا سے اسماء کا رشتہ مانگا۔ چچا اس سے انکار تو نہ کر سکا لیکن جانتا تھا کہ آزاد منش شاعر مزاج نوجوان نہ جانے اس کی لڑکی کے ساتھ کیا کرے۔ اس لیے عوف نے شاید بات ٹالنے کے لیے مرقش سے کہا کہ ہاں شادی کر دوں گا لیکن تم پہلے اپنی حیثیت تو بناؤ۔ کچھ اپنا رعب داب جماؤ۔ کچھ شہرت حاصل کرو۔ چنانچہ مرقش یمن کے

ایک بادشاہ کے دربار میں آیا اور اس کی شان میں مدحیہ قصیدہ کہا۔ بادشاہ اپنی شان میں مدحیہ قصیدہ سن کر بہت خوش ہوا اور بہت عزت و احترام سے مرقش کو اپنے پاس رکھ لیا اور خوب انعام و اکرام سے اسے نوازا۔ ادھر اسماء کے باپ عوف بن مالک کی مالی حالت قحط اور خشک سالی کی وجہ سے بہت خراب ہو گئی تھی چنانچہ اس کے پاس قبیلہ مراد کا ایک آدمی آیا اور اس نے اسماء کا رشتہ مانگا۔ اور کہا کہ اس کے بدلے میں ایک سو اونٹ دوں گا۔ ایک سو اونٹ اس زمانے میں بڑی مالیت کا سودا تھا چنانچہ اسماء کے باپ نے سو اونٹ لے کر اس کی شادی مرادی سے کر دی۔ جب مرقش دربار میں سے واپس آیا تو اس کے بھائیوں کو یہ خطرہ ہوا کہ اگر مرقش کو اسماء کی شادی کا علم ہوگا تو اسے بہت دکھ ہوگا اور عین ممکن ہے کہ وہ مرادی سے بدلہ لے اور اس طرح ان کے قبیلہ اور مراد کے قبیلہ کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ اس لیے انہوں نے اس خبر کو اس سے چھپانے کے لیے یہ ترکیب کی کہ ایک بکرا لے کر اسے ذبح کیا اس کا گوشت تو کھا گئے لیکن ہڈیاں وغیرہ لے کر ایک کپڑے میں باندھ کر ایک جگہ دفن کر دیں۔ اور اس پر قبر بنا دی۔ جب مرقش قبیلہ میں واپس پہنچا اور اس نے اسماء کے متعلق پوچھا تو بھائیوں نے کہا کہ وہ تو مر گئی۔ جب مرقش کو یقین کرنے میں تامل ہوا تو اسے اس بکرے کی قبر پر لے گئے اور کہا کہ یہ دیکھو اس کی قبر ہے۔ یہ سن کر مرقش کو بہت رنج ہوا اور اس نے اپنا معمول بنا لیا کہ روز قبر پر جاتا اور گھنٹوں وہیں بیٹھا رہتا۔

ایک دن اسماء کی قبر کے پاس چادر اوڑھے لیٹا تھا کہ اس کے دو بھتیجے آپس میں ایک ہڈی پر لڑنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ ہڈی تو میری ہے۔ اسے تو میرے باپ نے مجھے اس وقت دیا تھا جب وہ بکرا ذبح ہوا تھا جس کی یہ قبر ہے اور جس کے متعلق یہ طے کیا گیا تھا کہ مرقش کو اس کی قبر دکھا کر یہ کہہ دیں گے کہ اسماء مر گئی ہے اور یہ اس کی قبر ہے۔ یہ سن کر مرقش اٹھ بیٹھا۔ ان لڑکوں کو بلایا اور پوچھا کہ کیا قصہ ہے۔ لڑکے نے سارا ماجرا بتا دیا اور یہ کہا کہ مرادی اسماء کو لے کر اپنے قبیلہ میں چلا گیا ہے۔ اب مرقش کو غصہ کے مارے تاب نہ رہی۔ اور اس نے طے کر لیا کہ مرادی کو قتل کر دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے چرواہے (جو عقیلہ[1] قبیلہ کا ایک فرد تھا) اور اس کی بیوی کو ساتھ لیا (جو اس کی لونڈی تھی) اور اسماء کے شوہر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے جب نجران کے پاس جنان (۲)

۱۔ اصفہانی نے الاغانی ج ۵ صفحہ ۱۹۰ میں "غفیلہ" نام لکھا ہے۔ المفضل نے المفضلیات صفحہ ۴۶۸ میں قبیلہ کا نام "غفیلہ" ذکر کیا ہے۔

۲۔ اس غار کا نام خبان، خیان اور جنان بھی ذکر کیا گیا ہے۔

نامی غار کے پاس پہنچے تو مرقش سخت بیمار ہو گیا۔ یہ غار قبیلہ مراد کے علاقہ میں واقع تھا۔ مرقش کے چرواہے نے اسے اس غار میں ڈال دیا اور دو ایک دن تک اس کی تیمارداری کرتا رہا۔ جب دیکھا کہ اس کی حالت گرتی جا رہی ہے تو اپنی بیوی سے کہا۔ "یہ تو اب بچے گا نہیں۔ آؤ اسے یہیں چھوڑ دیں اور واپس اپنے گھر چلیں" لونڈی یہ سن کر رونے لگی اور بولی کہ اسے اس حال میں یہاں چھوڑ کر میں نہیں جا سکتی۔ اس پر چرواہا بولا کہ اچھا تم یہیں رہو میں بھوکا پیاسا مرا جا رہا ہوں۔ مجھ سے اب نہیں ٹھہرا جاتا۔ مجبوراً اس کی بیوی بھی چلنے پر تیار ہو گئی۔ مرقش اس کی یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ چنانچہ اس نے موقع پا کر چرواہے کے کجاوے کی پچھلی لکڑی پر مندرجہ ذیل شعر لکھ دیئے

یا صاحبی تلوما لا تعجلا — إن الرحیل رهین ان لا تعذلا

فلعل بطأكما يفرط سيئاً — أو يسبق الإسراع سيباً مقبلا

يا راكباً[1] إما عرضت فبلغن — أنس بن سعد إن لقيت وحرملا

لله دركما ودر أبيكما — ان أفلت الغفلي حتى يقتلا

من مبلغ الأقوام ان مرقشا — أمسى على الأصحاب عبأ مثقلا

ذهب السباع بأنفه فتركنه — اعثى عليه بالجبال وجيئلا

وكأنما ترد السباع بشلوه — اذ غاب جمع بني ضبيعة منهلا

یعنی۔ اے میرے دونوں ساتھیو! ذرا انتظار کر لو۔ اتنی جلدی نہ کرو کیونکہ اگر اس سفر میں تم نے کامیابی حاصل کر لی تو پھر تم لعنت ملامت سے بچے رہو گے۔ ممکن ہے کہ تم پر کوئی مصیبت آنے والی ہو تو وہ اس انتظار کی وجہ سے ٹل جائے۔ یا کوئی نفع بخش چیز حاصل ہونے والی ہو تو تمہارے جلدی جانے کی وجہ سے تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے۔ اے دونوں سوارو! جب تم قبیلہ میں پہنچ جاؤ تو انس بن سعد سے اور حرملہ سے ملاقات ہو (یہ دونوں مرقش کے بھائی تھے) تو ان سے کہنا کہ خدا تمہارا اور تمہارے باپ کا بھلا کرے کیا "غفلی" (چرواہا) بغیر قتل ہوئے بچ رہے گا۔ کون ہے جو میری قوم کو یہ بتلا دے کہ مرقش دوستوں کے لیے ایک بھاری بوجھ بن گیا تھا اور یہ کہ درندوں نے اس کی ناک کھالی ہے اور اسے پہاڑوں

---

[1] بعض روایتوں میں راکبا (واحد) بھی آیا ہے مگر تثنیہ اس موقع پر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ مخاطب دو تھے۔ چرواہا اور اس کی بیوی

میں بجوؤں کے حوالے کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو ضبیعہ نے جب اس کی کوئی خیر خبر نہ لی، تو درندوں نے اس کی بچی کھچی ہڈیوں کو اپنا گھاٹ بنا لیا۔

چرواہا اپنی بیوی کو لے کر مرقش کو اسی حالت میں چھوڑ گھر کو واپس ہو گیا۔ جب یہ دونوں مرقش کے قبیلے میں پہنچے اور لوگوں نے مرقش کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ مرقش مر گیا۔ اتفاقاً مرقش کے بھائی حرملہ کی نظر چرواہے کے کجاوے پر پڑ گئی۔ اس پر اسے کچھ لکھا نظر آیا۔ چنانچہ اس نے جو غور کیا تو مذکورہ بالا اشعار اس کی سمجھ میں آ گئے۔ اس نے بلا کر چرواہے اور اس کی بیوی کو ڈرایا دھمکایا کہ صحیح بات بتا دو۔ چنانچہ اس نے پورا قصہ بتا دیا کہ فلاں غار میں ہم اسے انتہائی خراب حالت میں چھوڑ آئے تھے۔ یہ سن کر حرملہ کو طیش آ گیا اور اس نے چرواہے کو فوراً قتل کر دیا اور خود بھائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

ادھر مرقش بے یار و مددگار اس غار میں پڑا رہا۔ اتفاق سے ایک چرواہا ادھر سے گزرا۔ اس کی نظر غار میں پڑی تو اس نے مرقش سے پوچھا کہ بھئی تم کون ہو اور یہاں کیسے پڑے ہو۔ مرقش نے کہا کہ میں قبیلہ مراد کا ایک فرد ہوں اور بیمار ہو کر یہاں پھنس گیا ہوں۔ اچھا تم کون ہو۔ تو چرواہا بولا کہ فلاں شخص کا چرواہا ہوں۔ اتفاق سے یہ اسماء کے شوہر کا نام تھا۔ مرقش نے کہا کہ کیا تم مالک کی بیوی اسماء سے کچھ کہہ سکتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ نا صاحب یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ اس سے بات کرنا تو دور رہا آج تک اس کو کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ مرقش نے کہا کہ اس سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی طریقہ ہے۔ جی ہاں، چرواہا بولا۔ جب شام کو میں ریوڑ لے کر گھر جاتا ہوں تو اسماء کی لونڈی ایک برتن لے کر آتی ہے اس میں بکری کا دودھ دوہ کر دے دیتا ہوں وہ اسماء کو لے جا کر پلاتی ہے۔ اچھا تو ایک کام کرو۔ مرقش نے کہا آج شام کو بکری کا دودھ دوہنا تو برتن میں چپکے سے میری یہ انگوٹھی ڈال دینا۔ اس کے بدلے میں تم کو اتنا انعام ملے گا جتنا آج تک کسی چرواہے کو نہ ملا ہو گا۔ چنانچہ چرواہے نے ایسا ہی کیا۔ جب اسماء نے دودھ پینا شروع کیا تو انگوٹھی اس کے دانت سے لگی۔ وہ چونکی۔ اس نے روشنی میں دیکھا تو انگوٹھی نکلی۔ اب اس نے لونڈی کو بلا کر پوچھا کہ یہ انگوٹھی اس برتن میں کیسے پڑ گئی؟ اور یہ کس کی ہے؟ لونڈی نے جب لاعلمی ظاہر کی تو اسماء نے اپنے شوہر کو جو اس وقت قبیلہ سے باہر تھا بلوا بھیجا اور کہا کہ مجھے دودھ کے برتن میں یہ انگوٹھی ملی ہے۔ اپنے چرواہے کو بلا کر پوچھو کہ یہ دودھ میں کیسے آ گئی اور یہ کس کی ہے۔ چنانچہ جب اس کے شوہر نے چرواہے سے انگوٹھی کا قصہ پوچھا تو اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور کہا کہ وہ نوجوان غار میں پڑا دم توڑ رہا ہے۔ یہ سن کر اسماء بولی ہو نہ ہو یہ مرقش

ہی ہے۔ جلدی کرو۔ فوراً چلو اس کی خبر لیں۔ چنانچہ میاں بیوی دونوں فوراً نکل کھڑے ہوئے جب غار پر پہنچے تو دیکھا کہ مرقش بری حالت میں پڑا ہے اور اس کی ناک درندوں نے کھالی ہے چنانچہ دونوں نے اسے نکالا اور اپنے قبیلہ میں لے آئے یہاں پہنچ کر مرقش نے دم توڑ دیا اور وہیں دفن کر دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ مرقش کا بھائی جب غار کے پاس پہنچا اور پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ مرقش کو اسمار اور اس کا شوہر آ کر لے گئے ہیں اور وہ وہاں جا کر مرگیا ہے یہ خبر سن کر حرملہ اپنے گھر واپس آگیا اور قبیلہ مراد میں نہیں گیا۔ راویوں نے کہا ہے کہ مرنے سے پہلے غار کے اندر مرقش نے ایک بڑا خوبصورت اور پرسوز قصیدہ کہا تھا جس کے اشعار تھے۔

سری لیلا خیال من سلیمی ۔۔۔ فأرقنی وأصحابی ھجود

فبت أدیر أمری کل حال ۔۔۔ وأرقب أھلھا وھو بعید

علی أن قد سما طرفی لنار ۔۔۔ یشب لھا بذی الارطی وقود

حوالیھا مھاجو التراقی ۔۔۔ وآرام وغزلان رقود

نواعم لاتعالج بؤس عیش ۔۔۔ اوانس لاتراح ولاترود

یرحن معًا بطاء المشی بدًّا ۔۔۔ علیھن المجاسد والبرود

سکن ببلدۃ وسکنت اخری ۔۔۔ وقطعت المواثق والعھود

فما بالی أفی ویخان عھدی ۔۔۔ وما بالی اصاد ولا أصید

ورب اسیلۃ الخدین بکر ۔۔۔ منعمۃ لھا فرع وجید

وذو أشر شیتت النبت عذب ۔۔۔ نقی اللون برّاق برود

لھوت بھا زمانا من شبابی ۔۔۔ وزارتھا النجائب والقصید

أناس کلما اخلقت وصلا ۔۔۔ عنانی منھم وصل جدید (1)

یعنی رات کے سناٹے میں جب میرے دوست خراٹے لے رہے تھے تو مجھے یکایک سلیمی کی یاد تڑپا گئی اور ہر پہلو سے اپنے معاملہ پر غور کرنے لگا۔ اور خیالوں ہی میں اس کے گھر والوں کو دیکھتا رہا حالانکہ وہ لوگ مجھ سے بہت دور تھے۔ اتنے میں میری نگاہ ایک

---

(1) المفضلیات ۔۔ للضبی۔ صفحہ ۲۶۰ قصیدہ نمبر ۴۹۔ تحقیق لائل۔

آگ پر پڑی جیسے لکڑیاں ڈال کر خوب روشن کیا جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد خوب پر گوشت نیل گائیں بھتا اور ہرنیاں لیٹی ہوئی تھیں (یعنی اس آگ کے ارد گرد خوب گدرائی اور حسین وجمیل دوشیزائیں لیٹی ہوئی تھیں) یہ بڑی ناز پروردہ تھیں۔ انہیں زندگی کی مشقتوں کی کوئی فکر نہ تھی۔ اور نہ انہیں تلاش معاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کی ضرورت تھی۔ اور جب یہ سب ایک ساتھ چلتی تھیں تو اپنی رانوں کے پر گوشت ہونے کی وجہ سے ہولے ہولے قدم دھرتی تھیں۔ یہ دوشیزائیں زعفرانی رنگ کے کپڑوں اور چادروں میں ملبوس تھیں۔ یہ مجھ سے الگ ہو کر دور ایک شہر میں جا بسیں اور میں دوسرے ہی شہر میں رہ گیا۔ اور ان سے ملنے کے سارے عہد و پیمان ٹوٹ کر رہ گئے۔ (یعنی عوف شادی کرنے کا وعدہ کر کے پھر مکر گیا) تو جب مجھ سے وعدہ خلافی کی گئی ہے تو میں ہی کیوں وعدہ وفا کروں۔ اور کیوں میں شکار بن جاؤں۔ اور خود شکار نہ کروں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک چکنے رخساروں والی کنواری دوشیزہ کے ساتھ جس کے بال بڑے نرم وچمکدار تھے اور جس کے دانت چھدرے موزوں اور حسین تھے اور جس کا لعاب دہن بڑا شیریں صاف ستھرا چمکیلا اور ٹھنڈا تھا میں نے اپنی جوانی کے دنوں میں خوب دل کھول کھول کر اسے داد عیش و عشرت دی ہے۔ اور اس سے ملنے کی خاطر موٹی تازی اور خالص نسل کی اونٹنیاں جاتی تھیں (یعنی ایسی اونٹنیوں پر بیٹھ کر میں اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اس دوشیزہ سے یا اس کے گھر والوں سے جب تعلقات بگڑ جاتے تھے تو مجھے نئے سرے سے تعلقات جوڑنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

یہ قصیدہ مرقش کے کلام کا بہترین نمونہ ہے اور سلاست و روانی۔ اثر و سوز اور نغمگی و موسیقیت میں مرقش کے سارے کلام پر بھاری ہے۔

اسماء سے رشتہ مانگنے کے سلسلہ میں ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبیلہ مراد کے قرن الغزال نامی ایک شخص نے بھی اس کا رشتہ مانگا تھا۔ آدمی مالدار تھا۔ چنانچہ عوف نے چپکے سے اسماء کی شادی اس سے کر دی اور اس ڈر سے کہ اگر مرقش اس کا علم ہو گیا تو وہ قرن الغزال کو مار ڈالے گا، رخصتی نہیں کی۔ اتفاق سے مرقش اپنے اونٹ چرانے چلا گیا اور باپ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسماء کو مرادی کے ساتھ رخصت کر دیا۔ جب مرقش چراگاہ سے واپس آیا اور ایک لڑکے کے ذریعہ اسے اسماء کی شادی اور رخصتی کا علم ہوا تو اسے بہت غصہ آیا اور وہ تلوار لگا کر قرن الغزال کو مارنے کے لیے چل نکلا۔ جب پاس پہنچا اور لوگوں نے اسے آتے دیکھا تو قرن الغزال سے کہا کہ دیکھو یہ مرقش آ گیا۔ یہ تم سے انتقام ضرور لے گا اس لیے تم تو یہاں سے آگے

بڑھ جاؤ اور اسماء سے کہا کہ جب وہ تیرے پاس پہنچے تو تم ہودہ سے منہ نکال کر اسے بلا لینا اور باتوں میں لگا لینا۔ اتنے میں اس کے بھائی آجائیں گے اور وہ مرقش کو واپس لے جائیں گے۔ اور اس طرح تمہارا شوہر بچ جائے گا۔ چنانچہ یہ ترکیب چل گئی۔ اسماء اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی اتنے میں مرقش کے بھائی انس اور حرملہ آگئے اور اسے خوب برا بھلا کہا اور زبردستی واپس لے گئے۔ مرقش کو اب اسماء کے ملنے سے پوری ناامیدی ہوگئی۔ اور اس نے ایک بڑا موثر قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا۔

أمِن آل اسماءٔ الرسوم الدوارس — يخطط فيها الطير قفر بسابس

ذكرت بها اسماءٔ لو أن وَليها — قريب ولكن حبستني الحوابس(1)

یعنی یہ مٹتے نشانات منزل اسماء کے گھر والوں کے ہیں۔ لیکن اب یہاں ایسی ویرانی پھیلی ہے کہ چڑیوں نے اسے اپنی آماجگاہ بنالی ہے۔ مجھے یہ نشانات دیکھ کر اسماء بے اختیار یاد آگئی اور باوجودیکہ اس کی منزل یہاں سے قریب ہی تھی لیکن میں وہاں تک بعض رکاوٹوں کی وجہ سے نہ جاسکا۔

مرقش نے ایک اور قصیدہ کہا ہے جس میں اسماء سے دوری اور مجبوری کا بڑے دکھ درد سے تذکرہ کیا ہے۔ کہتا ہے:

یہ دل اسماء کی محبت میں ایسا سرشار اور بے خود ہے کہ کسی چیز کی سدھ بدھ نہ رہی۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ محبت اور عشق کا یہی انجام ہے۔

مرقش کے دل و دماغ پر اسماء اس طرح چھائی تھی کہ ہر جگہ اور ہر چیز میں اسی کا جلوہ دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے اس کا سارا کلام اس کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ ایک جگہ اسما کا بہت ہی حسین سراپا کھینچتا ہے۔ کہتا ہے:

ألا بان جيراني ولست بعائف — أدان بهم صرف النوى أم مخالفي

وفي الحيّ ابكار سبين فؤاده — علالة ما زوّدنه والحب شاعفي

دفاق الخصور لم تعفرق رونها — لشجو ولم يحضرن حمّى المزالف(2)

نواعم ابكار سرائر بُدّنٌ — حسان الوجوه ليّنات السوالف

يهدّلن في الآذان من كل مذهب — له بذيعيا به كل واصف

---

(1)۔ المفضلیات۔ قصیدہ نمبر ۴۷۔ صفحہ ۴۹۲

(2)۔ حمی بحار۔ المزالف۔ بڑے قصبے جیسے قادسیہ اور انبار۔

ترجمہ ـــــ یعنی میرے پڑوسی مجھ سے بچھڑ گئے تو میں چڑیوں کو اڑا کر یہ فال نہیں نکالوں گا کہ دوری ومہجوری کی مصیبتیں مجھے ان سے قریب کریں گی یا دور ہی رکھیں گی۔

اور قبیلہ میں ایسی دوشیزائیں ہیں جنھوں نے میرے دل کو پوری طرح اپنا قیدی بنالیا ہے اور بغیر کچھ لیے دیئے اپنے بس میں کرلیا ہے اور میری یہ حالت ہے کہ ان کی محبت رگ وپے میں سرایت کرگئی ہے

ان دوشیزاؤں کی کمر پتلی ہے اور ایسی ناز پروردہ ہیں کہ وہ رنج وغم اور بیماری وآزاری کو جانتی بھی نہیں۔

یہ بڑی نرم ونازک اور گدرائی کنواریاں ہیں جن کے چہرے حسن سے دمکتے اور جن کی گردنیں نرمی سے لچکتی ہیں۔

یہ اپنے کانوں میں سونے کے حسین آویزے پہنے ہیں اور ان میں ایسی دلکش جنبش ہوتی ہے کہ جن کا بیان کرنا ممکن نہیں۔

آگے چل کر ان کے انداز دلربائی کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

نصرن شقیًا لا یبالین غیّہ　　　یعوجن من أعناقہا بالمواقف

یعنی ـــــ یہ دوشیزائیں اپنے اونٹوں کو پھیر کر آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور پھر اس کے چھیڑ چھاڑ کو برا نہیں مانتیں۔ (بلکہ لطف لیتی ہیں) اور چپکے چپکے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہیں اس انداز سے کہ ہر کس وناکس انھیں سن نہ سکے۔

نثرن حدیثًا آنسًا فوضعنہ　　　خفیفًا فلا یلغی بہ کل طائف"(1)

مرقش نے بعض اشعار فخریہ بھی کہے ہیں۔ ان میں سے نمونے کے یہ اشعار ہیں۔

ہلا سألت بنا فوارس وائل　　　فلنحن أسرعہا الی أعدائہا

ولنحن أکثرہا إذا عُدّ الحصی　　　ولنا فواضلہا ومجد لوائہا

ترجمہ　　ہماری شجاعت اور بہادری کے متعلق وائل کے شہسواروں سے پوچھو وہ تمہیں بتائیں گے کہ ہم اس کے دشمنوں کی طرف اس سے بھی زیادہ تیزی سے جاتے ہیں اور اگر ہماری تعداد گنی جائے تو ہم سنگریزوں سے بھی زیادہ نکلیں گے اور ہمارے لیے

1۔ المفضلیات۔ ص۲۲۴

ساری فضیلتیں اوران کے جھنڈے کی عزت وآبرو ہے۔
کچھ فخریہ اشعار اس کے اس مشہور قصیدہ میں بھی ہیں جس کا مطلع ہے :

هل بالديار ان تجيب صمو لو كان رسو نا طقا كلمو[1]

مرثیہ میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اس فن میں اس کا رنگ جم نہ سکا۔ مرقش الاکبر نے جیسا کہ اوپر بیان ہوا مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن جاہلی شعراء میں صنف غزل میں جو امتیاز اسے حاصل ہے اور جو درد وکسک اس کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عشق میں زندگی گزاری۔ اور اس کی خاطر اپنی جان دیدی۔ اس کی غزل درحقیقت اس کی زندگی کے المیہ کی کہانی ہے۔ جو شعر میں ڈھل کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔

---

(۱) پورے قصیدے کے لیے دیکھئے المفضلیات صفحہ ۴۸۵

حوالے

۱۔ المفضليات لمحمد الضبي تحقيق چارلس جیمس لائل
۲ الاغانی۔ جلد ۵
۳۔ البیان والتبیین۔ جلد اول تحقیق عبدالسلام محمد ہارون
۴۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔
۵۔ خزانة الادب للالوسی
۶۔ معجم المرزبانی
۷۔ دائرة المعارف الاسلامیہ۔
۸۔ تاریخ آداب اللغة العربیہ۔ جرجی زیدان
۹۔ المفضليات للضبي تحقيق : احمد محمد شاکر اور عبدالسلام محمد ہارون

عَلقمۃ الفحل

م ۔ ۶۲۵ء یا ۵۹۸ء

علقمہ الفحل (نر علقمہ) جاہلی شعراء میں اصحاب المنتقیات کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے جن کا درجہ اصحاب المجمہرات کے بعد آتا ہے۔ عبدالسلام الجمحی نے شعرائے جاہلیت کے چوتھے طبقہ میں عبید بن الابرص کے بعد اس کا ذکر کیا ہے۔ علقمہ قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا پورا نام علقمہ بن عبدہ تھا۔(۱)

کہتے ہیں کہ جاہلی شعراء میں علقمہ وہ شاعر ہے جس نے امرؤ القیس جیسے پرگو شاعر کو میدان شعر و سخن میں شکست فاش دی تھی اور اسی جیت کے نتیجے میں اس کا لقب "الفحل" یعنی "نر" ہو گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ امرؤ القیس نے قبیلہ طے کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی جس کا نام اُمِّ جُندُب تھا۔ ام جندب امرؤ القیس کو کچھ بہت زیادہ اس وجہ سے پسند نہیں کرتی تھی کہ اس کے پسینے سے بو آتی تھی۔ اور شاید کچھ فطری کمزوریاں بھی تھیں جن کا ذکر امرؤ القیس کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ علقمہ امرؤ القیس کا دوست تھا۔ اور اپنے زمانے کا نامور مشہور شاعر۔ ایک دن علقمہ بھی قبیلہ طے میں آن پہونچا اور امرؤ القیس کی سسرال میں ٹھہرا۔ باتوں باتوں میں معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ دونوں نے ایک دوسرے سے بڑا شاعر ہونے کا دعوی کر دیا۔ آخر میں بات اس پر ٹھہری کہ دونوں ایک ہی قافیہ اور ردیف میں اپنی شاعری کے جوہر دکھائیں۔ پاس ہی ام جندب بھی کھڑی تھی۔ علقمہ نے کہا کہ اور ہمارے تمہارے درمیان تمہاری بیوی ثالث ہوگی۔ جس کے حق میں یہ فیصلہ دیدے وہ بڑا شاعر۔ اس پر دونوں راضی ہو گئے۔ ام جندب نے کہا کہ اچھا تم دونوں اپنے گھوڑے سے شکار کرنے

---

(۱) پورا سلسلہ نسب یوں ہے: علقمہ بن عبدہ بن النعمان بن قیس اسد بن عبید بن ربیعہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم بن مر بن اد بن طابخہ بن الیاس بن مضر بن نزار۔ طبقات فحول الشعراء ص ۱۲۶

کا منظر کھینچو مگر ردیف اور قافیہ ایک ہی ہو۔ چنانچہ امرؤ القیس نے اپنا وہ مشہور قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

خلیلی مرّا بی علی اُم جندب   لنقضی حاجات الفوأد المعذب"[1]

یعنی اے میرے دونوں دوستو! ذرا مجھے ام جندب کے پاس لے کر چلو تاکہ ہم اپنے غم کے مارے دل کی (ضرورتیں) دکھ درد تو ختم کریں۔

اس کے بعد محبوبہ کے قافلہ کی روانگی، ہجر و فراق کا نقشہ کھینچتا ہے۔ پھر اپنی اونٹنی کی تعریف شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میری اونٹنی بڑی گرانڈیل لمبی چوڑی اور سفید رنگ کی ہے اور اتنی تیز رفتار کہ لگتا ہے کہ اس کا کجاوا اس پر نہیں بلکہ ایک خوبصورت تنومند زبرے کی پیٹھ پر کسا ہوا ہے۔

اس کے بعد اپنی مہم جوئی کا ذکر کرتا ہے اور یہ سفر اپنے اس کم بال والے گھوڑے پر بیٹھ کر کرتا ہے جو جنگلی جانوروں کو اپنی برق رفتاری کی وجہ سے بھاگنے نہیں دیتا اور مدتوں شکار کو بھگا کر پکڑنے کی وجہ بہت دبلا پتلا ہو گیا ہے۔ اور یہاں سے اپنے اس نامی گھوڑے کا وصف شروع کر دیتا ہے اور اس کے انگ انگ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اس کی چال ڈھال بتاتا ہے۔ گھوڑے کے اوصاف بیان کرنے کے بعد اس کے ذریعہ سے ایک جانور کے شکار کرنے کا منظر کھینچتا ہے۔ اور یہی وہ شعر ہے جو اس شعری مقابلہ میں ہار جیت کی بنیاد بنا۔ چنانچہ کہتا ہے کہ "جب اسے ایڑ لگاؤ تو وہ اتنی تیزی سے بھاگتا ہے جتنی تیزی سے آگ لگتی ہے۔ اور جب کوڑا مارو تو تیر کی طرح گردن کو آگے کر کے ہوا ہو جاتا ہے اور جب ڈانٹو تو تیز رفتار سفید رنگ کے نر شتر مرغ کی طرح سرپٹ ہو جاتا ہے۔ میرے ان اوصاف کے گھوڑے نے لوگی طرح تاکر ایک ہی از قند میں شکار کو بغیر موڑے ہوئے اور بغیر تھکے ہارے قابو میں کر لیا۔

فللساق الهوب وللسوط درة   وللزجر منه وقع أهوج مهذب

فادرك لم يجهد ولم يثن شأوه   يمر كخذروف الوليد المثقب

اس کے بعد اس شکار کو کس طرح پکایا گیا اور یاران خوش باش و سرمست کے ساتھ کس طرح کھایا گیا اس کا ذکر کرتا ہے اور اس پر یہ قصیدہ ختم ہو جاتا ہے جس میں بروایت ابوالحسن الاشنو ۵۲ شعر ہیں[2]۔

۱۔ دوسرا مصرعہ اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے۔ نقض لبانات الفؤاد المعذب

۲۔ ملاحظہ کیجیے۔ شعراء النصرانیہ للیسوعی صفحہ ۲۳ اس کتاب میں امرؤ القیس کے مذکورہ شعر کا دوسرا مصرعہ یوں آیا ہے۔   وللزجر منه وقع اهوج منعب

جب امرؤ القیس اپنا قصیدہ پڑھ چکا تو ہمارے شاعر علقمہ کی باری آئی۔ چنانچہ اس نے بھی اسی ردیف اور قافیہ میں اپنا قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

ذھبت من الھجران فی غیر مذھب ولم یکن حقا کل ھذا التجنب

تم تو ہجر و فراق سے اتنے دل برداشتہ اور کبیدہ خاطر ہو گئے کہ رہ و رسم عاشقی کو بھلا کر دوسری ڈگر پر ہو لیے حالانکہ اس طرح بالکل ترک محبت راہ وفا کے خلاف ہے۔

اس کے بعد امرؤ القیس کے جواب میں اس نے بھی پہلے اپنی اونٹنی پھر اپنے گھوڑے کا وصف بیان کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ میرا گھوڑا تن و توش میں صحرائی نر شتر مرغ کی طرح ہے۔ امرؤ القیس کے گھوڑے کا رنگ اگر سفید ہے تو میرے گھوڑے کا رنگ حنائی ہے۔ اس کے اگلے پاؤں میں بہت کم بال ہیں اور منہ جیسے غنچہ۔ اس کا سینہ خمیدہ، سر اور گردن بہت دبلے پتلے، جنگلی جانوروں کو مستقل دوڑاتے رہنے سے جسم بڑا چھریرا اور چال ایسی متوالی ہوا بردوش کہ صبا کو بھی پیچھے چھوڑے جائے۔ ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر میں صبح سویرے جب کہ چڑیاں بھی اپنے گھونسلوں میں سے نہیں نکل ہوتی ہیں نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

وقد اغتدی والطیر فی وکناتھا وماء الندی یجری علی کل مذنب

بمنجرد قید الأوابد لاحه طراد الھوادی کل شاؤ مغرب

کمیت کلون الارجوان نشرته لبیع الرداء فی الصوان المکعب

اس کے بعد سیر و شکار کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اپنے مذکورہ اوصاف والے گھوڑے پر اپنی مہم پر چلا جا رہا تھا کہ ہم نے ... اور نیل گایوں کی ڈاروں اس شان سے اٹھلاتی، اتراتی جھاڑیوں کو چیرتی دکھائی دیں جیسے وہ بھاری بھر کم زرق برق عبائیں پہنے دوشیزائیں ہوں۔ اور جب وہ سامنے آئیں تو میرا یہ تیز گام گھوڑا ان پر ٹوٹ پڑا۔ وہ محض اپنی لگام کی رسی کے اشارے سے ہی تیزی سے جھپٹ کر اس نے ان کو پکڑ لیا۔ (یعنی اسے نہ ایڑ لگانے کی نہ ڈانٹنے کی اور نہ ایڑ لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ بلکہ صرف اشارے پر ہی اس نے شکار کو دبوچ لیا۔)

رأینا شیاھا یرتعین خمیلة کمشی العذاری فی الملاء المھذب

۱۔ المفضل الضبی نے "المفضلیات" میں دوسرا مصرعہ یوں لکھا ہے:

ولم یکن حقا طول ھذا التجنب

نبیت تماریہا وعقد عہدا ماہ — خرجن علینا کالجمان المثقب
واقبل یھوی ثانیا من عنائہ — یمر کمرّ الرائح المتحلب[1]

آخر الذکر ہی شعر تھا جس کی وجہ سے اسے امرؤالقیس کے مقابلہ میں جیت ہوئی۔ اس کے بعد پھر اپنے گھوڑے کی تعریف کرتا ہے۔ اور شکار کرنے کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد امرؤالقیس ہی کی طرح اس شکار کو کھانے اور اس کی ہڈی گڈی کے اپنے خیمے کے ارد گرد پھیلے رہنے کا ذکر کرتا ہے۔ علقمہ کے اس قصیدہ میں ۴۴ شعر ہیں۔

جب دونوں شاعر اپنا اپنا قصیدہ سنا چکے تو ام جندب نے امرؤالقیس کو مخاطب کر کے کہا۔ " علقمہ کا گھوڑا تمہارے گھوڑے سے اچھا ہے۔" اس پر امرؤالقیس بولا کہ وہ کیسے۔ تو عورت نے جواب دیا کہ " تمہیں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگانے، کوڑا مارنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے کی ضرورت پڑی۔ برخلاف اس کے علقمہ کے گھوڑے نے محض لگام کے اشارے سے ہی اپنے شکار کو دبوچ لیا۔" امرؤالقیس نے کہا کہ نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ تمہارا دل علقمہ پر آگیا ہے۔ اس لیے اس کی تعریف کر رہی ہو اور اس سے خفا ہو گیا۔ اور فوراً طلاق دیدی۔ چنانچہ علقمہ نے اس سے شادی کر لی اور اسی دن سے اس کا لقب " نر" (الفحل) ہو گیا۔

بعض رواۃ نے یہ بھی کہا ہے کہ علقمہ کو " الفحل" (نر) اس لیے کہتے تھے کہ اس کے قبیلہ کا ایک اور شاعر بھی علقمہ کے نام سے اسی زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ موخر الذکر علقمہ کو " الخصی" کہتے تھے۔ اس لقب کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ایک دفعہ یہ علقمہ یمن میں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا مگر موقع پا کر قید سے نکل بھاگا۔ لیکن اس کے دشمنوں نے پتہ لگا کر اسے پکڑ لیا۔ علقمہ پھر قید سے بھاگ نکلا مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور پھر پکڑا گیا۔ اب کی دفعہ اس کے دشمنوں نے اس جرم کی سزا میں اسے بدھیا کر دیا اور اسی دن سے اس کا لقب علقمہ الخصی یعنی " بدھیا علقمہ" پڑ گیا۔[2] تاکہ اس میں اور

۱۔ تذکرہ کی کتابوں میں اس شعر کے بارے میں جس سے علقمہ کو جیت ہوئی اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض نے یہ شعر لکھا ہے۔

اذا ما اقتنصنا لم نقد بجنیبۃ — ولکن ننادی من بعید ألا ارکب

اس قصہ میں بھی تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے " المفضلیات" صفحہ ۴۲،

۲۔ " علقمہ الخصی" کا پورا سلسلۂ نسب یہ ہے ـــ علقمہ بن سہیل بن ربیعہ بن مالک (باقی صفحہ ۳۰۹ پر)

ہمارے شاعر علقمۃ الفحل میں امتیاز کیا جا سکے۔

مذکورہ بالا قصہ کی حیثیت

نقادوں نے علقمۃ الفحل اور امرؤ القیس کے درمیان اس مقابلہ کی صحت کے بارے میں خاصے شکوک کا اظہار کیا ہے چنانچہ ڈاکٹر شوقی ضیف نے لکھا ہے۔ "خیال یہ ہے کہ یہ قصہ اور اس سے متعلق دونوں شاعروں کے دونوں قصیدے بعد کی ایجاد ہیں۔ اور اصلیت سے ان کا تعلق نہیں"۔ قدماء میں سے جن نقادوں نے ان کے بارے میں شک کا اظہار کیا ہے ان میں قابل ذکر ابن المعتز ہے۔[1] اور المرزبانی نے اپنی کتاب الموشح میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

جدید علماء میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی یہی رائے قائم کی ہے یہ قصہ اور اس سے متعلق اشعار من گھڑت کہانیاں ہیں کیونکہ دونوں قصیدوں میں ایسی سلاست و روانی معانی میں ایسی نزاکت اور باریک بینی ہے جو اسلامی عہد کی غمازی کرتی ہے۔ پھر ان دونوں قصیدوں میں صرف معانی میں ہی توارد نہیں ہے بلکہ الفاظ اور بعض اشعار میں بھی توارد پایا جاتا ہے۔[2] اور سب سے بڑی وجہ اس قصہ اور ان قصیدوں کی صحت کے بارے میں شک کرنے کی یہ ہے کہ ان دونوں شاعروں کے وہ اشعار جن کی بدولت ایک کو فتح اور دوسرے کو شکست ہوئی علماء میں ان کے بارے میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ چنانچہ علقمۃ الفحل کے اس شعر کو جس کی بنا پر ام جندب نے اسے امرؤ القیس سے بڑا شاعر ہونے

(بقیہ) بن زید مناۃ بن تمیم۔ اس کی کنیت ابوالوضاح تھی اور عمان کے علاقہ میں رہتا تھا۔ (تفصیل کتاب الشعر والشعراء۔ لابن قتیبہ)

(۱) ابن قتیبہ نے تیسری دفعہ بھاگنے پر غصی کیے جانے کا ذکر کیا ہے۔ ابن المعتز نے ایک کتاب تذکرہ شعرائے عرب پر لکھی تھی۔ تفصیل امیر المومنین ابن المعتز کے حالات زندگی میں ملے گی۔ دیکھیے حاشیہ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، جرجی زیدان، جلد اول۔ صفحہ ۱۳۹

(۲) جیسے امرؤ القیس کے قصیدہ کا تیرھواں، چودھواں اور بیسواں شعر کہ علقمہ کے آٹھویں، نویں اور پانچویں شعر سے لفظاً بلفظ ملتے ہیں۔ چنانچہ امرؤ القیس نے کہا ہے۔

وقد اغتدی والطیر فی وکناتھا   وماء الندی یجری علی کل مذنب

بمنجرد قید الأوابد لاحہ

طراد الھوادی کل شأو مغرب

اور بالکل انہیں الفاظ کے ساتھ یہی اشعار علقمہ کے قصیدہ میں بھی ملتے ہیں۔

کا فتوی دیا۔ اور جس میں کہتا ہے کہ

فأدرکهن ثانیا من عنانه   یمر کمر الرائح المتحلب

امرؤالقیس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح امرؤالقیس کے اس شعر کو جس کی بنا پر اسے علقمہ کے مقابلے میں شکست ہوئی اسے علقمہ سے منسوب کیا گیا ہے اور وہ شعر ہے۔

فللسوط الهوب وللساق درة   وللزجر منه وقع اهوج منعب (۱)

اس کے علاوہ دونوں قصیدوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی شاعر کی بھی کوئی شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ بلکہ جو چیز واضح اور کھل کر سامنے آتی ہے وہ ہے گھوڑے کی تعریف اور اس کے انگ، چال ڈھال اور حرکات وسکنات کی تصویر۔ اور یہیں سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قصیدے اسلامی دور میں ان لوگوں نے وضع کئے ہیں جو اپنی زبان دانی اور گھوڑے کے اوصاف میں مہارت رکھنے کا دعوی کرتے تھے۔ اس قسم کے دعوی داروں میں ابوعبیدہ اور اصمعی کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے جو گھوڑے کے علم کے بارے میں اور عربوں نے جس جس طرح ان کا وصف بیان کیا ہے اس کے بارے میں آپس میں مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے ان ہی لوگوں نے اپنی زبان دانی کا سکہ جمانے کے لیے یہ قصائد یہ قصیدے وضع کیے ہوں اور ان شاعروں کے نام سے منسوب کر دیئے ہوں اور یہی بات قرین قیاس ہے۔

علقمہ سے یوں تو بہت سے چھوٹے بڑے قصیدے منسوب ہیں لیکن ان میں سے دو قصیدے ایسے ہیں جن پر تقریباً سارے تذکرہ نگاروں اور راویوں کا اتفاق ہے ان میں سے ایک تو وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے (۲):

طحابك قلب فی الحسان طروب   بعید الشباب عصر حان مشیب

اور دوسرا وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع یوں ہے:

هل ما علمت وما استودعت مکتوم   أم حبلها إذ نأتك الیوم مصروم

یعنی کیا اس راز درون پردہ کو جسے محبوبہ نے تمہارے پاس بطور امانت رکھا تھا اس امید میں کہ تم اس سے وفا کرتے رہوگے آج محبوبہ کے دور ہو جانے کے بعد فاش کر کے رکھ دوگے؟

۱۔ فی الادب الجاہلی۔ ڈاکٹر طہ حسین۔

۲۔ رویس شیخو الیسوعی نے "شعراء النصرانیہ" میں علقمہ کے چھوٹے بڑے ۱۹ قصیدے نقل کیے ہیں۔

ابن سلام الجمحی نے مذکورہ بالا دونوں قصیدوں کے علاوہ اس قصیدہ کو علقمہ کے بہترین قصائد میں شمار کیا ہے جس کی بدولت اسے امرؤالقیس کے مقابلہ میں جیت ہوئی تھی اور جس کا مطلع ہے۔

ذھبت من الھجران فی کل مذھب ولم یک حقا کل ھذا التجنب[1]

مگر جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ قصیدہ اور اس سے متعلق قصہ بعد کی ایجاد ہے اس لیے ہم علقمہ کے ان دونوں قصیدوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیں گے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ پہلا قصیدہ جس کا مطلع اوپر لکھا گیا ہے علقمہ کے کلام کا ہر اعتبار سے بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ مطلع کا مطلب بزبان حافظ شیرازی یہ ہے۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولی

اس قصیدہ میں بروایت مفضل الضبی ۴۷ شعر ہیں۔[2] اور اس کا موضوع شام کے بادشاہ الحارث بن جبلۃ بن ابی شمر الغسانی کی مدح اور اس سے اپنے بھائی شاس بن عبدہ کی رہائی کی درخواست ہے۔ حارث نے اس کے بھائی شاس کو ایک معرکہ میں قبیلہ بنو تمیم کے ستر آدمیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا تھا۔[3] جب علقمہ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اس کی شان میں یہ مدحیہ قصیدہ کہا اور اس کے دربار میں حاضر ہو کر اسے پڑھ کر سنایا۔ بادشاہ اپنی مدح سن کر اتنا خوش ہوا کہ اس نے نہ صرف علقمہ کے بھائی کو آزاد کر دیا بلکہ دوسرے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا۔ علقمہ نے اس قصیدہ کو حسب دستور تشبیب سے شروع کیا ہے اور کہتا ہے کہ اس وقت بھی جب کہ صبح زندگی شام زندگی سے ملنے لگی ہے تمہارا بے قرار دل مہوشوں کے لیے بے تاب ہے۔ اس کے بعد اپنی محبوبہ کا وصف بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ناز و نعم کی پالی بڑی امین، باوفا، طرحدار اور دلدار ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ اب اس کا

۱۔ طبقات فحول الشعراء۔ ص۔ ۱۱۶

۲۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ۳۹ شعر نقل کئے ہیں۔ دیکھئے شعراء النصرانیۃ للیسوعی

۳۔ اس جنگ کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ حارث نے المنذر کی بیٹی ہند کا پیام دیا تھا اور المنذر نے اس سے وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن ہند شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے جسم پر برص کے داغ بنا لیے اور کہا کہ میں اس عیب کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتی چنانچہ المنذر نے رخصتی نہیں کی۔ اس پر الحارث خفا ہو گیا اور چڑھائی کر دی۔ جنگ میں المنذر کے بہت سے آدمی قید ہوئے ان میں علقمہ کا بھائی شاس بھی تھا۔ (الکامل لابن الاثیر)

ذکر چھوڑ دو بھی۔ وہ تم سے بہت دور جا چکی ہے۔ اب اس سے ملنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ وہ ربیعہ (بن مالک) قبیلہ کی لڑکی ہے جہاں اس کے پینے کے لیے ایک کنواں خاص کر کھودا گیا ہے۔ یعنی وہ بہت بڑے گھرانے کی لڑکی ہے۔ جس کا قبیلہ تمہاری پہنچ سے بہت دور ہے۔

اس کے بعد عورتوں سے متعلق اپنا تجربہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں عورتوں کی کمزوریوں اور ان کے نقائص کو خوب جانتا ہوں۔ چنانچہ جب آدمی بوڑھا ہو جائے یا غریب ہو جائے تو پھر انھیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ ان کی محبت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک آدمی جوان اور مالدار ہے۔

فان تسئلونی بالنساء فاننی بصیر بأدواء النساء طبیب

إذا شاب رأس المرأ وقل ماله فلیس له من ودهن نصیب

یردن ثراء المال حیث علمنه وشرخ الشباب عندهن عجیب

اور یہاں سے گریز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا ذکر چھوڑ دو۔ اور ایک تنومند اور تیز رفتار اونٹنی پر بیٹھ کر لمبے سفر پر چل نکلو۔ اور اس طرح ہجر و فراق کے اس رنج و غم اور کرب و الم کو دور کرو۔ پھر اپنی اس اونٹنی کا وصف بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس قسم کی اونٹنی پر بیٹھ کر میں نے اپنے ممدوح الحارث (بن جبلہ) کا رخ کیا۔

الی الحارث الوهاب اعملت ناقتی بکلکلها والقصریین وجیب

اس کے بعد الحارث کی تعریف کرتا ہے۔ اس کی بہادری اور شجاعت کی داد دیتا ہے۔ معرکہ کارزار میں اس کی تلوار کے جوہر دکھانے کا نقشہ کھینچتا ہے اور آخر میں اپنے بھائی شاس کی رہائی کی درخواست کرتا ہے لیکن بڑے بلیغانہ انداز میں۔

وانت الذی آثاره فی عدوه من البؤس والنعمی لهن ندوب

وفی کل حیّ قد خبطت بنعمة فحق لشاس من نداك ذنوب

کہتے ہیں کہ جب الحارث نے یہ آخری شعر سنا تو بے اختیار بول پڑا "نعم، واذنبة واذنبة" یعنی صرف "حصہ" ہی نہیں حصے ملیں گے حصے۔ اور اس کے بعد علقمہ کے بھائی شاس اور بنو تمیم کے تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دیدیا۔

علقمہ کے اس قصیدہ کے مذکورہ بالا مختصر تجزیہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قصیدہ اس کے کلام، اسلوب بیان اور انداز فکر و نظر کا بہترین نمونہ ہے۔ چونکہ بھائی کو رہا کرانے کی لگن دل سے لگی تھی اس لیے کلام میں بڑا زور اور اثر پایا جاتا ہے۔ تشبیب کے اشعار میں اس قصیدہ کا

مطلع بڑا بولتا ہوا اور رلا جواب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جس انداز سے حضرت غالب نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو   میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو۔

اسی انداز سے علقمہ نے حسن و شباب کی زوال پذیری اور ناپائداری کی طرف اشارہ کر کے اس بات کی طرف ذہن کو منتقل کیا ہے کہ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ بقا دو دام آدمی کے اخلاق۔ اس کی عفو درگزر اور نیک کام کو ہے۔ اس تمہید کے بعد جس خوبصورتی اور فنی باریکی سے الحارث سے اپنے بھائی کی رہائی کی درخواست کی ہے اس کا اثر آپ نے خود دیکھ لیا کہ وہ شدت تاثر میں بے اختیار بول پڑا کہ۔ کیوں نہیں۔ صرف ایک حصہ نہیں بلکہ بہت سے حصے ملیں گے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جبکہ الفاظ، اسلوب بیان اور جذبات و خیالات میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے کہ بات اثر انگیزی کے اعتبار سے معجز نما بن جائے اور یہ بات اس کے اس قصیدہ میں پوری طرح موجود ہے۔

ایک دوسری خوبی اس قصیدہ کی یہ ہے کہ بدوی معاشرہ میں جہاں عورت کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اسے انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا وہیں تصویر کا دوسرا رخ بھی اس کے ذریعہ سامنے آجاتا ہے اور وہ ہے عورت کے متعلق علقمہ کی رائے کہ اسے مرد سے اسی وقت تک تعلق رہتا ہے جب تک کہ اس کے پاس مال و دولت اور جوش و جوانی رہتی ہے۔ عورت سے متعلق یہ تصور شاید پہلی مرتبہ ایک بدوی شاعر نے کھل کر دیا ہے اور عجیب بات ہے کہ عربی عورتوں کے متعلق شاید اب بھی یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے جو ان کے ماحول، مخصوص حالات اور معاشرتی و معاشی حالات کی دین ہے۔

علقمہ کے دوسرے قصیدہ میں بروایت مفضل ضبی ، ۵ شعر ہیں۔ مگر بعض تذکرہ نگاروں نے صرف ۵۵ شعر نقل کئے ہیں۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے۔

هل ما علمت وما استودعت مكتوم   أم حبلها إذ نأتك اليوم مصروم

یعنی کیا تم اب تک اس راز محبت کو اور دفا کرنے کے اس عہد و پیمان کو جسے اس نے تمہیں دیا تھا ابھی تک اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہو اور اس کی محبت پر قائم ہو یا اس کے دور ہو جانے کی وجہ سے تم نے اب اس سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ (۱)

۱۔ پورا قصیدہ شعراء النصرانیہ۔ الاب شیخو الیسوعی میں ملاحظہ کیجیے

علقمہ کے مذکورہ بالا قصیدہ کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بدوی شاعر جس کے سینے میں ایک دھڑکتا دل ہے۔ جس میں محبت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ آخر دم تک باوجود ہجر و فراق اور وصال سے مایوسی کے، اسی کوشش میں رہتا ہے کہ محبوب کے دیدار قرب اور وصال سے متمتع ہوتا رہے۔ اور اگر قافلہ دور نکل گیا ہے تو کوئی ہرج نہیں اس کے پاس ایک تومند اونٹنی ہے جو دیو پیکر ہے۔ جو برق رفتار ہے۔ وہ اسے محبوب کے پاس پہنچا دے گی۔ اور جب وہ محبوب کے پاس پہنچ جائے گا تو وہ اس کی پذیرائی کرے گی۔ اپنا عہد و پیمان نباہے گی کیونکہ اس نے چپکے سے سب کی نظریں بچا کر اس سے پیمان وفا باندھا تھا۔ اور کیوں نہ باندھے۔ میں کوئی بیٹا آدمی نہیں، بزدل نہیں۔ بخیل نہیں۔ مجھ میں شرافت و نجابت کے سارے جوہر موجود ہیں۔ میں اتنا سخی ہوں کہ قحط کے زمانے میں بہترین گھوڑے اور راونٹ غریبوں کو کھلانے کے لیے داؤ پر لگا دیتا ہوں عالی نسبی کے علاوہ میں اتنا عقلمند اور سمجھدار ہوں کہ دنیا کی ریت، زندگی اور اس کے مآل عزت و ذلت کے رموز۔ بقا و فنا کے اسرار کو سمجھتا ہوں۔ جب یہ سب صفات مجھ میں موجود ہیں تو بجا طور پر میں ایک قابل فخر عاشق ہوں۔ اور بجا طور پر میری محبوبہ مجھے اپنے من مندر کا دیوتا سمجھتی ہے اس لیے مجھے اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے بلکہ محبت کی اس ریت کو تا زیست نباہتے رہنا چاہیئے اس کا یہی خیال تھا جس نے اس سے یہ کہلایا تھا کہ:

طحابِکَ قلبٌ فی الحسان طروب   بعید الشباب عصر حان مشیب

جو بظاہر ہے تو حافظ شیرازی کے خیال کے مطابق۔ چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو۔ لیکن درحقیقت تفسیر ہے اس شعر کی کہ:

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے۔ زندگی کہاں گزرے

علقمہ کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل گو شاعر ہے۔ اس کے یہاں مدح فخر وصف ضرور ہے لیکن بھرپور نہیں۔ مدح المنذر بن ماء السماء کی ہے لیکن اپنے بھائی شاس کو قید سے چھڑانے کے لیے ہے۔ اس لیے اس میں وہ جان اور وہ سوز نہیں ہے جو اس کی غزل میں ہے۔ کیونکہ غزل کے جو شعر ہیں وہ بہت خوبصورت اور دل لگتے ہیں۔ ایک جگہ کتنے خوبصورت انداز سے محبوبہ کے دلربایانہ انداز کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ذرا یہ انداز تو دیکھو کہ پردہ کی اوٹ سے، دیکھنے والوں کی نگاہیں بچا کر نیل گائے جیسی بڑی اور کجراری آنکھوں میں آنسو بھرے، ہرنی کی

جیسی خوبصورت گردن کو نکالے، جس میں موتیوں اور زبرجد کا ہار جگمگا رہا تھا مجھے تڑپانے کے لیے ایک لمحہ کے لیے کوند کر رہ گئی۔

تراءت و اُستار من البیت دونہا	الینا و حانت غفلۃ المتفقد
بعینی مہاۃ یحدر الدمع منہما	بریمین شتی من دموع و اثمد
و جید غزال شادن نور دت لہ	من الحلی سمطی لولو و زبرجد

یعنی ——— خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

علقمہ الفحل بسیار گو شاعر نہیں ہے۔ مگر جو کچھ اس نے کہا ہے اس میں بڑی جان ہے۔ اور جاہلی شاعری کے احساسات و خیالات اور جاہلی زندگی کی بولتی تصویر ہے۔

حوالہ جات:-

۱۔ طبقات فحول الشعراء للجمحی
۲۔ خزانۃ الأدب ۱/۵۶۵
۳۔ الاغانی للاصفہانی ۷/۱۲۸
۴۔ شعراء النصرانیہ للاب شیخو
۵۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ
۶۔ العمدۃ لابن رشیق القیروانی
۷۔ المفضلیات رقم ۱۱۹، ۱۲۰
۸۔ کتاب "الاشتقاق" لابن درید
۹۔ شرح الانباری ۷۷۰
۱۰۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان، اول

اور دوسری کتابیں۔

اس کا دیوان سوسین نے "لیبسک" میں ۱۸۶۷ء میں شائع کیا، اس کے علاوہ "العقد الثمین" لاورد کے مجموعہ میں بھی اس کا دیوان موجود ہے۔ جزایر میں بھی اس کا دیوان چھپ چکا ہے۔

صعالیک" یا خانماں برباد شعراء"

اب تک ہم نے جن شعراء کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے اکثر وہ ہیں جو عام طور سے اپنے خاندان قبیلہ اور سماج سے نہ صرف متعلق رہے تھے بلکہ ان کے قابلِ ذکر فرد بھی تھے۔ اور ان کے رسم و رواج، قوانین اور ریت کو مانتے، ان پر فخر کرتے اور ان کے گن گاتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ شعراء اپنے قبیلوں اور خاندان کی آنکھ کا تارا اور اپنے معاشرہ کے معزز و محترم اور بھاری بھرکم اشخاص بن کر چمکے، اور اس کی وجہ سے باہر کی دنیا میں بھی بڑی وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن اب ہم شعرائے جاہلیت کے ایسے طبقہ کا ذکر کرتے ہیں جو مذکورہ بالا شعرا کے طبقوں سے بالکل مختلف نرالا اور اپنے انداز و اطوار میں بالکل اچھوتا ہے۔ اور شاید عربی زبان وہ واحد سامی زبان ہے جس میں اس قماش کے شعرا کا طبقہ پایا جاتا ہے اور یہ طبقہ ہے "صعالیک الشعراء" یا خانماں برباد شعرا کا طبقہ

صعالیک کون تھے ؟

"صعلوک" کے لغوی معنی ہیں "مفلس و قلاش" کے[1]۔ ادبی اصطلاح میں صعلوک اس مفلس کو کہتے ہیں جو ایک طرف اپنی غربت و افلاس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہو اور دوسری طرف اپنی عزت نفس و شرفِ ذات کو برقرار رکھنے اور اپنی حیثیت اور وجود کو ثابت کرنے اور اپنی قوت کو حاصل کرنے میں لگا رہتا ہو۔[2]

۱۔ "الصعلوک" الفقیر الذی لا مال لہ وقد تصعلک الرجل۔ اذا کان کذالک،
لسان العرب طبعہ بولاق سنہ ۱۳۰۳ ہجری۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ؛ "الشعراء الصعالیک" للدکتور حسین عطوان شائع شدہ مجلہ العربی، ماہ اکتوبر ۱۹۶۹ء۔

عبدالمعین الملوحی نے "اشعار اللصوص و اُخبارہم" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات عربی میں رسالہ مجمع اللغۃ العربیہ، دمشق ماہ آب (اگست) ۱۹۸۲ء میں ص ۳۸ شروع کیا ہے۔ اس میں الاُحیمر السعدی کا ذکر ہے۔ مضمون بہت فاضلانہ ہے۔

صعالیت الشعراء" یا خانماں برباد شعراء وہ منچلے، آزاد منش، سخت جان و سخت کوش نوجوان شعراء تھے جن میں سے اکثر کے عزیز و اقارب خاندان، قبیلہ سب کچھ تھا لیکن انھوں نے ان سب سے یا تو از خود یا مجبور ہو کر رشتہ توڑ لیا تھا اور صحرا نوردی اور قتل و غارت گری اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ اور تن بتقدیر و جان بہ تدبیر زندگی گزارتے تھے، اور اس طرح ساری زندگی فاقہ مست اور خانماں برباد رہے۔ اس دنیا میں سوائے ان کے اپنے ہم جنسوں کے نہ ان کا کوئی یار تھا نہ مددگار، نہ دوست نہ غمگسار اور اسی کس مپرسی اور خانماں بربادی کی حالت میں مر گئے۔

صعلوک بننے کی وجہ

یہ نوجوان صعالیک کیسے بن گئے۔ اس کے مختلف اسباب تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے بدوی عرب معاشرہ میں اقتصادی بدحالی اور معاشی تنگدستی کی وجہ سے قتل و غارت گری اور لوٹ مار کی وبا عام تھی۔ ہمارے ان شعرا میں سے بعض کو قدرت نے بڑی طاقت و توانائی اور بڑا عزم و حوصلہ دے رکھا تھا۔ اس عزم و حوصلہ اور طاقت و توانائی کی جولان گاہ، بالکل اسی طرح محدود تھی جس طرح ان کا معاشرہ۔ چنانچہ ان کو قدرت کی بخشی ہوئی ان طاقتوں کو صالح اور پاک مقصد حیات پر لگانے کا موقع نہ مل سکا۔ پھر معاشرہ میں جرم و سزا کا نہ کوئی واضح ضابطہ اور مقرر قانون تھا اور نہ انھیں نافذ کرنے کا کوئی ایسا فعال ادارہ جو انھیں خوف سزا یا پاداش عمل کے تازیانے سے اپنی توانائیوں کو غلط راستے پر لگانے سے روک سکتا۔ چنانچہ ان کے یہ بلند حوصلے اور ابھرتی ہوئی توانائیاں غلط راستے پر لگ گئیں اور انھوں نے اپنا پیشہ قتل و غارت گری و رہزنی اور لوٹ مار بنا لیا۔ جب ان کے جرائم اتنے بڑھ گئے کہ ان کے خاندانوں کی عزت و آبرو پر حرف آنے لگا اور وہ ان کے جرائم کا تاوان دیتے دیتے تھک گئے اور اب اس کی سکت نہیں رہ گئی کہ ان کی ناعاقبت اندیشیوں کی مزید سزا بھگت سکیں اور اسی کے ساتھ ان کی جان کی بھی حفاظت کر سکیں، تو انھوں نے عاجز آکر ایسے نوجوانوں

۱۔ "الشعراء الصعالیک" الدکتور خلیف، مطبوعہ مصر۔

۲۔ دراسات فی الشعر العربی تحلیل لظواہر ادبیۃ و شعراء، دکتور محمد مصطفیٰ ہدارۃ۔ کلیۃ الآداب، جامعہ الاسکندریہ۔ مطبوعہ منشأۃ معارف بالاسکندریہ۔ دار الطباعۃ سنہ ۱۹۷۰ء

کو برادری سے باہر کو دیا۔ ایسے شخص کو اصطلاح میں خلیع یا "طرید" کہتے تھے۔ جب کسی کے متعلق خلیع یا طرید ہونے کا اعلان کر دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب یہ شخص اس خاندان یا قبیلہ کا فرد نہیں رہا۔ اس لئے اس کے کسی فعل یا عمل کا ذمہ دار اس کا خاندان یا قبیلہ نہیں۔ اب اگر کوئی اسے کسی جرم کی سزا میں مار ڈالے تو خاندان اس کے خون کا مطالبہ نہیں کرے گا اور قاتل سے "ثار" یعنی خون کے بدلے خون کی مانگ۔ نہیں کرے گا۔ اور اس طرح ایسے آدمی کا خون "ہدر" یعنی مباح ہو جاتا۔ ظاہر ہے جب کوئی اس طرح برادری سے باہر ہو جاتا تو اس کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا اور کوئی قبیلہ یا شخص اس کو اپنے یہاں پناہ دینے پر تیار نہ ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ایسا شخص مجبور ہو کر صحراؤں اور پہاڑوں کے دامنوں میں پناہ لیتا۔ جہاں اس کے ساتھی جنگلی جانور یا اس کے ہم جنس خلعاء یعنی برادری باہر نوجوان ہوتے اور قتل و غارت گری اور رہ زنی سے اپنی زندگی چلاتا۔

ان میں سے بعض کے صعلوک ہونے کا سبب یہ ہوا کہ باپ کے مر جانے یا خاندان کی سخت معاشی تنگدستی کی وجہ سے قبیلہ نے ان سے آنکھیں پھیر لیں اور سخت تکلیف و پریشانی کے عالم میں بچپنے کے دن گزرے یا کسی معرکہ میں گرفتار ہو کر فاتح قبیلہ کے یہاں غلامی اور ذلت کی زندگی گزاری اور جب جوان ہوتے اور عزتِ نفس، خودداری اور خودی نے گوش و ہوش کی آنکھیں کھولیں اور اپنے انجام کو دیکھا تو اس قبیلہ اور خود اپنے قبیلہ کے خلاف نفرت و حقارت کا سخت جذبہ پیدا ہو گیا اور غلامی و ذلت کی ساری زنجیریں توڑ کر صحراؤں اور بیابانوں کی راہ لی، اور یہاں فطرت کی آغوش میں خودداری و خودمختاری اور خودی کی زندگی گزارنے لگے، کیونکہ خود بقول شنفری:

وفی الارض منأی للکریم عن الاذی   وفیہا لمن خاف القلی متحول

یعنی "چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا"

ان صعالیک کا خیال تھا کہ اس معاشرہ کے لوگ بڑے خود غرض مطلب پرست اور چھوٹے دل و دماغ کے لوگ ہیں۔ ہمارے ایسے اولوالعزم، حوصلہ مند نوجوان ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ہم نے جنگلی جانوروں اور درندوں کو اپنا خاندان بنا لیا ہے کیونکہ یہ

۱۔ خلیع: برادری یا ناٹ باہر شخص جسے سب نے چھوڑ دیا ہو۔
طرید: دیس نکالا دیا ہوا شخص۔ بھگایا ہوا شخص۔

انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل بھروسہ ہیں، وہ دوسروں کے راز افشا نہیں کرتے اور اگر ان کا کوئی فرد جرم کر بیٹھے تو اسے دوسروں کے حوالے نہیں کرتے۔ اور یہ قابل اعتماد افراد خاندان۔ ایک سِیدٌ عَمَلَّس یعنی بڑا خوفناک بھیڑیا، دوسرا ارقط زُہلول یعنی دھاری دار چکنا چیتا، اور تیسرا عرفاء جیئل یعنی بدبودار بجو، یہ ہیں ہمارے خاندان کے افراد اور ہم انہیں کے ساتھ خوش ہیں شنفری ان کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے:

ولی دونکم أهلون سِیدٌ عَمَلَّس وأرقط زُهلول وعَرفاء جیئل

هم الرهط لا مستودع السر شائع لدیهم ولا الجانی بما جر یخذل

مگر یہ افراد خاندان اپنی فطری مجبوریوں کی وجہ سے ہم دم ودمساز اور مرنے جینے کے ساتھی نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے ہم نے ہر حال میں ساتھ دینے والے اپنے تین جگری دوست بھی پیدا کئے ہیں اور وہ ہیں ایک ــــ بیباک اور نڈر دل، دوسرے ــــ سفید چمکتی ہوئی تیز تلوار اور تیسرے ــــ پیلے رنگ کی ایک لمبی کمان:

ثلاثة أصحاب فؤاد مشیع وأبیض إصلیت وصفراء عیطل

یہ صعالیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر آدمی صرف اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھ لے تو پھر اس کے لئے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے، جیسے شنفری نے اپنی زبان میں یوں کہا ہے:

لعمرك ما فی الأرض ضیق علی إمرئ سری راغباً أو راهباً وهو یعقل

پائے مرا لنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست۔

اور اس خاندان اور اپنے ان تین جگری دوستوں کے ساتھ یہ نوجوان صحراؤں میں آسمان کی چھت کے نیچے زندگی گزارنے لگتے اور لوٹ مار اور راہ زنی سے اپنا پیٹ بھرتے۔ جہاں رات ہوئی وہیں بستر جما دیا اور سوختہ سامانی کا عالم تھا کہ بستر کی جگہ صرف زمین کا بچھونا ہوتا اور اس پر اپنی سوکھی اور ڈھری ہوئی پسلیوں کے بل لیٹ جاتے اور تکیہ کی جگہ اپنے کھردرے سوکھے اور ہڈیاں، ابھرے ہوئے ہاتھ رکھ لیتے۔

وألف وجه الأرض عند افتراشها بأهدأ تنبیه سناسن قحل

کیونکہ یہ صعالیک زندگی کو حریر و پرنیاں یا اطلس و کمخواب نہیں سمجھتے تھے۔ زندگی میں انسان کو ہر قسم کی نرم گرم جھیلنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ مصیبتوں میں رونا دھونا نہیں چاہئے اور جب فارغ البالی ہو تو اترانا نہیں چاہئے۔ شنفری کہتا ہے:

فلا جزع من خلة متکشف ولا مرح تحت الغنی أتخیل

اور　　کسی درخت کے نیچے کہیں بیاباں میں
گزر ہی جائے گی ہم خانماں خرابوں کی

دوست احباب اگر بیوفائی کریں تو بھی ہم کو غم نہیں۔ ہم اس پر افسوس نہیں کرتے۔ ان کے غم میں روتے دھوتے نہیں یا ان کی بے وفائی و سرد مہری کا گلا نہیں کرتے۔ بقول تابط شرا۔

ولا أقول إذا ما خلة صرمت　　یا ویح نفسی من شوق وإشفاق

اس طرح اپنی عزت و شرف، خودی و خودداری اور اعلیٰ اقدار کو حرز جان بنائے ہوئے موت آجاتے۔ اور ہمیں رونے والا کوئی بھی نہ ہو تو ہمیں مطلق بھی غم نہ ہوگا، کیونکہ ہمارا اس دنیا میں سوائے اپنی ذات اور اپنی قوت بازو کے ہے کون؟ نہ خالائیں، نہ چچیاں اور نہ عیادت و غمگساری کرنے والے دوست۔ اپنا سب کچھ میں ہوں اور میری تنگ ودو۔ بقول شنفری!

اذا ما اتتنی میتتی لم ابالها　　ولم تذر خالاتی الدموع وعمتی

ألا لا تعد فی إن تشکیت خلتی　　شفانی بأعلی ذی البریقین عدوتی

یعنی　　پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی آ کے شمع جلائے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

جب ان کی مہموں اور آزاد کوشیوں کے قصے ان آبادیوں میں آتے تو ان کے منچلے نوجوانوں کے دلوں میں بھی آزاد زندگی گزارنے کی امنگیں انگڑائیاں لینے لگتیں اور ان میں سے بعض ان سے جا ملتے اور اس طرح ؎

ہم سفر آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

عام طور سے یہ نوجوان بڑے طاقتور، بڑے بہادر اور بڑے سخت جان تھے۔ صحرا کی چلچلاتی سخت دھوپ میں یا خون جما دینے والی سخت سردیا تاریک راتوں میں میلوں اور مدتوں سفر کرنا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ خطرے کے موقعوں پر ہرنوں سے زیادہ میلوں تیز بھاگنا، مدتوں بغیر کھائے پئے چلتے رہنا، اور ہر وقت جان کو ہتھیلی پر لئے رہنا۔ ان کی زندگی کے معمولات میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ لوگ غریب، مفلس اور قلاش تھے۔ لیکن ان میں غربت و فلاکت سے پیدا شدہ بیماریاں، جیسے ٹچاپن، خودی اور ضمیر کا فقدان اپنی بے وقعتی یا احساس کمتری ذرہ برابر نہ تھا۔ اپنی تہی مائیگی و سوختہ سامانی کے باوجود یہ لوگ بڑے غیرت مند، فیاض، ایک دوسرے کے غمگسار، دوست نواز، صلح جو، دل کے جیالے اور عزم و ارادہ کے پختہ نوجوان تھے۔

(۱) شعر مولانا نجم الدین شکیب ندوی

أبى لما أبى سريع مبادقى ... إلى كل نفس تنتحى فى مسرقى

حالات نے انھیں مادی وسائل سے محروم کر دیا تھا لیکن قدرت نے ان میں سے بعض کو ایسا ذہن رسا اور ایسا ذوق سلیم اور ایسا حسن لطیف اور باریک نظر عطا کی تھی کہ باوجود اپنی سخت کوشی و بے راہ روی کے دنیائے شعر وشاعری میں روشن ستارے بن کر چمکے۔

ان صعالیک نے اپنی شاعری میں ایک طرف اپنی مخصوص زندگی سے حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں، زندگی کے بعض لافانی حقائق کی نشان دہی کی ہے، اور ازلی قدروں کے گیت گائے ہیں۔ فقر و غنا کے رمز کو سمجھانے اور موت و حیات کے چہرے سے نقاب ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ تو دوسری طرف دکھ درد کی ماری زندگی اور اپنے پیاروں اور اعزہ و اقارب سے دوری و مہجوری کے جاں گسل لمحات نے ان کے دل کے تاروں کو جب جھنجھنایا ہے تو اس کی صدائے بازگشت ہجر و فراق کے ان دل خراش اشعار میں سنائی ہے جن کی کسک اب بھی دل والوں کے رگ جان پر نشتر کا کام کرتی ہے اور یہ سب کچھ ان کے ان لمبے قصیدوں میں ملتا ہے جو اب بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اپنی سلاست و روانی، شگفتہ بیانی اور فصاحت و بلاغت میں نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔

دورِ جاہلی کے طبقہ صعالیک میں پانچ نوجوان بہت مشہور ہوئے۔ الشنفری، تابط شرا، سُلَیک بن السلکہ، عمرو بن براق اور اُسید بن جابر۔[1] ان میں سے ذیل کے تین صعالیک نے میدان شعر وشاعری میں بھی بڑا نام پیدا کیا۔ ایک الشنفری، اور دوسرے تابط شرا، اور تیسرے سُلَیک بن السلکہ۔ ذیل میں ان میں سے صرف دو پر تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے اور وہ ہیں الشنفری۔ اور دوسرا تابط شرا

ا- یہ اپنی قوم کا سردار بھی تھا۔

۱- الشنفریٰ

(م سنہ ۵۱۰ عیسوی)

الشنفریٰ خالص عرب قحطانی یمنی اور قبیلہ ازد کا فرد اور صعالیک الشعراء میں ایک ممتاز پرگو شاعر ہے[1] تذکرہ کی کتابوں میں جا بجا متفرق طور پر اس کے زندگی کے جو حالات ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا باپ بچپنے ہی میں مار ڈالا گیا تھا۔ اور اس کے خاندان والوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خون کا بدلہ نہیں لیا بلکہ باپ کے مرتے ہی آنکھیں بھی پھیر لیں۔ ماں نے جب یہ دیکھا کہ عصبیت کے یہ دن سسرال میں نہ بیت سکیں گے تو الشنفریٰ اور اس کے ایک چھوٹے بھائی کو لے کر اپنے میکہ قبیلہ فہم میں چلی آئی۔ لیکن یہاں بھی اسے وہ سکون چین اور عزت نہ نصیب ہو سکی جس کی اسے توقع تھی۔ چنانچہ جب شنفریٰ بڑا ہوا تو اسے اپنے ددیہالی اور ننہالی دونوں خاندانوں سے سخت نفرت اور عداوت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے نہ صرف اس نے ان سب سے رشتہ توڑ لیا بلکہ بعد میں انھیں قبیلوں پر سخت حملے کرتا رہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ الشنفریٰ کے قبیلہ ازد نے اس کے ننہالی قبیلہ فہم کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا جب ان لوگوں نے خون بہا کا مطالبہ کیا تو ازدیوں نے الشنفری، اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی کو بطور رہن ان کے حوالے کر دیا اور ان کی کس مپرسی اور بے چارگی کی وجہ سے خون بہا ادا کر کے ان کو آزاد نہیں کرایا چنانچہ شنفریٰ انھیں کے یہاں بڑی ذلت و خواری کی حالت میں پلا بڑھا اور جب جوان ہوا تو ان لوگوں کی طرف سے سخت نفرت و عداوت کے جذبات

۱- سلسلۂ نسب یوں ہے: الشنفری بن ربیعہ بن الاواس بن الحجر بن الہنو بن الازد۔ آگے جا کر سلسلۂ نسب بنو الحارث سے جا ملتا ہے۔

اس دل میں پیدا ہو چکے تھے۔ اسی وجہ سے اپنا تعارف کرانے میں وہ فخریہ عار محسوس کرتا تھا۔ اور ان میں سے جو بھی مل جاتا، اسے جان سے مار ڈالتا۔ بعض محققین نے روایت کی ہے کہ شنفری کے ننھیالی قبیلہ فہم بن عمرو بن قیس بن عیلان کی ایک شاخ بنو شبابہ نے اسے بچپن میں قید کر لیا۔ چنانچہ شنفری ان کے یہاں رہنے لگا۔ ایک دفعہ بنو سلامان بن مفرج نے جو بنو ازد (شنفری کا ددھیال خاندان) کا ایک بڑا خاندان تھا۔ بنو شبابہ کے ایک آدمی کو جو بنو فہم (شنفری کا ننھیالی خاندان کا ایک فرد تھا) کہیں گرفتار کر لیا۔ جب بنو شبابہ نے اپنے آدمی کو واپس مانگا تو بنو سلامان نے اس کے بدلے میں دو سو اونٹ مانگے۔ چنانچہ انھوں نے شنفری کو بدلے میں دے کر اپنا آدمی چھڑا لیا، اور شنفری اب ان کے یہاں رہنے سہنے لگا۔ لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس سے اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا اور اسے اپنی ذلت و خواری کا ایسا احساس ہوا جو اسے ہمیشہ انتقام کی آگ میں جلاتا رہا۔ ہوا یہ کہ ایک دفعہ اس نے اپنے خیالی باپ کی لڑکی سے یہ کہا کہ ”اے بہن ذرا میرا سر تو دھو دو“ تو اس نے چٹاخ سے اس کے سر پر ایک طمانچہ رسید کر دیا، اور بولی کہ تو مجھے اپنی بہن کہتا ہے۔ تیری یہ مجال؟ اس پر وہ غصہ میں بھرا ہوا اپنے خیالی باپ کے پاس گیا اور بولا کہ یہ بتاؤ کہ میں کون ہوں، کس کا بیٹا ہوں؟ تو اس نے کہا کہ تم دراصل ”اواس بن حجر“ کے خاندان کے فرد ہو۔ میرے بیٹے نہیں۔ یہ سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ تم نے مجھے غلام بنا کر جس طرح ذلیل و خوار کیا ہے، اس کے بدلے میں میں تمھارے سو آدمی جب تک جان سے نہ مار ڈالوں گا اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا۔

یہ بھی روایت ہے کہ اس کے باپ کو ازدیوں کے قبیلے کے ایک آدمی حرام بن جابر نے قتل کیا تھا جس کی وجہ سے اسے ساری ذلتیں اٹھانی پڑیں اور دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے منیٰ کے مقام پر موقع پا کر جابر بن حرام کو قتل کیا اور اس کے بعد جو بھی ازدی اس کے ہاتھ لگ جاتا اسے زندہ نہ چھوڑتا۔

غرضکہ شنفری کی خانماں بربادی اور صعلوکیت اختیار کرنے کے مختلف اسباب راویوں نے بیان کئے ہیں۔ ان کو غور سے پڑھ کر ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شنفری کے ساتھ نہ تو اس کے ننھیالی رشتہ داروں نے اور نہ ہی اس کے اپنے خاندان ازد نے محبت، خلوص اور اپنائیت کا سلوک کیا، بلکہ اسے ہر جگہ ذلیل سمجھا گیا، اسے غلام بنایا گیا۔ اسے یتیمی اور کس مپرسی کی زندگی پر مجبور کیا گیا اور ان حالات کا ردعمل شنفری پر یہ ہوا کہ وہ

جوں جوں بڑا ہوتا گیا اسے عزیز واقارب، خاندان حتی کہ اس معاشرہ سے بھی نفرت پیدا ہوگئی جس نے اسے اس طرح تباہ و برباد ہوتے دیکھا۔ لیکن اس کی دادرسی نہیں کی۔ ظالموں کو سزا نہ دی۔ اور مظلوموں کی فریاد نہ سنی۔ اور اس طرح اس کے دل میں اس ظالم سماج کے خلاف بھی جذبات پرورش پانے لگے جس کی وجہ سے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اس سماج کی ہر ریت اور رسم ورواج کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

قدرت نے اسے بڑے اچھے ہاتھ پاؤں دیئے تھے۔ بڑا ہو کر بڑا گرانڈیل، تنومند اور طاقتور جوان نکلا اور دوڑنے میں اتنا برق رفتار تھا کہ بڑے سے بڑا صبا رفتار گھوڑا بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تابط شرا کی نگاہ دوربین نے جو خود بھی ایک صعلوک تھا، اور رشتہ میں اس کا ماموں لگتا تھا، اس نوجوان کی تیکھی نگاہوں اور دل ودماغ میں ابلتے جذبات کو تاڑ لیا چنانچہ اس نے اس کو اپنی جمعیت "خانماں برباداں" میں شامل کرلیا۔ اور ساری عمر بڑی محبت اور خلوص کا سلوک کرتا رہا۔ شنفری بھی اپنے قبیلہ ازد کی ریت کے مطابق اسے اپنی "ماں" یعنی گرد کہا کرتا تھا۔ (ازدی اپنے سردار کو "الامرّہ" یعنی ماں کے لقب سے پکارتے تھے) اور مرتے دم تک اس کا ہمدم و دمساز رہا اور رزم و بزم ہر جگہ اس کا شریک و سہیم۔

الشنفری اپنی جسمانی طاقت و توانائی کے ساتھ عرب قوم کا سب سے تیز دوڑنے والا شخص بھی تھا۔ ان صعالیک میں تین یعنی الشنفری، تابط شرا اور سلیک بن السلکہ ایسے تیز دوڑنے والے مشہور تھے کہ ان کو گھوڑے بھی نہیں پکڑ سکتے تھے۔ چنانچہ بسا اوقات وہ لوٹ مار کرکے اتنی تیزی سے بھاگ جاتے کہ گھوڑ سوار ان کی گرد راہ ہی میں الجھ کر رہ جاتے۔ روایتوں میں یہاں تک آتا ہے کہ یہ لوگ ہرنوں کے غول کو جب دیکھتے تو اس میں سب سے موٹے ہرن کو چن لیتے اور اور پھر غول کو دوڑانا شروع کرتے اور آخر کار اسی موٹے ہرن کو پکڑ کر دم لیتے۔ اسے ذبح کرتے اور خوب سیر ہو کر کھاتے۔

کہتے ہیں کہ قدرت کسی کے ساتھ ظلم یا زیادتی نہیں کرتی۔ اگر کسی کو کسی چیز سے محروم کرتی ہے تو کوئی دوسری نعمت بے بہا ایسی عطا کر دیتی ہے کہ ساری محرومیوں کی نہ صرف تلافی ہو جاتی ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی مل جاتا ہے۔ شنفری کو قدرت نے بچپنے ہی سے باپ سے محروم کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس نے جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھائیں، ذلت و خواری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا لیکن دوسری طرف قدرت نے اسے تنومند و توانا جسم کے ساتھ بلا کا ذہن رسا عطا کیا تھا۔ بھلی

پوری طرح نوجوان بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے شعر کہنا شروع کر دیا اور سب سے پہلا شعر جو اس نے کہا اس کی تقریب یہ ہوئی کہ اس کا چھوٹا بھائی مرگیا، اس حادثے پر اس کی ماں رونے دھونے لگی، تو اس نے کہا:

لیس لوالدة همها ولا قیلها الا بنها دع دع

تطوف وتحذر أحوالہ وغیبك أمسكك بالمصرع

شنفری جب جوان ہوا تو اس نے ذلت و نکبت، غلامی و خواری کی یہ زندگی چھوڑ کر صحراؤں اور پہاڑوں کی راہ لی۔ اپنے اس عزم کا اظہار اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی مہم کے سلسلے میں اس نے ایک لمبا قصیدہ بھی کہا ہے جس میں اپنے ننہال والوں کو مخاطب کر کے اس عزم و ارادہ کے اسباب بتاتے ہیں اور زندگی سے متعلق اپنا فلسفہ واضح کیا ہے۔ قصیدہ کا مطلع ہے:

"اقیموا بنی عمی صدور مطیکم"

اس نئی دنیا میں شنفری تنہا نہ تھا بلکہ اس جیسے کچھ اور بھی دل جلے، جیسے تابط شرا، سلیک بن السلکہ اور دوسرے منچلے اور چھچھورے نوجوان اسے مل گئے تھے اور اس طرح یہ فطرت کی آغوش میں آزاد اور قید و بند سے دور زندگی گزارنے لگا۔

خاندان اور اس کی چیرہ دستیوں سے آزاد ہونے کے بعد اس نے انھیں کو اپنا نخچیر بنایا اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس نے اپنے منہ بولے باپ، قبیلہ بنو سلامان کے اس آدمی سے اسی وقت کہہ دیا تھا جب اس کی لڑکی نے طمانچہ مار کر اس کی ہتک عزت کی تھی کہ جب تک میں تم میں سے سو آدمی نہ ماروں گا، چین و سکون سے نہ بیٹھوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان پر مختلف اوقات میں سخت حملے کئے جن میں بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بنو سلامان پر اس قسم کے حملوں کے دوران ہی وہ واقعہ پیش آیا جس میں ایک سلامی ان کے ڈر سے بھیڑیا کے شکار کرنے کے گڈھے میں کود پڑا تھا اور جسے ان لوگوں نے تیروں کی بارش کر کے بھیڑیئے کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور جس کے بعد سلامیوں سے بہت سخت معرکہ ہوا۔ اس معرکہ کی یاد شنفری کا وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:

ألا أم عمرو أجمعت فاستقلت

وما ودعت جیرانها إذ تولت

ادھر سلامی بھی شنفری کے آئے دن کے حملوں سے تنگ آکر اس کی جان کے درپے ہو گئے

بچتا تو بھاگ جاتا تھا مگر ان لوگوں نے اس کو قتل کرنے کی ترکیبیں کیں تو جب شنفری کی ذہن میں ان کی یہ بات آئی تو بھی بھاگ نکلا اور بچ کر نکل جاتا۔

مفضل ضبی نے مورج سے روایت کی ہے کہ شنفری نے بنو سلامان کے ننانوے ۹۹ آدمی قتل کر دیئے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ کسی سلامی کو زندہ پکڑ لیتا تھا تو اس سے کہتا تھا کہ بول اب تیری آنکھیں پھوڑ دوں؟ اور اس کے بعد تاک کر اس کی آنکھ میں تیر لگاتا اور اس کے بعد اسے قتل کر دیتا۔ سلامی جب خود اس کو پکڑنے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے ایک دوسرے قبیلہ بنو الرمد کو اس کام پر مامور کیا چنانچہ جب شنفری ایک دن ان پر حملہ کرنے کے لئے آیا تو وہ سب اس پر ٹوٹ پڑے لیکن وہ ان سے پیچھا چھڑا کر ایسا بھاگا کہ یہ لوگ اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس کے تعاقب میں حبش نامی ایک کتے کو چھوڑ دیا لیکن وہ بھی اس کو نہ پا سکا اور شنفری صاف بچ کر نکل گیا۔

شنفری کی اس قسم کے معرکوں میں ایک اور بہت نامی معرکہ کا ذکر آتا ہے شنفری کے باپ کو حرام بن جابر نے جو خود شنفری کے قبیلہ ازد کا ایک فرد تھا، قتل کر دیا تھا۔ ان کا باپ غریب آدمی تھا اس لئے کسی نے اس کے خون کا مطالبہ نہیں کیا۔ باپ کے اس طرح بے دردی سے قتل ہو جانے اور پھر بدلہ نہ لینے پر اس کا دل بہت دکھا اور اس نے اس سلسلہ میں کچھ شعر بھی کہے جس میں اس کی بے کسی اور کس مپرسی کا ذکر کر کے اس وقت اپنی غیر موجودگی پر اظہار افسوس کیا ہے اور اپنے خاندان والوں کو غیرت دلائی ہے۔[1] اتفاق سے حرام بن جابر حج کے دوران اسے منیٰ کے مقام پر مل گیا اور اس نے وہیں اسے قتل کر دیا۔ لوگ جب اس پر جھپٹے تو سر پٹ بھاگ کھڑا ہوا اور کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اس موقع پر اس نے فخریہ ایک شعر بھی کہا:

قتلت حراماً مهدياً بملبد

ببطن منى وسط الحجيج المصوت

یعنی حرام کو میں نے عین حالت احرام میں جبکہ منیٰ میں لبیک کہنے والے حاجیوں کے

۱۔ اشعار مفضلیات ابن ضبی کے صفحہ ۱۹۸ پر ملاحظہ فرمایئے۔

درمیان ایک دوسرے نے انتقام لیا تو اس نے بڑے شخص زاحم اور والد کے بدلے میں قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ کی خبر جو ہم کو پہنچی تو اسید بن جابر جو وہیں کہیں تھا تاکہ اس کا بدلہ لے نے انسان اور جن کو بھی ... جا کر ہے بازار میں پوچھا ہے۔ اسید نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیسے اس طرح اطمینان کر لیا ہے کہ وہ شنفری ہی تھا۔ اس پر اس آدمی نے کہا کہ خدا کی قسم وہی تھا۔ یہ سن کر اسید بولا کہ خدا کی قسم وہ جب تک اپنے گروہوں کا مزہ نہ چکھے گا پھر نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقتول بھائی حرام کے دو لڑکوں کو ساتھ لیا اور شب رات کی تاریکی میں شنفری کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ جب رات بھیگ گئی تو شنفری کے آنے کی آہٹ ہوئی مگر اس طرح کہ اس کے ایک پاؤں میں جوتا تھا اور دوسرے پاؤں سے ننگا تھا۔ یہ چال اس نے اس لیے چلی تھی کہ کسی کو آدمی کی چال کا شک نہ ہونے پائے۔ چنانچہ آہٹ جب اور قریب ہوئی تو اسید کے بھتیجوں نے کہا کہ بخدا یہ انسان کی چاپ نہیں یہ تو بجو کی چال ہے۔ مگر اسید نے کہا کہ ہرگز نہیں، خدا کی قسم یہ وہی کمبخت ہے۔ اس لیے تم لوگ اب تیار ہو جاؤ۔ ادھر شنفری کو جب ان کے سانس دکھائی دیے تو وہ الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ اس پر لڑکے نے کہا بخدا بڑا چالاک ہے ہماری موجودگی کو بھانپ گیا اور بھاگ گیا۔ اسید نے کہا ہرگز نہیں، وہ اپنی اس حرکت سے ہمیں اپنا پیچھا کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ وہ پھر واپس آئے گا تم دیکھ لینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا شنفری تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا۔ اب کی دفعہ بھی جب اسی جگہ پر آیا تو ان لوگوں کی موجودگی کا شبہ ہوا تو اس نے تاک کر اس اندھیرے میں ایسا تیر مارا جو اسید کی دونوں پنڈلیوں کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ مگر موقعے کی نزاکت کی وجہ سے اسید نے کوئی حرکت نہیں کی بلکہ دم سادھے بیٹھا رہا۔ اب شنفری کو اطمینان ہو گیا کہ راستے میں کوئی ہے نہیں۔ چنانچہ وہ بے دھڑک آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب ان لوگوں کے برابر پہنچا تو وہ سب اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کو پکڑ کر رسی سے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور گھسیٹتے ہوئے اپنے قبیلے میں لائے اور وہاں ... زمین پر ڈال دیا۔ جب یہ خبر قبیلے میں پہنچی تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور شنفری کے انجام کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کی گردن مار دی جائے مگر غالباً بڑے بوڑھوں کی رائے یہ ہو رہی تھی کہ ہمارے ہی خاندان کا آدمی ہے۔ ما ... تو بجا در

دوڑنے میں برق رفتار اور ان سب خصوصیات سے بڑھ کر اچھا شاعر بھی ہے۔ اس نے اس سے صلح کر کے اسے اپنا لیا جائے تاکہ یہ قوت اور اپنی خداداد صلاحیتیں جو یہ پہلے ہمارے خلاف استعمال کرتا تھا، ہماری طرف سے مدافعت میں استعمال کرنے لگے۔ یہ گفتگو ایک نوخیز لڑکا بھی سن رہا تھا جس کے باپ کو شنفری نے قتل کر دیا تھا۔ اسے یہ خطرہ ہوا کہ یہ بڑے بوڑھے اسے کہیں معاف نہ کر دیں اور اس طرح میرے باپ کے خون کا بدلہ رہ جائے۔ اس نے بغیر کسی کو بتائے خنجر کے ایک وار سے اس کا ہاتھ کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ اس ہاتھ کی ہتھیلی میں ایک کالا تل بھی تھا جسے دیکھ کر شنفری نے چند شعر بھی کہے!

لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ پھوڑے سے اس کا ہاتھ کٹ گیا ہے تو سمجھ گئے کہ اب اس کا بچنا مشکل ہے۔ چنانچہ اسید بن جابر نے اعلان کیا کہ اگر شنفری پر کسی کا کوئی مطالبہ ہو تو آ کر اپنا مطالبہ مانگ لے۔ چنانچہ لوگ جمع ہوئے اور سب کے سامنے اسے ایک درخت سے باندھ دیا گیا اور اسی حالت میں مر گیا۔

ابن ضبی نے ایک دوسری روایت میں بیان کیا ہے کہ اسید بن جابر وغیرہ اسے رسیوں سے باندھ کر اپنے قبیلہ میں لائے اور ایک درخت سے باندھ دیا۔ جب صبح ہوئی تو اس سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ اس پر شنفری نے جواب دیا کہ " انما النشید علی المسرۃ" یہ شعر خوشی کے موقع پر اچھا لگتا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ جملہ ضرب المثل بن گیا۔ اس کے بعد ایک لڑکے نے اس کا ہاتھ پھوڑوں سے کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ اپنی ہتھیلی کے کالے تل پر جب شنفری کی نظر پڑی تو اس نے ایک شعر پڑھا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس سے پوچھا کہ سولی پر چڑھ جانے کے بعد تم کو کہاں دفن کریں، تو جواب میں اس نے یہ شعر پڑھے:-

لا تقبروني إنّ قبري محرّم ... عليكم ولكن أبشري أمّ عامر
إذا احتملوا رأسي وفي الرأس أكثري ... وغودر عند الملتقى ثَمّ سائري
هنالك لا أرجو حياةً تسرّني ... سجيس الليالي مبسلاً بالجرائر

تم لوگ مجھے دفن نہ کرنا۔ تم لوگوں پر میرا دفن کرنا حرام ہے۔ البتہ بجو کو بشارت

ا۔ شعر مفضلیات ابن ضبی، تحقیق کارلوس یعقوب لائل کے صفحہ ۱۹۹ پر ملاحظہ کیجئے۔

ہوکہ جب لوگ میرا سر کاٹ لے جائیں گے اور باقی دھڑ ڈال جائیں گے تو اسے کھانے کا موقع مل جائے گا۔ ایسی حالت میں کہ میں لمبی لمبی راتوں میں بے یار و مددگار جرائم کا بوجھ اٹھائے پڑا رہوں، مجھے کسی خوش کن زندگی کی تمنا نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ جب شعر پڑھ چکا تو ایک سلامی نے سامنے آکر اس سے کہا کہ بول اب تیری آنکھیں پھوڑ دوں؟ پھر اس نے اسکی آنکھوں میں ایک نیزہ مارا اور اس طرح اسے قتل کر دیا۔ مرنے سے پہلے شنفری نے اس سے کہا کہ "ایسا ہی میں تم لوگوں کے ساتھ بھی کرتا تھا۔"

جیسا کہ معلوم ہے شنفری نے قسم کھائی تھی کہ قبیلہ ازد کے اس شاخ بنو سلامان میں سے سو آدمی جان سے مارے گا۔ اب تک وہ ننانوے آدمی مار چکا تھا۔ اس کو قتل کرنے کے بعد سلامیوں نے اس کے سر کو قبیلہ میں ڈال دیا تھا۔ اتفاق سے ادھر سے ایک سلامی گزرا۔ اور اس نے اس کے سر کو ٹھوکر ماری کھوپڑی کی ایک ہڈی اس کے پیر میں چبھ گئی اور اس سے زہرباد ہو گیا اور وہ مر گیا اور اس طرح سو آدمی مارنے کی شنفری کی قسم پوری ہو گئی۔

شنفری کے مرنے کے بعد اس کے مربی اور دکھ درد کے ساتھی تابط شرا نے اس طرح اس کا مرثیہ کہا:-

على الشنفرى ساري الغمام ورائح　　غزير الكلى وصيب الماء باكر

عليك جزاء مثل يومك بالجبا　　وقد رعفت منك السيوف البواتر

ويومك يوم العيكتين وعطفة　　عطفت وقد مس القلوب الحناجر

تجول ببز الموت فيه كأنهم　　لشوكتك الحذى ضئين نوافر

فانك لو لاقيتني بعد ما ترى　　وهل يلقين من غيبته المقابر

کہتے ہیں کہ شنفری کا ڈگ (دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ) جب ناپا گیا تو معلوم ہوا کہ پہلا ڈگ ۲۱ قدم کا، دوسرا ۱۷ قدم کا، اور تیسرا ڈگ ۱۵ قدم کا تھا۔ اور اس سے اس کی ہرنوں سے بھی تیز دوڑنے کا راز معلوم ہو جاتا ہے۔

شنفری کا قصیدہ

ألا أم عمرو أجمعت فاستقلت　　وما ودعت جيرانها إذ تولت

شنفری کے اس قصیدہ کی شان نزول میں مختلف واقعات بیان کئے گئے ہیں، جن میں سب

سے معتبر اور اشعار کے مضامین کے مطابق وہ شان نزول ہے جسے ابو محمد القاسم بن محمد بن بشار الانباری نے اپنی مرتب کی ہوئی دیوان المفضلیات کی شرح میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ ابو العباس احمد بن عبید وغیرہ سے روایت کی ہے کہ اس قصیدہ کے کہنے کا سبب یہ ہوا کہ شنفری اپنے تیس ساتھیوں کے ساتھ جن میں تابط شرا بھی تھا، بنو سلامان بن مفرج پر، جو قبیلہ ازد (شنفری کا قبیلہ) کی ایک شاخ تھا، حملہ کرنے کی نیت سے نکلا۔ یہ لوگ بنو سلامان کی جائے سکونت کے قریب مشعل نامی ایک وادی میں رات گزارنے کی نیت سے ٹھیرے۔ تھوڑی دیر میں انھوں نے بکری کے ممیانے کی آواز سنی اور سمجھ گئے کہ آس پاس کوئی آدمی بھی ضرور ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی آنکھیں اس طرف لگا دیں۔ اتنے میں ایک بھیڑیا، بکری کی آواز سن کر ادھر آیا اور اس کو شکار کرنے کی غرض سے اس نے جو جست لگائی تو اس گڑھے میں گر پڑا جسے اس کو شکار کرنے کے لیے کھودا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر یہ سب لوگ ادھر دوڑ پڑے۔ گڑھے کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی بھی اسی طرف سے چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ آدمی نے جب ان لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ڈر اور گھبراہٹ میں اس نے اسی گڑھے میں چھلانگ لگا دی جس میں بھیڑیا گرا تھا۔ ان صعالیک نے جو یہ منظر دیکھا تو گڑھے کے اندر تیروں کی بارش شروع کردی۔ جس سے بھیڑیا اور آدمی دونوں مر گئے۔ جب گڑھے میں سے اس آدمی کو باہر نکالا تو معلوم ہوا کہ یہ ابن الاقطس، ایک دوسرے قبیلہ کا آدمی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ قبیلہ کے ڈر سے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، اور ایک پہاڑ کے دامن میں جا کر پناہ لی۔ ادھر مقتول کے قبیلہ والے اس کی چیخ سن کر اس طرف کو چل پڑے تھے۔ اور سن گن پا کر وہ بھی پہاڑ کے دامن تک آ لیے۔ اور چاروں طرف سے ان سب کو گھیر لیا۔ جب شنفری اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اب بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ہے تو وہ بھی خم ٹھونک کر سامنے آ گئے۔ اب کیا تھا دونوں پارٹیوں میں معرکہ گرم ہو گیا اور کافی دیر تک جم کر مقابلہ ہوتا رہا، جس کے نتیجے میں دونوں فریقوں کو سخت زخم آئے اور بغیر ہار جیت کے فیصلہ کے دونوں فریقوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

ان صعالیک کے یہاں یہ رواج تھا کہ جب یہ لوگ غارت گری کرنے کے لیے نکلتے تو تابط شرا کو کھانے پینے کی چیزوں کا ذمہ دار بنا دیتے تھے۔ چنانچہ اس معرکہ میں بھی حسب روایت تابط شرا یہ ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھا۔ تابط شرا کی یہ عادت تھی کہ لڑائی کے موقعوں پر کھانا بہت ناپ تول کے دیتا تھا، اور کہتا تھا کہ میں یہ حرکت بخل کی وجہ سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف اس خیال سے کہ کہیں لڑائی طول کھینچ گئی اور سامان [illegible] ختم ہو گیا تو تم لوگ بھوکوں

مرجاؤ گے۔ چنانچہ اسی موقع پر شنفری نے یہ قصیدہ کہا جس میں تأبط شرا کی اسی مطلب میں اور دور اندیشی کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

شنفری نے یہ قصیدہ جاہلی شعراء کی ریت کے مطابق (۱) نہایت عمدہ اور بے مثال تشبیب کے ساتھ شروع کیا ہے۔ اور حسین و چیدہ الفاظ اور بڑے ہی دلنشین انداز، اور خوبصورت اسلوب بیان سے اس کا ایسا حسین اور دل آویز مرقع کھینچا ہے کہ شمع دین و ایمان بنا دیا ہے۔ خود کہتا ہے کہ " لو جُنَّ انسان من الحسن جُنَّت " یعنی اگر کوئی آدمی اپنے حسن کی وجہ سے دیوانہ ہو سکتا تو وہ بھی دیوانی ہو جاتی۔ آگے جب اس کی شرم و حیا و عفت و عصمت کا ذکر کرتا ہے تو ایک بدوی دوشیزہ اپنی تمام رعنائیوں اور سحر طرازیوں کے ساتھ سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ مست خرام ہوتی ہے تو ایسے ہوتے ہوئے، نظریں نیچے کر دیتی ہے کہ جیسے کوئی قیمتی شے کھو گئی ہو اور وہ اسے پگ پگ ڈھونڈ رہی ہو۔ پھر اپنی تعریف میں چند اشعار کہتا ہے، اور اس کے بعد تأبط شرا کی تعریف شروع کرتا ہے، اور اس کو " ام عیال " (بچوں کی ماں) سے تعبیر کرتا ہے یہ اس وجہ سے کہ جس طرح ماں اپنے بچوں کے کھانے پینے، آرام و آسائش کا خیال رکھتی ہے۔ تأبط شرا بھی ان لوگوں کا ایسا ہی خیال رکھتا تھا۔ قصیدہ کے آخر میں شنفری نے اپنی عادات و اطوار اور خوبیاں بتائی ہیں اور اسی پر قصیدہ ختم کر دیا ہے۔ اس قصیدہ میں الانباری کی روایت کے مطابق ۳۴ شعر ہیں۔

شنفری کا قصیدہ لامیۃ العرب (۲)

شنفری کا دوسرا مشہور قصیدہ وہ ہے جو عربی ادب میں لامیۃ العرب کے نام سے موسوم ہے۔ اس قصیدہ میں باتفاق رواۃ ۶۸ شعر ہیں۔ (۱) اس قصیدہ میں شنفری نے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے جیسے تمام صعالیک الشعراء کی زندگی کا حقیقی نقشہ بڑے اچھوتے انداز سے کھینچا ہے۔ ایک بے گھر بے زر وہ بے یار و غمگسار مگر غیور خود دار، اور بہادر بدوی کس طرح اپنی زندگی صحراؤں بیابانوں میں درندوں اور جنگلی جانوروں کے درمیان گزارتا ہے بھوک پیاس اور گرمی کی شدت، راتوں کی ہولناک وحشت اور تاریکی، صحرا

---

(۱) خزانۃ الادب و لب لباب لسان العرب۔ عبد القادر بن عمر البغدادی ج ۲ ص ۱۵

(۲) طغرائی نے اس کے مقابلہ میں " لامیۃ العجم " لکھی تھی۔ جو ایک قسم کا شہر آشوب ہے۔

کی ہولناکی، میں کس طرح صرف اپنی اونٹنی کے سہارے ایک منزل موہوم کی طرف چلتا رہتا ہے۔ اور اس طرح زندگی صرف اپنے سہارے بغیر کسی کا احسان لیے، بغیر دست سوال دراز کئے بیت جائے کہ صعلوک کے لیے کسی کے سامنے دست سوال پھیلانا ننگ ہے چاہے اسے اس پیٹ کی خاطر اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے، کیونکہ ان سرپھروں کا نظریہ تھا کہ

ہے کبھی جان اور کبھی تسلیم جان ہے زندگی

اور "کبھی جان" اور "کبھی تسلیم جان" کے اس پاٹ کے بیچ میں آکر عام طور سے یہ لوگ ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے بہادرانہ ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

اس قصیدہ کا مطلع ہے ؎

أقیموا بنی امی صدور مطیکم　　　فانی إلی قوم سواکم لأمیل

یعنی اے میرے ننیہال والو کان کھول کر سن لو۔ تم نے میری بڑی بے عزتی کی ہے، اب میں تم لوگوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔

شنفری کا یہ قصیدہ محض ان آزاد منش سرپھرے نوجوانوں کی داستان حیات اور نظریہ موت و زیست ہی نہیں ہے بلکہ دورِ جاہلی کے شاعرانہ کلام کا بہترین نمونہ، اور ایک بدوی نوجوان کی صحیح زندگی کا مرقع بھی ہے۔ اس قصیدے کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف اسی کو "لامیۃ العرب" کا خطاب دیا گیا۔ اس کی شہرت اور حسنِ قبول کی وجہ سے اس کی مختلف شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اور اب تک اہلِ ذوق اسے فردوس گوش بنائے ہوتے ہیں۔ (۱)

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ شنفری کا قصیدہ لامیۃ العرب اس کا کہا ہوا نہیں ہے بلکہ عباسی دور میں اسے گڑھ کر اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ (۲)

۱۔ لامیۃ العرب کی شرحوں میں مشہور یہ ہیں: (۱) شرح لامیۃ العرب لمحمود بن عمر الزمخشری م ۵۳۸ھ۔ (۲) "شہامۃ الادب فی شرح لامیۃ العرب" لعطاء الشرین احمد عطاء الشو بن احمد المصری ثم المکی۔ (۳) "تفریج الکرب عن قلوب اہل الارب فی معرفۃ لامیۃ العرب" لمحمد بن قاسم بن زاکور المغربی۔

۲۔ الشنفری کے دونوں قصیدوں کا تجزیہ وتحلیل ملاحظہ کیجئے، رسالہ برہان، دہلی ماہ دسمبر ۱۹۶۹ء و فروری ۱۹۷۰ء۔ بقلم مصنف

شنفری کے بعض چیدہ اشعار

شنفری نے مدح، فخر اور حماسہ کے علاوہ غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے، اس کے غزلیہ اشعار اس کی محبوبہ امیمہ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ اس کی غزلیہ شاعری کی مثال اس کے تائیہ قصیدہ میں ملتی ہے جو بہت دل آویز اور موثر ہے۔ اس قصیدہ میں اپنی محبوبہ کا سراپا کھینچتے ہوئے صرف ایک شعر میں اس کے سارے مدوخال کو ابھار کے رکھ دیا ہے۔ کہتا ہے: فدقت وجلت واسبکرت واکملت فلوجن انسان من الحسن جنت

یعنی اس کا ناک نقشہ بڑا تیکھا ہے۔ اعضا بڑے سبک، اخلاق و عادات بہت ہی پیارے اور انداز و اطوار بڑے بانکے اور قد، قد رعنا۔ بس یوں سمجھو کہ قدرت نے اسے ہر طرح سے ایسا مکمل پیدا کیا ہے کہ اگر کوئی آدمی حسن کی وجہ سے دیوانہ ہو سکتا تو وہ بھی دیوانی ہو جاتی۔

شنفری جیسے صحرانورد، آزاد منش اور خون کی ہولی کھیلنے والے نوجوان کے دل میں بھی جب محبت اپنی جوت جگاتی تھی تو اس کی لپٹ سے اس کا پتھر جیسا دل بھی سلگ اٹھتا تھا اور جب ہجر و فراق کے جاں گسل لمحات زندگی کی لذتوں اور بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کو دکھ درد کی کہانی بنا دیتے تو وہ بھی دل پر ہاتھ رکھ کر آہ سرد بھرتا:۔

فواکبداً علی امیمۃ بعد ما طمعت، فهبها نعمۃ العیش زلت

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔

زندگی نے اور خود تو نے مجھے بڑے دکھ دیے، مگر میں تجھ کو برا بھلا نہ کہہ سکا۔ تجھ کو بھلا نہ سکا، اور جب بھی تیری یاد آگئی، تڑپا گئی۔

شنفری نے باوجود اپنی جہالت اور صعلوکیت کے حکمت و فلسفہ کی باتیں بھی کہی ہیں اس قسم کے اشعار میں اس کا وہ شعر بہت مشہور ہے جس میں کہتا ہے کہ جب آدمی کو ایک جگہ عزت و آبرو سے رہنا نصیب نہ ہو تو اسے وہ جگہ چھوڑ کر اپنی دنیا الگ بسانی چاہیئے۔

وفی الأرض منأی للکریم عن الأذی۔ وفیها لمن خاف القلی متحول

شنفری نے اپنی غربت و فلاکت کے باوجود جوہر خودی کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کہتا ہے: ولکن نفسا حرۃ لاتقیم بی علی الذم الا ریثما اتحول

صعالیک الشعراء میں تابط شرا، سلیک بن السلکہ کا بھی یہی انداز زندگی اور طرز کلام تھا۔

تأبّط شرّاً : م [illegible]

صعالیک یا خانماں برباد شعرا میں تأبّط شرّا بڑا جیالا، طاقتور، دوڑنے میں صبا رفتار، اور معاملات کو سمجھنے، خطرات کو بروقت اپنی چھٹی حس کے ذریعہ بھانپ لینے، اور بر موقع تدبیر نکال کر اس پر عمل کر کے اپنا مقصد حاصل کرنے میں طاق تھا۔ اس کے ساتھ اپنے ساتھیوں کا انتہائی مخلص، بروقت ضرورت ان کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے اس کو جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، سب صعالیک "ام العیال" بچوں کی ماں یعنی سرپرست و گرو کے نام سے یاد کرتے تھے، اور بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ شنفری نے اپنے قصیدے میں اس کی دل کھول کر تعریف و توصیف کی ہے۔ بدوی امتیازی خصوصیات کے ساتھ میدانِ شعر و شاعری میں بھی اس کو کمال فن حاصل تھا۔ اس کا کلام فکر و فن کا اچھا مرقع اور زبان و بیان میں مثالی نمونہ ہے۔ اس لیے اب تک ذوق و شوق سے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔

اس کا نام ثابت اور لقب تأبّط شرّاً تھا۔ باپ کا نام جابر اور ماں کا نام اُمیمہ تھا۔ جو قبیلہ فہم کی ایک شاخ بنو القین کے ایک فرد کی لڑکی تھی۔ اس طرح تأبّط شرا نجیب الطرفین (یعنی ماں اور باپ دونوں کی طرف سے) عرب ہے (۱)

نام تو اس کا ثابت تھا لیکن تأبّط شرا کا لقب اس کے ساتھ ایسا چپکا کہ اس کا اصلی نام تو غلب ہو گیا اور وہ صرف "تأبّط شرا" ہو کر رہ گیا۔ "تأبّط" کے معنی ہیں بغل میں رکھنا، اور "شر" کے معنی ہیں "برائی"۔ اس طرح "تأبّط شرا" کے معنی ہوئے "برائی کو بغل میں رکھا" یا "بری چیز کو بغل میں مار کر چلا"۔

ثابت بن جابر کے نام کے ساتھ اس لقب کے چپکنے کے سلسلے میں کئی قصے بیان کیے جاتے ہیں:

(۱) کہتے ہیں کہ ثابت بن جابر ایک دفعہ صحرا میں چلا جا رہا تھا۔ اتفاقاً اسے ایک مینڈھا نظر پڑا، وہ اس مینڈھے کو اپنے بغل میں دبا اپنے قبیلہ میں واپس آنے لگا، راستہ بھر مینڈھا پیشاب کرتا رہا، جس سے اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے، لیکن اس کو اتارا نہیں، لیکن جب گاؤں کے قریب پہونچا تو مینڈھا اتنا بھاری لگنے لگا کہ اس کو لادنا دشوار ہو گیا، چنانچہ ثابت نے اسے زمین پہ پٹک دیا اب جو اسے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ "غول" یعنی بھوت ہے۔ قبیلہ کے لوگوں نے جب پوچھا کہ بھئی تم یہ بغل میں کیا دبائے لا رہے تھے؟ تو بولا کہ بھوت۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ "لقد تأبط شرًا" بری چیز بغل میں لایا۔ اور اسی کے بعد اس کا یہ لقب پڑ گیا۔

بھوت سے متعلق ایک قصہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تأبط شرا ایک بہت ہی تاریک اور مہیب رات میں قبیلہ ھذیل کے علاقہ حی بطان سے گزر رہا تھا کہ اسے "الغول" بھوت یا جن مل گیا، اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، تأبط شرا اس سے رات بھر لڑتا رہا اور آخر کار اسے قتل کر ڈالا، اور اس کی لاش سے ٹیک لگا کر سو گیا تاکہ صبح اس کو اچھی طرح دیکھے۔ جب صبح کو اس کا اچھی طرح معاینہ کیا تو دیکھا کہ وہ ایک بدہئیت، بدقوارہ اور بھیانک مخلوق ہے، سر ایسا جیسے کسی بڑے بلے کا اور زبان پھٹی ہوئی تھی...... اس کے بعد اس کو بغل میں دبا کر اپنے قبیلہ میں لایا۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو بولا بھوت۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ "تأبط شرًا" بری چیز بغل میں دبا کر لایا۔

بھوت سے اپنے معرکہ کا ذکر اور اس کے انجام کے بارے میں اس نے چند اشعار بھی کہے جس میں اس نے بھوت کا سراپا کھینچا ہے۔ کہتا ہے ؎

أَلَا مَن مبلغ فتیان فہم — بما لاقیتُ عند رحی بطان

وإنّی قد لقیتُ الغول تہوی — بسہب کالصحیفۃ صحصحان

مارنے کے بعد ٹیک لگا کر سونے اور صبح کو اسے دیکھ کر اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

فلم انفک متکئاً علیہا — لانظر مصبحاً ماذا أتانی

إذا عینان فی رأسٍ قبیحٍ — کرأس الہر مشقوق اللسان (۱)

(حاشیہ گزشتہ صفحہ)

(۱) پورا سلسلہ نسب بروایت مفضل ابن الضبی یوں ہے: ثابت جابر بن سفیان بن عدی بن کعب بن حرب بن تمیم بن سعد بن فہم بن عمرو بن قیس ابن عیلان بن مضر بن نزار (دیوان المفضلیات لابن الضبی) الاغانی ج ۱۸/۲۰۹۔

(۲) دوسری روایت یہ ہے کہ اس کی ماں نے ایک دفعہ اس سے کہا تو نرا نکھٹو ہے، تیرے سب بھائی باہر جا کر کچھ کما کر لاتے ہیں مگر تو بیٹھا بیٹھا روٹیاں توڑتا رہتا ہے۔ اس پر ثابت نے کہا کہ اچھا ماں میں بھی آج شام کو کچھ کما کر لاؤں گا۔ تو مجھے اپنا تھیلا دے دے۔ ثابت تھیلا لے کر جنگل گیا۔ اور وہاں بہت سے سانپ پکڑے اور انہیں جھولے میں بھر، بغل میں دبا کر شام کو گھر پہونچا اور جھولا ماں کے سامنے ڈال دیا۔ ماں نے جب شوق میں جھولا کھولا تو سارے سانپ نکل کر گھر بھر میں رینگنے لگے، بیچاری ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگی اور گھر چھوڑ باہر بھاگ گئی۔ پڑوسیوں نے پوچھا کہ بہن ثابت آج کیا لایا ہے؟ تو بولی کہ "تھیلے میں سانپ بھر کر لایا تھا" اس پر عورتوں نے کہا کہ آخر سانپ بھرے تھیلے کو لایا کیسے؟ ماں نے کہا کہ "بغل میں دبا کر" اچھا عورتیں بولیں۔ تو یوں کہو کہ "تأبط شراً" "بغل میں بری چیز کو دبا کر لایا۔ اور اسی دن سے اس کا یہی لقب پڑ گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ "تأبط شراً" لقب پڑنے کی وجہ اس کا یہ شعر تھا۔

تأبط شراً ثم راح أو اغتدی

یوائم غنماً أو یسیف علی ذحلِ

ان دونوں قصوں میں سے بھوت والا قصہ بالکل مہمل اور خرافاتی ہے، اس قصے کی وجہ شاید اس خیال کو تقویت دینا ہے کہ صحرائے عرب میں بھوت یا جن پائے جاتے تھے اور یہی بھوت یا جن شعرا پر خیالات وافکار اور مضامین شاعری کا الہام کرتے تھے (۱)

تأبط شراً، دبلا پتلا پستہ قد اور چھریرے بدن کا بدصورت اور آزاد منش نوجوان تھا۔ سماج کی پابندیوں اور خاندان کی ذمہ داریوں سے ہمیشہ گھبراتا رہا اسی لیے سب سے رشتہ توڑ کر صعلوک بن گیا۔ قدرت نے بھی اسے صحرا کی بے رحم زندگی گزارنے کے لیے ساری صلاحیتیں عطا کر دی تھیں بہادر اور نڈر ہونے کے علاوہ کہتے ہیں کہ وہ دو پیروں والی مخلوقات میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا، اور سب سے زیادہ مضبوط پنڈلی کا اور سب سے زیادہ تیز نگاہ کا آدمی تھا، چنانچہ جب بھوک اسے بہت ستاتی تو وہ دور سے ہرنوں کی ڈار کو دیکھ کر ان میں سب سے زیادہ موٹے ہرن کو اپنی نگاہ سے کوت لیتا، اور اس کے بعد پوری ڈار کو دوڑانا شروع کرتا یہاں تک کہ اسی موٹے ہرن کو پکڑ کر دم لیتا اور اپنی تلوار سے ذبح کر کے کھال کھینچ کر کھا جاتا، اسی لیے اسے عربوں میں "اعدی عداء العرب" یعنی عربوں میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا آدمی" کا

---

(۱) اس خیال کے بطلان کے سلسلہ میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔

خطاب بھی دیا گیا ہے، کہتے ہیں کہ تأبط شرا الشنفری اور سلیک ابن السلکہ ایسے برق رفتار تھے کہ گھوڑے بھی ان کی گرد راہ کو نہ پہنچ پاتے تھے ان خوبیوں کے ساتھ تأبط شرا میں اپنے دوسرے صعالیک ساتھیوں کے مقابلہ میں ایک ایسی خوبی بھی تھی جس کی وجہ سے یہ صعالیک اسے اپنا سردار مانتے تھے۔ اور وہ تھی اس کی دور رسی اور عاقبت اندیشی اور دوربینی۔ اسی لیے معرکوں میں تأبط شرا ہی ان صعالیک کا سردار ہوتا تھا۔ اور سامان رسد اور کھانے پینے کی چیزوں کا انچارج۔ چنانچہ اسے یہ صعالیک "ام عیال" بچوں کی ماں کہا کرتے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ "شنفری" نے اس کی تعریف میں جو اشعار کہے ہیں ان میں اپنے قبیلہ کی ریت کے مطابق اسے "ام عیال" ہی کے لقب سے یاد کیا ہے۔ دوربینی، عاقبت اندیشی کے علاوہ تأبط شرا خطرے کا احساس کرنے میں بھی بڑا زود حس تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے نیچے دشمنوں کے دل کی دھڑکنیں تک محسوس کر لیتا تھا۔ اس خوبی کی وجہ سے وہ اکثر موقعوں پر اپنے دشمنوں کو جل دے کر نکل بھاگتا یا گھات لگا کر وار کر کے انھیں شکست دے دیتا تھا۔

تأبط شرا کی ان صفات بے مثال بہادری، اور مصیبتوں پریشانیوں میں صبر و سکون اور سوجھ بوجھ سے کام کرنے کی وجہ سے سارے عرب میں اس کی بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی قبائل اس کے نام سے گھبراتے تھے۔ اور اس کو اپنے سامنے دیکھ کر تھرا جاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ قبیلہ ثقیف کا ایک آدمی ابو دھب نامی، جو بڑا بزدل اور بے وقوف اور خبط الحواس سا آدمی تھا نیا جوڑا پہنے ہوئے تأبط شرا سے ملا اور اس سے کہا کہ ثابت تم دیکھنے میں تو اتنے دبلے پتلے، اور بدصورت آدمی ہو، پھر تم کس ترکیب سے لوگوں پر غلبہ پا لیتے ہو؟ تأبط شرا نے کہا کہ صرف اپنے نام کی وجہ سے۔ چنانچہ جب میں اپنے مقابل سے ملتا ہوں تو کہتا ہوں کہ دیکھو لو میں تأبط شرا ہوں، یہ سنتے ہی اس کا دل سینے سے نکل جاتا ہے، پھر میں جو چاہتا ہوں اس کے ساتھ کرتا ہوں۔ ابو دھب نے کہا کہ ہمیشہ یہی ترکیب کرتے ہو؟ تأبط شرا نے کہا کہ ہاں۔ تب ثقفی بولا اچھا اپنا نام بیچو گے؟ ہاں کیوں نہیں؟ تأبط شرا نے جواب دیا مگر یہ تو بتاؤ کہ تم میرا نام خریدو گے کس چیز سے؟ ابو دھب نے کہا کہ اپنے اس نئے جوڑے اور اپنی کنیت سے... چلو منظور۔ تأبط شرا بولا۔ آج سے تأبط شرا تمہارا نام اور ابو دھب میرا۔ اس کے بعد ثقفی سے اس کا نیا جوڑا لے لیا اور اسے اپنے

پھٹے پرانے کپڑے دے دئے، اور وہاں سے چل دیا۔ بعد میں ابو وھب ثقفی کی بیوی کو مخاطب کر کے چند اشعار کہے جن میں کہا ہے کہ ؎

الا ھل أتی الحسناء أن حلیلھا | تأبط شراً واکتنیت ابا وھب
فھبہ تسمّی اسمی وسمیت باسمہ | فاین لہ صبری علی معظم الخطب
واین لہ باس کباسی | واین لہ فی کل فادحۃ قلبی

یعنی کیا گوری کو یہ خبر مل چکی ہے کہ اب اس کا شوہر تابط شراً بن گیا ہے اور میں نے ابو وھب کی کینت اختیار کر لی ہے مگر یہ مان بھی لو کہ اس نے میرا نام رکھ لیا ہے اور میں نے اس کا تو کیا وہ اس طرح مصیبتوں اور پریشانیوں میں میرا جیسا صبر و سکون بھی کہیں سے لا سکتا ہے؟ پھر میری جیسی طاقت و توانائی رعب و دبدبہ اور مصیبت و آفت سے مقابلہ کرنے کے لیے میرا جیسا جری دل کہاں سے لائے گا؟

یہ صعالیک اپنی زندگی گزارنے اور اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے عام طور سے بڑے اور متمول قبائل پر حملے کرتے رہتے تھے، ان حملوں میں ان کی اپنی بہادری، معرکہ میں حکمت عملی اور بھاگنے میں اپنی برق رفتاری کے علاوہ ان کی تدبیر اور حاضر دماغی سوجھ بوجھ اور خطرے کے وقت چھٹی حس کی بیداری بہت بڑا ہتھیار تھی۔ تابط شراً بہادر دور اندیش ہونے کے علاوہ خطرات کو بھانپ لینے غنیم کی حرکتوں کو بر وقت سمجھ کر اس کی کاٹ کرنے میں بڑا ماہر تھا اپنی انھیں صفات کی وجہ سے وہ اکثر معرکوں سے کامیاب و کامران ہو کر نکلتا تھا اگرچہ اس کے ساتھیوں کی تعداد حریف کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی تھی۔ تابط شراً کی ان صفات کی بہترین مثال اس کی وہ چال ہے جس کی بدولت وہ خود اور اس کا ایک ساتھی دشمنوں کی قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ تابط شراً اپنے دوسرے صعلوک ساتھی الشنفری اور ابن براق الفہمی کے ساتھ قبیلہ بجیلہ کے اونٹ ہنکالایا۔ بجیلہ والوں کو جب خبر لگی تو وہ ان دونوں کے پیچھے ہو لیے، یہ دونوں بھاگ کر سراۃ کے پہاڑوں سے ہوتے ہوئے نیچے اتر لیے تاکہ پہاڑ کی اوٹ لے کر بھاگ نکلیں۔ بجیلہ والے ان کی چال سمجھ گئے، انھوں ... بجائے ان کا پیچھا کرنے کے آگے جا کر ایک تالاب وھط نامی پر گھات لگالی۔ تابط شراً اور ابن براق بھاگتے بھاگتے تھک گئے تھے اور پیاس سے ان کا برا حال ہو رہا تھا چنانچہ تالاب پر پیاس بجھانے اور ذرا سستانے کے لیے اترے۔ تابط شراً نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنی چھٹی حس سے معلوم کر لیا کہ یہاں خطرہ

ہے چنانچہ اس نے ابن براق الفہمی سے کہا کہ دیکھو جلدی سے پانی پی لو، تم تو جانتے ہی ہو کہ ہمارے پیچھے لوگ لگے ہوئے ہیں یہاں خطرہ ہے۔ ابن براق نے کہا کہ ارے کیا خطرہ؟ تم کو کیسے معلوم ہوا؟ اس پر تابط شرا نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی مدد سے میں بھاگتا ہوں۔ مجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ابن براق بولا کہ اماں جاؤ، یہ تو تمہارے ہی دل کی دھڑکن ہے۔ اماں نہیں، تابط شرا بولا میرا دل ایسا بودا کبھی نہیں تھا، پھر اس نے زمین پر اپنے کان لگا دئے، اور بولا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی مدد سے میں بھاگتا ہوں، میں حریف کے دلوں کی دھڑکنیں سن رہا ہوں۔ اچھا بھئی ابن براق نے کہا، ایسا ہی ہے تو میں پہلے تالاب میں اتر کر پانی پیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے تالاب میں اتر کر پانی پیا اور نکل آیا اور کوئی حادثہ نہیں پیش آیا۔ تابط کو کچھ اطمینان ہوا اور وہ بھی تالاب میں گھسا، جونہی بیچ میں پہونچا بجیلی چاروں طرف سے اس پر ٹوٹ پڑے، اور اسے پکڑ اس کی مشکیں کس لیں اور گھسیٹے ہوئے باہر لائے۔ قریب ہی ابن براق بھی تھا، لیکن اس نے کچھ تعرض نہ کیا، کیوں کہ جانتے تھے کہ وہ ابھی ہوا ہو جائے گا۔ اب تابط شرا جو اس طرح گرفتار ہو گیا تو اسے اپنے کئے پر بڑا پچھتاوا ہوا، اور سوچنے لگا کہ اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کروں چنانچہ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے بجیلیوں سے کہا کہ دیکھتے کیا ہو، یہ ابن براق سامنے ہی تو ہے، اسے بھی پکڑ لو۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ میں اس سے کہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ اپنے آپ کو بجیلیوں کے حوالے کر دو، لیکن تم جانتے ہو کہ اسے اپنی دوڑ پر بڑا ناز ہے۔ اور وہ یہ سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوگا، لیکن تم لوگ گھبرانا نہیں وہ پہلی دوڑ میں بیشک ہوا سے بھی تیز بھاگتا ہے لیکن دو چار کھیت جا کر اس کی رفتار دھیمی ہو جاتی ہے اور دوسرے مرحلہ میں تیز گھوڑے کی رفتار سے بھاگتا ہے، لیکن دو چار کھیت کے بعد ہانپنے لگتا ہے اور پھر قدم قدم لڑکھڑانے لگتا ہے، اور ٹھوکر کھا کر گرنے لگتا ہے، تم لوگ اس کے پیچھے لگے رہو، جب دیکھنا کہ اس کا دم پھول گیا ہے، اور وہ لڑکھڑا کر گرنے لگا ہے تو دبوچ لینا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی میری طرح تمہاری قید میں آجائے۔ یہ بات بجیلیوں کے سمجھ میں آگئی، پر انھوں نے کہا کہ اس کی ابتدا کیسے کی جائے۔ یونہی دوڑانے میں تو کوئی فائدہ نہیں۔ تابط بولا کہ دیکھو میں ابھی اس کی بھی ترکیب نکالے دیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے ابن براق کو مخاطب کر کے کہا کہ ارے یہ کیا بیوفائی ہے، اچھے دنوں میں تو تم میرے ہم دم و دمساز تھے، اور اب مصیبت کے وقت ساتھ چھوڑ دو گے ارے تم بھی میرے ساتھ اپنے کو ان لوگوں کے حوالے کر دو ورنہ خواہ مخواہ گھیر کر کے پکڑے جاؤ

گے۔ ان لوگوں نے وعدہ کیا ہے کہ ہم دونوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ یہ سن کر ابن براق بڑے زور سے ہنسا اور سمجھ گیا کہ تابط شراً نے ان لوگوں کے ساتھ کوئی چال چلی ہے، پھر بولا کہ ارے جاؤ ثابت یہ چکمہ کسی اور کو دینا، جب تک میری ٹانگیں سلامت ہیں، کون مجھ کو پکڑ سکتا ہے؟ یہ کہہ کر اس نے ایک زقند بھری، اور یہ جا وہ جا، بجیلی بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ ابن براق پہلی دوڑ میں چھلاوے کی طرح بھاگتا رہا اور دو چار کھیت جا کر اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی، اور تیز گھوڑے کی رفتار سے بھاگتا رہا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے اپنی چال اور دھیمی کر دی، اور لڑکھڑانے لگا، بجیلیوں نے جب یہ دیکھا تو سرپٹ اس کی طرف دوڑ پڑے اور سمجھے کہ بس اب دھر لیا۔ ادھر تابط شراً نے جو یہ دیکھا کہ بجیلی خاصے دور نکل گئے ہیں تو مع اپنی مشکوں کے بھاگ نکلا، اور دوسری طرف سے ابن براق کے پاس پہونچ گیا، ابن براق نے جلدی سے اس کے ہاتھ کھولے، اور دونوں سر پر پانوں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور بجیلی منہ دیکھتے رہ گئے۔ موت کے منہ سے اس طرح نکلنے کے بعد تابط شراً نے ایک زور دار قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

یا عیدُ مالک من شوق و ایراق ۔۔۔ و مرّ طیفٍ علی الأھوال طرّاقِ

مُفضّل ضبّی نے مذکورہ بالا قصیدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس حادثہ میں تابط شراً نہیں گرفتار ہوا تھا بلکہ عمرو بن براق گرفتار ہوا تھا، ان کے ساتھ شنفری بھی تھا، چنانچہ تابط شراً نے ابن براق کے آزاد کرانے کی یہ ترکیب نکال کر شنفری سے کہا کہ تم ابن براق کے قریب کہیں چھپے رہو، اور میں بجیلیوں کے سامنے سے کچھ لنگڑاتا سا، تھکا سا بھاگتا ہوں وہ میرے پیچھے پڑیں گے ان کو، میں اس طرح خاصی دور لے جاؤں گا، تم اتنے میں ابن براق کے ہاتھ پانوں کھول دینا، چنانچہ اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور شنفری نے ابن براق کے ہاتھ پانوں کھول دئے اور تینوں وہاں سے بھاگ لیے، اور اس کے بعد تابط شراً نے یہ قصیدہ کہا، اصمعی نے ان دونوں واقعات کے علاوہ ایک تیسرا واقعہ بھی بیان کیا ہے (۱)

تابط شراً کی تیز نگاہی کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا گیا ہے، کہتے ہیں کہ تابط شراً اپنی بیوی کے چچازاد بھائی کو لے کر قبیلۂ بجیلہ پر حملہ کی غرض سے نکلا، دور سے دیکھا کہ بکریوں کا ریوڑ چر رہا ہے، چنانچہ وہ دبے پانوں آیا اور چرواہے کو قتل کر کے ساری بکریاں ہنکا لے گیا۔ بجیلہ والوں کو جب خبر ہوئی تو وہ گھوڑوں پر، اور پیدل ایک جم غفیر کو لے کر انھیں پکڑنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تابط شراً کی نگاہ اتنی تیز تھی کہ اس نے بجیلیوں کو دور سے دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ پیچھا کر رہے

ہیں، اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ دیکھو بجیلی ہمارا پیچھا کر رہے ہیں جلدی سے بھاگ نکلو، اس نے ادھر ادھر دیکھا اور کہا کہ مجھے تو کچھ نہیں دکھائی دیتا، ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بجیلی آ لئے، تابطا نے اس سے کہا کہ تم اب سرپٹ بھاگ جاؤ، میں آخری تیر تک ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکے رکھوں گا۔ چنانچہ وہ آدمی بھاگ کھڑا ہوا، اور تابط شراً اپنی تیر کمان سنبھال کر بجیلیوں کے سامنے آگیا اور ان پر تیروں کی بارش شروع کر دی جب آخری تیر بھی ختم ہو گیا تو تابط شراً بھاگا اور جب اپنے سالے کے پاس پہونچا تو دیکھا کہ ابھی وہ محفوظ جگہ سے بہت دور ہے اور بجیلی اسے پکڑ لیں گے چنانچہ اسے اس نے وہیں قتل کر دیا، اور وہاں سے بھاگ لیا، بجیلیوں نے لاکھ کوشش کی مگر اسے پکڑ نہ پائے۔ دوسرے دن جب اپنے قبیلہ پہونچا اور اس کی بیوی کا چچازاد بھائی اس کے ساتھ نہ تھا تو لوگوں نے سمجھ لیا کہ وہ مارا گیا، اس پر اس کی بیوی نے طعنہ دیا کہ خود تو بچ کر آ گئے، اور میرے بھائی کو مروا آئے۔ یہ سن کر تابط شراً نے ایک قصیدہ کہا، جس میں کہا ہے کہ:

تقول ترکت صاحباً لک ضائعاً وجئت إلینا فارقاً متباطنا

مذکورہ بالا قصیدہ کہنے کے سلسلہ میں ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جس میں تابط شراً اپنے دو ساتھیوں کو گنوا کر جب قبیلہ پہونچا تو اس کی بیوی نے اسے لعنت ملامت کی اور طعنہ دیا تو اس نے مذکورہ بالا قصیدہ کہا (۱) کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس نے دونوں کا مرثیہ بھی کہا جس کا مطلع ہے:-

أبعد قتیل العوص آسی علی فتی وصاحبه أو یأمل الزاد طارق

ہر وقت خطرات میں رہنے، لوگوں سے دھوکے اٹھانے، اور اپنے خون کے مباح ہونے کی وجہ سے ... [illegible] ... سے تابط شراً ہر وقت چوکس رہ چکنا رہتا تھا۔ اس ... [illegible] زندگی نے اس کے اندر یہ ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ لوگوں کے حرکات و سکنات اور ان کی غیر ... [illegible] کو دیکھ کر ان کے دل کی بات بھانپ لیتا تھا۔ اور حسب موقعہ احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتا تھا۔ اس ضمن میں اغانی نے ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تابط شراً قبیلہ ہذیل پر حملہ کرنے کی نیت سے اپنے چند ساتھیوں کو لے کر نکلا، اور اپنے ایک حلیف اجل بن فنفل کے یہاں جو قبیلہ بجیلہ کا فرد تھا، رات گزارنے کے لیے پہونچا، اس نے ان

(۱) تفصیل الأغانی ج ۸ ص ۲۱۳ پر ملاحظہ کیجئے۔

سب کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور غیر معمولی عزت و اکرام سے اپنے یہاں اتارا، اور چوں کہ تابط شراً اور اس کے ساتھی عام طور سے بجیلیوں پر حملہ کیا کرتے تھے، اس لیے اجل نے سوچا کہ آج موقعہ اچھا ہے، سب کو ختم کر دو تاکہ بدلہ بھی ہو جائے اور ان سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے، چنانچہ اس نے ان کے پینے کے لیے زہر ملا شربت منگایا، تابط شراً اس کی اس غیر معمولی آؤ بھگت اور احترام و اکرام کو دیکھ کر ٹھٹک گیا، اور سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے، چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں سے اپنا شبہ بتا کر چپکے سے کہا کہ دیکھو اسے یہ شبہ نہ ہونے پائے کہ ہم اس کی چال سمجھ گئے ہیں، اور جب شربت یا کھانا آئے تو تم سب قسم کھالینا کہ ہم آج کھانا نہ کھائیں گے، ہمارا پیٹ بھرا ہے، پھر میں موقع دیکھ کر اسے قتل کر ڈالوں گا۔ تابط شراً کو اجل بن نفضل کو قتل کرنے کا موقع تو نہ ملا، لیکن خطرے کو اس طرح بھانپ لینے کی عادت کی بدولت وہ اور اس کے سارے ساتھی بچ گئے، یہاں سے بچ نکلنے کے بعد اور سب ساتھی تو شکار میں لگ گئے، تابط شراً نے تنہا قبیلہ ھذیل پر حملہ کر کے انھیں شکست دی، اور مال غنیمت حاصل کیا، اس واقعہ کی یاد میں بھی اس نے ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے:-

اقسمت أن لا أنسى وإن طال عيشنا   صنيع بكز والأجل بن نفضل

جان جوکھوں میں ڈال کر جان بچانے کی ایک ایسی مثال تابط شراً کی زندگی میں ملتی ہے جس کی نظیر مشکل سے ملے گی، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صعالیک عزت آبرو کے ساتھ مر جانے کو ذلت و رسوائی سے زندہ رہنے پر کتنا ترجیح دیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ قبیلہ ھذیل کے پہاڑوں کے اندر ایک غار میں شہد کی مکھیاں اپنا چھتا لگاتی تھیں، اور جب شہد تیار ہو جاتا تو تابط شراً اپنے چند ساتھیوں کو لے کر آتا اور سارا شہد نکال کر ایک مشکیزہ میں بھر کر چل دیتا، ھذلی اس کی اس حرکت سے بہت پریشان تھے، ایک سال انھوں نے طے کر لیا کہ اب کی دفعہ تابط شراً کو گرفتار کر کے اس کی اس حرکت کا مزہ چکھائیں گے، چنانچہ جب چھتا پک گیا تو تابط شراً حسب عادت اپنے چند ساتھیوں کو لے کر غار پر پہونچا اور ایک رسّی کے ذریعہ غار کے اندر گھس گیا، ہذلی تاک میں چھپے بیٹھے تھے، وہ دوڑ پڑے، تابط شراً کے ساتھی جو باہر تھے وہ بھاگ لیے، اور تابط شراً غار ہی کے اندر رہ گیا۔ ہذلیوں نے آکر رسی پکڑ کر ہلائی، تابط شراً نے غار سے منہ نکال کر جھانکا تو ہذلیوں کو دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی، سوچا بر سے

پھنسے۔ ہذیلیوں نے کہا کہ اب خیریت اسی میں ہے چپ چاپ باہر آجاؤ۔ تابط شراً نے کہا کہ آؤں تو پر کس شرط پر۔ یا تو بغیر لیے دئے مجھے چھوڑ دینے کا وعدہ کر دیا فدیہ لے کر چھوڑنے کا وعدہ کر دو ورنہ میں نہیں نکلوں گا۔ ہذیلیوں نے کہا کہ شرط ورط کوئی نہیں بس بلا شرط باہر آجاؤ ورنہ دیکھو اب بچ کر نہیں جا سکتے ہو۔ تابط بولا، جی ہاں اپنی بوٹیاں کروانے کے لیے نکل آؤں یہ مجھ سے نہ ہوگا میں ہرگز نہ نکلوں گا۔ اور اندر گھس گیا، غار کے اندر اس نے پہلے ہی سے دوسری طرف ایک سوراخ کر رکھا تھا کہ اگر کہیں پھنس گیا تو اس سے نکل بھاگوں گا۔ چنانچہ اس نے اس سوراخ کے ذریعہ غار کے دوسری طرف خوب شہد بہایا، پھر اپنے سینہ پر اپنا چمڑے کا مشکیزہ چپکا کر اور سوراخ سے نکل کر ٹانگیں اوپر منہ نیچے کر کے شہد کی روانی پر پھسلنا شروع کر دیا۔ اور آناً فاناً پہاڑ کی دوسری طرف پر آگیا۔ اور اس کے ذرہ برابر خراش بھی کہیں جسم پر نہیں آئی۔ یہ جگہ جہاں یہ اترا تھا، غار کے منہ سے تین دن کی مسافت پر تھا، اس لیے اسے اطمینان تھا کہ اب ہذیلی مجھ کو قیامت تک نہیں پکڑ سکتے۔ چنانچہ اطمینان سے اٹھا، اپنی حالت درست کی اور بلا خوف و خطر اپنے قبیلہ پہونچ گیا۔ اس واقعہ کی یادگار میں بھی اس نے ایک بہت زوردار قصیدہ کہا ہے، جس کا مطلع ہے:۔

اقول للحیان وقد صفرت لہم   وطابی ویومی ضیق الجحر معور

جس میں مذکورہ بالا قصہ کی طرف اشارہ کر کے ایک بڑے پتہ کی بات کہتا ہے، کہتا ہے کہ آدمی جب کسی مصیبت میں پھنس جائے اور اس سے نکلنے کی تدبیر نہ کر سکے تو پھر اس کی خیر نہیں یا تو وہ ختم ہی ہو جاتا ہے یا پھر شدید تکلیف اور پریشانی اٹھا کر اس کی جان بچ پاتی ہے لیکن عقل مند آدمی پر جب کوئی آفت آن پڑتی ہے اور وہ حکمت عملی سے کام لے کر اس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے تو ایسا آدمی دنیا میں کامیاب ترین رہتا ہے، اور جب بھی اس کے سامنے ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو وہ اپنی کوشش سے دوسرا دروازہ کھول لیتا ہے:۔

اذا المرء لم یحتل وقد جد جدہ   اضاع وقاسی أمرہ وھو مدبر

ولکن اخوالحزم الذی لیس نازلاً   بہ الأمر الا وھو للحزم مبصر

فذاک قریع الدھر ما کان حولا   اذا سد منہ منخر جاش منخر

تابط شراً کے اس قسم کے قصے تمام تذکرے کتابوں میں بھرے پڑے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اور اس کے ساتھی ہر موقعہ پر اپنی بہادری، عاقبت اندیشی، چالاکی اور حکمت عملی سے بڑی بڑی مصیبتوں اور پریشانیوں سے ہمیشہ بچ کر نکل جاتے تھے۔

تحلیل وتجزیہ قصیدہ:

یاعید مالک من شوق و إیراق ومرّ طیف علی الأهوال طرّاق

زیرنظر قصیدہ صعالیک عرب یعنی خانماں برباد شاعروں کی زندگی کے دونوں رخ کا صحیح عکس ہے۔ ایک طرف تو یہ لوگ بڑے سفاک اور سنگدل تھے، مگر دوسری طرف ان کے سینہ میں ایک بڑا گداز اور محبت سے لبریز دھڑکتا دل تھا، جو اپنی محبوبۂ دلنواز سے بچھڑنے کے بعد اس کی یاد میں، صحرا کی بے پناہ وسعتوں میں چپکے چپکے روتا تھا۔ اور جب کوئی ہمدم وغمگسار نہ ملتا تو یہ غم جاناں شعر و نغمہ میں ڈھل کر ساری فضا اور ماحول ہی کو اپنا ہمدم و دمساز بنا لیتا، اور پھر خیال حبیب، مجسم حبیب بن کر شاعر کے سامنے کھڑا ہو جاتا، پھر کیا تھا، نقشہ بدل جاتا اور اب "خلوت میں ان سے ہونے لگیں ملاقاتیں" کا سماں بندھ جاتا۔ مگر ایسے دل جلوں کی قسمت میں ایسے سماں کا دوام کہاں، سپیدۂ صبح نمودار ہوتے ہی، پھر وہی تگ و دو، جان بچانے کے لیے وہی صحرا پیمائی، اور روزی و رزق کے لیے وہی جاں کاہی، اور یوں ہی غم دوراں کے ساتھ غم جاناں کو سینے سے لگائے، آخر میں اپنی زندگی کو ہی مداوائے غم بنا دیتے۔

چنانچہ تابط شرا نے اس قصیدہ میں سب سے پہلے محبوبہ کے ہجر و فراق کا ذکر کیا ہے، پھر بجیلہ والوں کے ہاتھوں اپنے قید ہونے کے واقعہ کا ذکر کر کے عمرو بن برّاق اور الشنفری کی مدد سے اس تدبیر کا ذکر کرتا ہے، جس کی وجہ سے اس قید سے اس کو نجات ملی۔ اس ضمن میں اپنی برق رفتاری کا ذکر کرتا ہے، اس کے بعد اپنے اس مثالی آدمی کے صفات گناتا ہے جس کے آگے وہ جھک سکتا ہے، پھر اپنی بہادری کا ذکر کر کے، خطرات میں بے خوف و خطر کود پڑنے کی عادت اور اپنی فیاضی و سخاوت پر فخر کرتا ہے اور آخر میں ان لوگوں کو لعنت و ملامت کرتا ہے، جو اسے اپنا مال خرچ کرنے پر لعنت و ملامت کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا تابط شرا کا یہ قصیدہ یادگار ہے اس واقعہ کا جس میں پانی پیتے وقت وہ قبیلۂ بجیلہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا، اور ابن براق اور شنفری کی مدد سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بھاگتے بھاگتے تھک کے چور ہو کر، جب وہ ایک محفوظ مقام پر ٹھہرتا ہے تو تو سورج بھی اس کا ساتھ دیتے دیتے تھک کر پہاڑوں کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اور رات کی

تاریکی آہستہ آہستہ صحرا پر چھانے لگتی ہے اور تھوڑی ہی دیر میں ہر طرف سناٹا اور موت کا سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ عمرو بن براق اور شنفری نہ جانے کس طرف نکل گئے اور اب یہ ہے اور یہ صحرا اور اس میں سائیں سائیں کرتی ہوائیں، اتنے میں خیال محبوب آجاتا ہے، جو "اک تیز چھری ہے جو اترتی چلی جائے"۔ اور چند لمحوں کے بعد یہ خیال محبوبہ کی شکل میں مجسم ہو کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے ؎

یا عیدُ مالکَ مِن شوقٍ و ایراقِ　　　　و مَرِّ طیفٍ علی الاھوالِ طرّاقِ

راستہ پرخطر ہے، سانپ بچھوؤں سے بھرا پڑا ہے، پھر بھی خیال حبیب براہ دلنوازی و دلداری پیدل چل کر آئے تو دیدہ و دل کیسے نہ فرش راہ کیجیے؟ کہتا ہے ؎

یسری علی الأین والحیات محتفیا　　　　نفسی فداؤک من سارٍ علی ساقِ

تشبیب کے ان دونوں شعروں کے بعد اپنی اس ریت کا اظہار کرتا ہے کہ جب دوست احباب ساتھ چھوڑ دیں اور مصیبت و پریشانی میں کوئی سہارا و مددگار نہ رہ جائے تو میں اپنے اوپر اور اپنی دوڑ پر بھروسا کرتا ہوں اور اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہوں اس ضمن میں اس قصہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں وہ پانی پیتے وقت قبیلہ بجیلہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا' اور ابن براق سے سانٹھ گانٹھ کر کے اس مصیبت سے بچ سکا تھا اور بجیلہ والے منہ دیکھتے رہ گئے تھے (۱)

کہتا ہے کہ جب میں قبیلہ بجیلہ کے ہاتھوں، پانی پیتے وقت رات میں مقام الرھط میں گرفتار ہو گیا تو پھر اپنی دوڑ کے سہارے ہی بچ سکا۔ ان لوگوں نے میرے پیچھے اپنے تیز دوڑنے والے گھوڑے اور آدمی بھی دوڑائے جنھوں نے میرا پیچھا ابن براق کے دوڑنے کی جگہ تک کیا مگر مجھے پا نہ سکے۔

بجوتُ منہا، نجائی مِن بُجَیلۃ إذ　　　　أُلقیتُ لیلۃ خبت الرھط أوراقی

لیلۃ صاحوا و أغروا بی سِرَاعَھُم　　　　بالعَیکَتینِ لدی معدی ابن برّاق

پھر اپنی اس تیز دوڑ کا نقشہ کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اتنی تیزی اور برق رفتاری سے بھاگا کہ جیسے انھوں نے مجھے نہیں بلکہ کسی صبار فتار شتر مرغ یا برق رفتار ہرنی کو دیا ہو اور وہ جی جان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ہوں۔ کیوں کہ چوپایوں اور پرندوں میں کوئی ابھی ایسی قسم نہیں ہے جو مجھ سے تیز دوڑ سکے یہاں تک کہ آخر کار میں ان لوگوں کے چنگل سے بچ گیا حالانکہ

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے المفضلیات لابن ضبی، شرح الأنباری تحقیق کارلوس یعقوب لائل

میں ایسا پھنس گیا تھا کہ بجیلہ والے میرا کام ہی تمام کر دیتے۔ اپنے اوپر بھروسا اور مصیبت کے وقت ہوش و حواس قائم رکھنے اور عقل مندی سے کام لینے کی وجہ سے اب میں دوستوں کا محتاج نہیں رہ گیا ہوں، اگر ایسے وقت میں کوئی ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو میں آہ و بکا نہیں کرتا، خوف اور ڈر سے واویلا نہیں مچاتا کہ یہ صعلوک کی ریت کے خلاف بات ہے۔

كأنما حثحثوا حُصًّا قوادمه ... أو أمّ خشف بذي شث وطباق

لا شيءَ أسرعُ مني ليس ذا عذرٍ ... وذا جناحٍ بجنب الرَّيد خفّاقِ

حتى نجوتُ ولما ينزعوا سلبي ... بوالهٍ من قبيض الشد غيداق

ولا أقولُ إذا ما خلةٌ صرمت ... يا ويحَ نفسي من شوقٍ وإشفاقِ

نویں شعر میں پھر تیسرے شعر سے ملتی جلتی بات کہتا ہے جس میں درست احباب جب قطع تعلق کر لیں تو پرواہ نہ کرنے اور اپنے اوپر صرف بھروسہ کرنے کی بات کہی ہے۔ دسویں شعر سے ۱۴ویں شعر تک تابط شراً اپنی اس مثالی شخصیت کا مرقع پیش کرتا ہے جس پر وہ بھروسہ کر سکتا ہے، جس سے مصیبت کے وقت مدد مانگ سکتا ہے اور جس کے سامنے سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر میں کسی سے مدد لے سکتا ہوں اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتا ہوں تو صرف اس شخص کی طرف جو آزمودہ کار، دور بین، اور شکر اور تعریف کو حاصل کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہو، جو اپنے قبیلہ کا سردار ہو، اور ہر چھوٹا بڑا اس کے احکامات کو بے چوں چرا مان لیتا ہو اور اتنا جری، نڈر اور پختہ عزم و ارادہ کا آدمی کہ گھٹا ٹوپ اندھیاری رات میں جب کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہو بلا خوف و خطر اپنی منزل کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہو، اور معرکوں میں جس کے ہاتھوں میں جھنڈا رہتا ہو، جو مجلسوں کی جان، بے لاگ فیصلہ کرنے والا اور جہاں دیدہ جہاں گشت ہو۔ جس آدمی میں یہ صفات جمع ہوں وہ میرا مثالی گرو ہے اور صرف ایسے ہی آدمی سے اگر وقت پڑ جائے تو میں اپنا ہاتھ مدد کے لیے بڑھا سکتا ہوں۔

فذاك همّي وغزوي أستغيث به ... إذا استغثتُ بضافي الرأس نغّاق

۱۶ویں شعر سے ۱۹ویں شعر تک دشمنوں سے بھاگ کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر اپنے ساتھیوں سے پہلے پہونچ جانے کا ذکر کرتا ہے اور اس طرح کہ جوتا اس بری طرح سے پھٹ چکا ہے کہ صرف انگلیاں چھپ پاتی ہیں، تلا بھی اکھڑ چکا ہے اور اسے پاؤں سے اٹکائے رکھنے کے لیے ایک تسمہ سے باندھ رکھا ہے۔ اس غربت و افلاس کے باوجود اگر کوئی اسے سخاوت اور دریا دلی سے روکتا ہے اور بخل کی تلقین کرتا ہے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ چنانچہ ۲۲ویں شعر میں کہتا ہے کہ اے

مجھے ملامت کرنے والے اتنی سختی سے کیوں لعنت ملامت کرتا ہے یہ سب روپیہ پیسہ دھن دولت آنی جانی ہے بھلا تو بخل کر کے اسے روکنا چاہے گا تو وہ تیرے پاس رک جائے گی؟

عاذلتی انّ بعض اللوم معنفۃ ؎ وھل متاع وان ابقیتہ باق ؟

آخر کے اشعار میں اپنے اخلاق حمیدہ اور پاکیزہ کردار کا ذکر کے لعنت ملامت کرنے والے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ جب تم میرے ان اخلاق حمیدہ اور صفات عالیہ کو یاد کرو گے تو اپنے کیے پر شرم سے پانی پانی ہو جاؤ گے"

لتقرعنّ الی سنّ من ندم ؎ اذا تذکرت یوماً بعض اخلاقی

یہ تھا تابط شراً کا وہ مشہور قصیدہ جو نہ صرف اس کی بلکہ اس جیسے تمام صعالیک عرب کی زندگی اور اس سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا عکاس اور ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اس میں حکایت غم دوراں بھی ہے اور شکایت غم جاناں بھی۔ ایک سخت کوش تندخو آزاد منش نوجوان کے جذبات کی تصویر کشی بھی ہے اور ان خانماں برباد شاعروں کی فلاکت زدہ انتہائی عسرت و غربت کی ماری زندگی کا نقشہ بھی اور اس کے ساتھ اس زندگی سے حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں افذ کی ہوئی حکمت و فلسفہ کی باتیں بھی، جن میں اگرچہ آج کل کے اعتبار سے بظاہر کوئی ندرت یا رفعت تخیل نہیں ہے لیکن اس معاشرہ اور ان حالات میں بہت وقیع اور اہم سمجھی جاتی تھیں۔

یہ تھا صعالیک الشعراء کے ایک دوسرے نمائندہ کی زندگی اور اس کے کلام کا نمونہ جس سے ہم کو یہ اندازہ ہوا کہ اس کے کلام میں بھی وہ جاہلی اور بدوی گمبھیرپن، خیالات میں سطحیت لیکن صفائی، الفاظ میں ثقل لیکن معانی کے لیے مناسب ہیں، اور انداز گفتار اور اسلوب گھٹا ہوا ہے جس میں جھول یا کمزوری نہیں ہے۔

موازنہ: تابط شراً کے کلام کا شنفری کے کلام سے موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ تابط شراً اور شنفری میں مضامین کے اعتبار سے بڑی مشابہت ہے، اور انداز بیان میں بھی دونوں جاہلی انداز کے پابند ہیں، مگر تنوع اور سلاست و روانی اور نغمگی میں شنفری تابط شراً سے بڑھا ہوا ہے، خاص طور سے غزل میں شنفری تابط سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ وصف اور سراپا میں بھی شنفری تابط سے ممتاز نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہم نے شنفری کے قصیدہ جس کا مطلع ہے "الا ام عمرو اجمعت ...." میں غزل اور وصف میں جو بانکپن اور اثر دیکھا وہ تابط کے کلام میں نہیں تھا۔ اسی طرح اظہار محبت اور ہجر و فراق کی کہانی میں جو درد اور اثر ہے، وہ تابط سے زیادہ موثر اور جاندار ہے۔ جیسے شنفری نے اسی جاہلی دور میں "لامیۃ العرب" کہہ کر ہمیشہ کے

لیے اپنے کو ان صعالیک میں ممتاز کرلیا ہے۔

تابط کی طرف بعض حکیمانہ اور فلسفیانہ اشعار بھی منسوب ہیں، جیسے اس معنی کا شعر کہ آدمی جب مصیبت میں پھنس جائے اور حکمت و تدبیر سے کام نہ لے تو وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو شخص ہوش و حواس قائم رکھ کر تدبیر سے کام لے تو وہی عقل مند کہلاتا ہے اور وہ زندگی بھر خوش و خرم رہتا ہے، اور ایک دروازہ جب بند ہوتا ہے تو دوسرا کھول لیتا ہے۔

إذا المرء لم يحتل وقد جد جده — أضاع وقاسى أمره وهو مدبر
ولكن أخو الحزم الذي ليس نازلا — به الخطب إلا وهو للقصد مبصر
فذاك قريع الدهر ما عاش حول — إذا سد منه منخر جاش منخر

اپنے مثالی نوجوان کے بارے میں کہتا ہے (اپنے چچازاد بھائی شمس بن مالک کو مثال بنا کر)

قليل التشكي للمهم يصيبه — كثير الهوى شتى النوى والمسالك
يظل بموماة ويمسي بغيرها — جحيشا ويعروري ظهور المهالك

یعنی وہ مصیبتوں اور پریشانیوں میں شکوہ و شکایت نہیں کرتا، اس کے عزائم بلند اور اسفار کا خوگر ہے، جو اپنا دن ایک صحرا میں اور شام دوسرے میں گزارتا ہے اور تن تنہا ہلاکتوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اس کا آخری شعر ہے:

يرى الوحشة الأنس الأنيس ويهتدي — بحيث اهتدت أم النجوم الشوابك

یعنی تنہائی و کس پرسی کو ہی وہ مونس و غم خوار سمجھتا ہے، اور عزائم کا اتنا بلند کہ ستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے۔

جو دوڑنے میں ہوا سے بھی بازی لے جائے اور سونے کی حالت میں بھی جس کا دل جاگتا رہے اور جس کی آنکھیں دل پر پہرا بٹھائے رکھیں اور بڑے بڑے سورماؤں سے مقابلہ میں جم جائے اور جب اپنے نیزے کی انی یا تلوار کی دھار اس کی ہڈیوں میں پیوست کر دے تو موتیں کھل کھلا کر ہنس پڑیں

ويسبق وفد الريح من حيث ينتحي — بمنخرق من شده المتدارك
إذا حاص عينيه كرى النوم لم يزل — له كالئ من قلب شيحان فاتك
ويجعل عينيه ربيئة قلبه — إلى سلة من حد أخلق صائك
إذا هزه في عظم قرن تهللت — نواجذ أفواه المنايا الضواحك

اشاریہ

(حضرت) ابراہیم علیہ ۲۴، ۸۲
ابن الکلبی ۲۶۷
ابن المعتز ۳۰۸
ابن خلدون ۳۶، ۱۶۷
ابن رشیق ۱۴۴، ۱۶۷
ابن سلام الجمحی ۲۷۴، ۲۷۶، ۲۸۲، ۲۸۵، ۳۱۰
ابن عبدربہ ۱۶۷
ابن قتیبہ ۲۴۳
ابن ہشام ۳۶، ۲۲۶
ابن یامین ۲۴۷
ابوالعتاہیہ ۲۱۲
ابوالعلاء المعری ۲۱۲، ۲۷۷
ابوالفرج اصفہانی ۲۸۵
ابوالہلال العسکری ۱۰۱
ابوامامہ ۱۹۲
ابوتمام ۱۲۹، ۱۴۳، ۱۶۶، ۲۱۲
ابوجبیل قیس بن خشاف البرجمی ۱۰۵
ابومجر العسانی ۲۶۲
ابوداؤد ۱۴۵، ۱۷۳
ابوزید الطائی ۷۵
ابوزید القرشی ۱۹۳، ۲۷۴، ۲۷۶، ۲۷۸
ابوزید عنترہ ۱۲۹
ابوسفیان ۱۳۴، ۲۲۹
ابوضمضم ۱۲۹، ۱۶۶
ابوعامر راہب ۲۸۴
ابوعبیدہ ۲۲۶، ۳۰۹
ابوعمر بن العلا ۲۳۵، ۲۳۹
ابوقابوس ۴۷
ابومحمد القاسم ۳۲۹
ابونواس ۱۳۰
احمد بن الامین الشنقیطی ۱۸۲، ۲۷۶
احمد بن جنید ۳۲۹
احنف بن قیس ۲۱۱
اخطل ۱۶۹، ۱۹۳، ۲۳۵
اخفش ۱۲۶، ۱۵۰
(حضرت) اسماعیل علیہ السلام ۲۴، ۲۸، ۲۹، ۴۲
اسید بن جابر ۳۲۰، ۳۲۶، ۳۲۷
اصحاب سیر ۹۴
اصمعی ۲۲۶، ۲۶۷، ۱۶۶، ۹۰
اعشیٰ میمون بن قیس ۱۳۴، ۱۳۵؛ ۱۳۷، ۱۴۰؛ ۱۴۹، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۸۵، ۱۹۴، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱؛ ۲۳۲، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶؛ ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹
اغانی ۱۳۴، ۲۲۴، ۲۶۷، ۲۸۵، ۲۹۰
اکثم بن صیفی ۸۹، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷
الاخطل التغلبی ۲۶۳
الاعشیٰ ۴۸، ۶۵، ۱۲۰، ۱۴۴
الانباری ۳۲۹، ۳۳۰
البردخت ۲۹۵
الحارث بن جبلہ ۴۸، ۳۱۰
الحارث بن حلزہ الیشکری ۱۳۶، ۱۶۸، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۹، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳

ابن الشجری نے اپنے حماسہ میں تأبط شراً کا ایک اور قصیدہ نقل کیا ہے جس کا مطلع ہے کہ

تقول سلیمی لجاراتہا   أری ثابتاً یفنا حوقلا

آخر میں کہتا ہے:

وکنتُ اذا ما ھممتُ اعتزمتُ   واحجر اذا قلت أن أفعلا

حوالہ جات:

۱۔ لسان العرب لابن منظور ۷/۱۷۹، ۱۴/۲۶۷، ۹/۱۲۱
۲۔ الأغانی الاصفہانی ۱۸/۲۰۹
۳۔ المفضلیات لابن ضبی شرح الأنباری تحقیق کارلوس یعقوب لایل
۴۔ شرح شواھد المغنی للسیوطی /۱۹، ۴۳، ۸۲
۵۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ ۱۷۴، ۱۷۷، ۴۲۲، ۴۲۵ اور آگے
۶۔ خزانۃ الأدب ولب لباب لسان العرب للبغدادی ۱/۶۶، ۲/۱۶، ۱۷
۷۔ مروج الذہب للمسعودی ۸۔ دائرۃ المعارف الإسلامیۃ
۹۔ التذکرۃ السعدیۃ: عبداللہ الجبوری/۴۴
۱۰۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ۱/۱۶۲
۱۱۔ حماسہ ابو تمام مختلف مقامات پر
۱۲۔ حماسہ ابن الشجری /۴۷
۱۳۔ الشعراء الفرسان للبستانی

الحسین بن مطیر الاسدی ۱۵۲
الخامس ۴۷
الزبیر سالم بن ہلال البطال ۱۱۰
السموئل بن عادیا ۵۴، ۲۳۸
الشنفری ۱۴۳، ۳۱۸، ۳۱۹،
۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳،
۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷،
۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱،
۳۳۲، ۳۳۳
الصمہ بن عبداللہ القشیری ۱۵۱
الضحاک ۱۳۰
العزیز باللہ الفاطمی ۲۲۵
العقد الفرید ۱۶۷
المتنبی ۲۱۲
المرزبانی ۳۰۸
المرقش الاصغر ۲۴۱، ۲۹۳
المرقش الاکبر ۵۱، ۱۴۳، ۱۵۳،
۱۶۸، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵،
۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹،
۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳،
السیب بن علس ۲۲۸، ۲۴۵،
المفضل الضبی (محمد بن الضبی)
۲۷۱، ۲۹۴، ۳۱۰، ۳۱۲،
۳۲۲، ۳۲۵
المثنہ بن دار السار ۲۵۶، ۲۶۶،
۲۷۰، ۲۸۰، ۳۱۳

النعمان (نعمان بن المنذر) ۴۷، ۹۵،
۹۶، ۹۸، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۳۷،
۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸،
۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۴،
۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۹، ۲۲۴،
۲۲۸، ۲۳۱
النمر بن تولب ۲۷۴
امرؤ القیس ۴۸، ۵۰، ۵۱، ۵۳،
۱۰۲، ۱۲۹، ۱۳۹، ۱۴۲، ۱۴۳،
۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۶۱،
۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲،
۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶،
۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۱،
۱۸۲، ۱۸۴، ۱۹۲، ۱۹۳،
۲۰۳، ۲۱۱، ۲۲۷، ۲۳۲،
۲۳۸، ۲۷۵، ۲۷۷، ۲۷۸،
۲۷۹، ۲۸۷، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۹،
۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰
امیہ بن ابی الصلت ۵۵، ۱۲۸،
۱۳۷، ۱۶۸، ۲۷۴، ۲۸۲،
۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶،
۲۸۷، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱
اوس بن حجر ۲۰۴
بشار بن برد ۱۳۰
بشامہ بن الغدیر ۲۰۴

بشر بن ابی خازم ۲۷۴
بلعم بن باعورا ۲۸۴
تأبط شرا ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۳، ۳۲۴،
۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۳
تبریزی ۲۷۶
ثعالبی ۲۸۵
ثمود ۲۷، ۲۸، ۳۶، ۹۳، ۲۰۷
جاحظ ۷۹، ۸۰، ۹۱، ۹۲، ۹۸، ۲۸۵
جرجی زیدان ۱۱۴، ۱۲۸، ۱۲۹، ۲۸۵
جریر بن عبدالمسیح ۱۹۹، ۲۳۹، ۲۴۱
جنگ بسوس ۴۳، ۲۵۶، ۲۶۶
جنگ قادسیہ ۹۷
(ڈاکٹر) جواد علی ۱۱۵، ۱۱۷
حاتم ۱۰۵
حاتم طائی ۱۳۱
حاجب بن زراۃ التمیمی ۹۵
حارث بن عوف ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶،
۲۲۲
حافظ شیرازی ۳۱۰، ۳۱۳
حجاج بن یوسف ۱۹۹
حرب داحس وغبرا ۴۳، ۸۹، ۱۱۱،
۲۰۴، ۲۱۰
حرب فجار ۴۴، ۸۹
حرثان بن محرث (ذوالاصبع العدوانی)
۸۸

حسان (حسان بن ثابت) ۲۸، ۴۸، ۴۹، ۱۲۲، ۱۳۷، ۱۸۵، ۱۹۴
حصین بن ضمضم ۲۲۲
حماد الراویہ ۱۲۹، ۱۹۹، ۱۹۷
حمیر ۲۸، ۳۱، ۴۱، ۶۴، ۶۵
خالد بن الولید ۴۷
خداش بن زہیر ۲۷۴
خلیل بن احمد ۱۲۶، ۱۵۰، ۲۹۵
خنساء ۱۹۴
خویلد بن عمرو الغطفانی ۸۹
دارالندوہ ۴۴، ۶۹
درید بن الصمۃ ۱۹۸
ذوالاصبع العدوانی ۹۹، ۱۰۰
ذو فائش الحمیری ۲۳۶، ۲۳۹
ذو نواس ۴۰
ربیعہ بن الحارث ۲۴۲
ربیعہ بن مقروم ۲۰۰
ربیعہ بن نضر اللخمی ۱۰۶
ربیعہ سطیح بن مازن ۱۰۶
زہیر بن ابی سلمٰی ۵۱، ۱۳۶، ۱۴۱، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۵۷، ۱۶۳، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۹۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۲۷، ۲۳۲، ۲۵۲، ۲۸۹

سام (ابن نوح علیہ) ۲۷، ۹۲
سد مارب ۲۵، ۳۸، ۴۰، ۶۵
سعید بن المسیب ۲۸۴
سلیک بن السلکہ ۳۲۰، ۳۲۳، ۳۳۳، ۳۲۴
سموئل بن عادیا ۱۳۱
سنمار ۴۸
سیف بن یزن ۱۱۰
شاس بن عبدہ ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۳
شاہ منذر ۲۸، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۷۲
شریح بن السموئل ۲۲۸، ۲۳۸
شریک بن عمرو ۱۱۱، ۱۱۲
شعبی ۲۳۴، ۲۳۵
(ڈاکٹر) شوقی ضیف ۳۰۸
صالح بن عبدالقدوس ۲۱۲
صعالیک ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۳، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۲
ضبعہ بن اد بن طانجہ ۱۰۳
طبری ۳۶
طرفہ بن العبد ۶۵، ۱۹۴، ۱۹۸، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۳، ۲۶۶، ۲۷۹، ۲۹۳

ڈاکٹر طٰہ حسین ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۴۳، ۱۸۷، ۱۹۶، ۲۲۲، ۲۵۳، ۲۹۳، ۳۰۸
عاد ۲۵، ۲۷، ۲۸
عامر بن الطفیل العامری ۲۳۶
عبدالغوث المنقری ۱۰۳
عبداللہ بن جدعان ۱۳۷، ۲۸۶، ۲۸۹، ۲۹۰
عبداللہ بن عمر ۲۸۴
عبدالملک بن مروان ۱۹۹
عبید بن الأبرص ۱۰۲، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۳۰۴
(حضرت) عثمانؓ ۷۵
عدنان ۲۸، ۲۹، ۳۳
عدی بن زید العبادی ۵۵، ۱۱۸، ۲۷۴
عروۃ بن الورد ۱۹۸
عکرمہ بن جریر ۲۱۳
علقمہ النخعی ۳۰۷
علقمہ الفحل (علقمہ بن عبدہ) [illegible]، ۲۰۵، ۲۴۵، [illegible]، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۱۴
علقمہ بن سیف [illegible]
علقمہ بن [illegible] ۲۲۰، ۲۲۷ [illegible]

(حضرت) علیؓ ۳۴ ، ۷۶ ، ۷۸
(حضرت) عمرؓ ۴۸ ، ۹۹ ، ۱۹۳ ، ۲۱۰ ، ۲۱۲
عمرو بن العلا ۱۲۹ ، ۱۶۵
عمرو بن براق ۳۲۰
عمرو بن حارث الغسانی ۱۹۰ ، ۱۹۱ ، ۱۹۷
عمرو بن ربیعہ ۱۳۹
عمرو بن عدی ۴۷
عمرو بن علا ۶۵
عمرو بن کلثوم ۱۲۹ ، ۱۳۶ ، ۱۵۴ ، ۱۶۸ ، ۲۵۵ ، ۲۵۴ ، ۲۵۷ ، ۲۵۸ ، ۲۵۹ ، ۲۶۲ ، ۲۶۳ ، ۲۶۴ ، ۲۶۶ ، ۲۶۷ ، ۲۶۸ ، ۲۲۹ ، ۲۷۳
عمرو بن معدی کرب ۸۹ ، ۹۵ ، ۹۷ ، ۹۸ ، ۹۹ ، ۱۱۹
عمرو بن ہند ۲۴۲ ، ۲۴۳ ، ۲۴۴ ، ۲۴۵ ، ۲۵۶ ، ۲۵۷ ، ۲۵۸ ، ۲۵۹ ، ۲۶۰ ، ۲۶۶ ، ۲۶۷ ، ۲۷۰
عنترہ بن شداد العبسی ۶۰ ، ۱۱۰ ، ۱۴۶ ، ۱۵۶ ، ۱۹۸ ، ۲۰۴ ، ۲۱۶ ، ۲۱۷ ، ۲۱۸ ، ۲۲۲ ، ۲۲۳ ، ۲۲۴ ، ۲۲۵ ، ۲۲۶
عوف بن مالک ۲۹۴ ، ۲۹۵ ، ۲۹۶
غالب ۳۱۲
غزوۂ بدر ۲۸۳
غزوۂ تبوک ۹۷
فرزدق ۱۶۹
فیروز شاہ ۱۱۰
قریش ۲۹ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۴۶ ، ۵۳ ، ۵۴ ، ۶۶ ، ۶۹ ، ۷۱ ، ۹۱ ، ۱۳۴ ، ۱۶۷ ، ۲۲۹ ، ۲۳۱ ، ۲۸۴
قریط بن انیف ۱۵۸
قس بن ساعدہ الایادی ۵۵ ، ۸۹ ، ۹۰ ، ۹۱ ، ۹۲ ، ۹۳ ، ۹۴ ، ۱۶۰
قصی بن کلاب ۴۴ ، ۴۵
قیس بن خارجہ ۸۹
قیس بن شراحیل ۲۷۱
کامل کیلانی ۲۷۷
کسریٰ انوشیرواں ۹۵ ، ۹۸ ، ۱۰۶ ، ۱۱۸ ، ۱۷۲ ، ۲۲۸ ، ۲۲۹
کعب بن لوئی ۸۸
کلیب وائل ۲۵۷ ، ۲۶۱
لبید بن ربیعہ ۱۰۶ ، ۱۴۸ ، ۱۷۳ ، ۲۲۲ ، ۲۲۳ ، ۲۲۴ ، ۲۳۵ ، ۲۹۵
لقیط بن یعمر الایادی ۱۱۸
(حضرت) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۴ ، ۲۵ ، ۳۴ ، ۶۲ ، ۷۸ ، ۸۸ ، ۹۱ ، ۹۲ ، ۱۰۹ ، ۱۳۴ ، ۱۹۲ ، ۲۲۹ ، ۲۳۱ ، ۲۳۲ ، ۲۵۳
محمد علی پاشا ۷۷
مسلم بن الولید ۱۳۰
مضر بن نزار ۱۲۵
(حضرت) معاویہؓ ۷۶ ، ۱۰۹ ، ۲۱۱
ملکۂ سبا ۲۵
منخل الیشکری ۱۸۶ ، ۱۹۱
مورّج ۳۲۵
(حضرت) موسیٰؑ ۲۸۴
مہلہل بن ربیعہ ۱۷۳ ، ۲۵۵ ، ۲۵۷ ، ۲۶۱ ، ۲۹۵
میتھو آرنولڈ ۱۲۴
میدانی ۱۷۷
نابغہ ذبیانی (النابغہ الذبیانی) ۴۷ ، ۴۸ ، ۶۵ ، ۶۸ ، ۱۲۹ ، ۱۳۶ ، ۶۳۷ ، ۱۴۰ ، ۱۴۱ ، ۱۴۲ ، ۱۴۳ ، ۱۴۴ ، ۱۴۵ ، ۱۴۷ ، ۱۵۹ ، ۱۶۸ ، ۱۶۹ ، ۱۸۴ ، ۱۸۵ ، ۱۸۶ ، ۱۸۷ ، ۱۸۸ ، ۱۸۹ ، ۱۹۰ ، ۱۹۱ ، ۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۱۹۴ ، ۱۹۵ ، ۱۹۷ ، ۱۹۹ ، ۲۰۲ ، ۲۰۳ ، ۲۱۱ ، ۲۲۷ ، ۲۳۲
(حضرت) نوح علیہ السلام ۲۷ ، ۶۲
نپولین ۷۷
ہاجرہؓ ۲۴
ہارون رشید ۱۲۶
ہرم بن سنان ۱۳۷ ، ۲۰۴ ، ۲۰۵ ، ۲۰۶ ، ۲۰۹ ، ۲۱۰ ، ۲۲۲ ، ۲۸۶
ہرم بن ضمضم ۲۲۲
ہشام بن محمد الکلبی ۱۱۱
یزید الحارثی ۱۴۴
یزید بن شیبان ۲۳۳
یعرب بن قحطان (یارح بن قحطان) ۲۸ ، ۳۲ ، ۳۷ ، ۹۷ ، ۱۱۹
یوسف بن اسماعیل ۲۲۵
یونس بن حبیب نحوی ۱۷۳ ، ۲۳۲